مولانا ابو الکلام آزاد

کتابُ التّذکرہ

جامع

پروفیسر ہمایون کبیر

مترجم

ڈاکٹر میر ولی الدین

تعداد طبع – ۱۰۰۰ بار اول

ملنے کا پتہ :-

ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ
خیریت آباد حیدر آباد – ٤
آندھرا پردیش

سلسلہ مطبوعات ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ - ۲

مولانا ابو الکلام آزاد

کتابُ التّذکرہ

جامع

پروفیسر ہمایون کبیر

مترجم

ڈاکٹر میر ولی الدین

ریسرچ پروفیسر فلسفہ جامعۂ عثمانیہ ،

ناشر

ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ
حیدر آباد

مطبوعہ

دائرۃ المعارف العثمانیۃ بحیدرآباد الدکن الہند

۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء

لکھنے والے

۱ - جواہر لال نہرو : وزیر اعظم ہندوستان ، بین قومی شہرت کے حامل ، مدبر و مصنف ۔

۲ - یس - رادھا کرشنن : نائب صدر ہندوستان ، عہد حاضر کے ایک نہایت مشہور عالم و مصنف ۔

۳ - عزت مآب شیخ احمد الباقوری : وزیر جمہوریہ متحدہ عرب ، ایک مشہور عالم اور متعبد ۔

٤ - لارڈ پیتھک لارنس : کیابنٹ مشن کے زمانہ میں ناظر امور ہند ، اسی کے بعد ہندوستان آزاد ہوا ۔

٥ - لوی مسینوں : مشہور فرانسیسی مستشرق ، تصوف میں پایۂ استناد رکھتے ہیں ، حکومت ہند نے انہیں گاندھی سمینار میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا ۔

٦ - جے - بی - کری پلانی : انڈین نیشنل کانگرس کے سابق صدر اور ایک مشہور عالم و مصنف ۔

۷ - سید محمود : مولانا آزاد کے مدۃ الحیاۃ رفیق ، کانگرس کی مجلس عاملہ کے سابق رکن ، حکومت بہار اور بعد میں حکومت ہند کے وزیر ، رکن لوک سبھا ۔

۸ - پی - سبارویں : جنوبی ہند کے مشہور سیاست داں ، حکومت مدراس میں اعلی عہدوں پر فائز رہے ، انڈونیشیا میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے ، اب لوک سبھا کے رکن ہیں ۔

۹ - رفیع الدین احمد : ہندوستان میں فن جراحۃ الاسنان اور تعلیمات کے پہلے محقق ، اس خصوص میں بین قومی شہرت کے حامل ، اب مغربی بنگال کی حکومت میں وزیر ہیں ۔

۱۰ - سعید نفیسی : مشہور ایرانی عالم جس نے اس عالمی امن پسندوں کی مجلس میں شرکت کی تھی جو ہندوستان میں منعقد ہوئی تھی ؛ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے مہمان پروفیسر بھی رہے ہیں ۔

۱۱ - ہمایوں کبیر : بنگالی اور انگریزی زبان کے ایک مشہور مصنف، اب حکومت ہند میں سائنسی تحقیقات اور ثقافتی امور کے وزیر ہیں ۔

۱۲ - محمد مجیب : اردو ، انگریزی ، جرمن اور روسی زبانوں کے ایک با وقار عالم ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، دہلی کے نائب امیر جامعہ ۔

۱۳ - سید عبد اللطیف : انسٹیٹیوٹ آف انڈو - مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز ، حیدرآباد کے صدر ، اور ایک مشہور عالم ، آپ سے مولانا آزاد نے اپنی تفسیر قرآن حکیم کو انگریزی میں منتقل کرنے کی خواہش کی تھی ۔

۱٤ - محمد حبیب : ہندوستان کی تاریخ و تمدن کے مبصر ، پروفیسر تاریخ ، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ۔

۱۵ - جے - سی - گھوش : ممتاز ہندوستانی سائنس داں؛ انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس ، بنگلور کے صدر رہ چکے ہیں ، انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی ، کھڑک پور کے ناظم ؛ نائب امیرجامعہ ، کلکتہ؛ پلاننگ کمیشن ، ہندوستان کے رکن ۔

۱٦ - مالکم میکڈونالڈ : مشہور مقرر و مصنف اور پرندوں کے دوست، برطانوی کابینہ کے رکن رہ چکے ہیں اور اب ہندوستان میں برطانیہ عظمی کے ہائی کمشنر ہیں ۔

۱۷ - هوریس الکزنڈر: مشہور سماجی کارکن اور پرندوں کے دوست، فرنڈز سوسائٹی کے ممتاز رکن، خیر و صلاح کے حامی و ناصر -

۱۸ - آصف اے - اے - فیضی: موجودہ زمانہ میں اسلامی قانون کے مشہور ماہر، جامعہ جموں و کشمیر کے نائب امیر جامعہ -

۱۹ - سی - راجہ گوپال آچاری: ہندوستان کے سابق گورنر جنرل، مشہور عالم، مصنف و مدبر -

۲۰ - ایم - سی - چھاگلا: عدالت العالیہ بمبئی کے سابق میر مجلس، ممالک متحدہ امریکہ کے ہندوستانی سفیر -

۲۱ - اے - آر - واڈیا: پروفیسر فلسفہ اور ہندوستانی لوک سبھا کے رکن -

۲۲ - تارا چند: مشہور مؤرخ و ماہر تعلیمات، حکومت ہندوستان کے مشیر تعلیمی رہے ہیں اور ایران میں ہندوستان کے سفیر بھی، اب ہندوستانی لوک سبھا کے رکن ہیں -

باسمہ

عرض مترجم

پیش نظر صفحات میں ملک و بیرون ملک کے ان اکابر علماء کے خیالات کی اردو میں ترجمانی کی گئی ہے جو اس جلیل الشان عالم و مدبر کے ذکر دوام کو جریدۂ عالم میں ثبت کرنے کی تمنا میں پیش کئے گئے ہیں جس نے اپنی بیش بہا زندگی ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی! ہم سب پروفیسر ہمایوں کبیر کے رہین منت ہیں جنہوں نے اس غرض کی تکمیل کے لئے فضلائے روزگار کا اس قدر دلکش انتخاب کیا!

فشکرُ المنعمینَ من الفرائض

اصل کتاب کے مقالہ نگاروں کے اسلوب بیان و طرز نگارش میں کافی اختلاف اور تنوع پایا جاتا ہے، اس لئے نہ یہ ممکن تھا اور نہ ہی مناسب معلوم ہوا کہ ان کے جذبات و خیالات کو اردو زبان میں پیش کرتے وقت یکسانیت تعبیر کا لحاظ رکھا جائے، لیکن اتنی بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کوشش اس امر کی ضرور کی گئی ہے کہ ان کے خیال و لہجہ کو جہاں تک ممکن ہوسکے اسی طرح ادا کیا جائے جس طرح کہ خود انہوں نے ادا کیا ہے۔ جن احباب کو اصل و ترجمہ ملا کر پڑھنے کا اتفاق ہو اگر وہ میرے اس بیان کی تصدیق کرسکیں تو میرے لئے موجب طمانیت ہوگا۔

اس موقع پر میں ایک چیز واضح کردینا چاہتا ہوں۔ جس چیز نے مجھے ترجمہ کے اس کٹھن کام پر آمادہ کیا وہ مولانائے مرحوم کا وہ احترام ہے جو ایک طویل عرصہ سے میرے سویدائے قلب میں مقیم ہے۔ مترجم کی حیثیت سے میرا صرف یہ کام تھا کہ مقالہ نگاروں نے جن جذبات و خیالات کو انگریزی زبان میں ادا کیا ہے انہیں

میں اردو میں پیش کردوں ، اور اپنے قلب سے یہ سوال نہ کروں کہ آیا وہ ان جذبات و خیالات سے لفظاً لفظاً متفق بھی ہے ۔ لیکن قلب کا اضطرار کچھ اس وقت زیادہ محسوس ہونے لگا جب بعض مقالہ نگاروں نے ان مسائل پر اظہار خیال کرنا شروع کیا جن کا تعلق عقائد دینیہ سے تھا ۔ اس کی ایک نمایاں مثال شری آصف علی اصغر فیضی ، وائس چانسلر جامعۂ کشمیر کا مقالہ "اسلام کی تعبیر جدید" ہے جس میں دین ، شرع و منہاج کے متعلق اکثر ایسی چیزیں لکھی ہیں جن سے میں کسی طرح اتفاق نہیں کرسکتا ! اور مولانا کی ساری تحریرات کو پیش نظر رکھ کر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خود مولانا کو بھی ان سے کسی طرح اتفاق نہ ہوتا ، لیکن مترجم کی حیثیت سے میرا یہ فریضہ تھا کہ شری فیضی کے خیالات کو صحت کے ساتھ پیش کردوں اور میں نے دیانت داری کے ساتھ بس یہی کیا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کرام مترجم کے فریضہ اور اس کے ذاتی عقائد و اذعانات کے اس فرق و امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھیں گے ! والسلام علی من اتبع الہدیٰ

سلامی معنبر چو باد بہاری ! سلامی معطر چو مشک تتاری !

سلامی تازہ تر از برگ ریحان ! کہ شوید رخ بشبنم در گلستان !

حیدر آباد

۱۱ جون سنہ ۱۹۶۰ء

میر ولی الدین

احمد محی الدین ابو الکلام آزاد

پیدائش : ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۸۸ ء

مولد و منشأ طفولیت : وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم

وفات : ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۹ ء دہلی

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ما

(رومی)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

فہرست

۱ - ھمایون کبیر	: افتتاحیہ	یب
۲ - جواھر لال نہرو	: ایک عظیم المرتبت انسان کی رحلت	۱
۳ - یس - رادھا کرشنن	: طلب اور وصول	٦
٤ - عزت مآب شیخ احمد الباقوری	: ایک لا فانی شخصیت	۱۰
٥ - لارڈ پیتھک لارنس	: خراج تحسین	۳۲
٦ - لوی مسینوں	: مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں	۳۳
۷ - جے - بی - کرپلانی	: عقل کی آواز	۳۷
۸ - سید محمود	: ایک نورانی شخصیت	٤٦
۹ - پی - سبارویں	: میں ان سے جس طرح واقف تھا	٦۳
۱۰ - رفیع الدین احمد	: ایک عظیم المرتبت ھندوستانی	٦۹
۱۱ - سعید نفیسی	: ایران سے خراج تحسین	۷٥
۱۲ - ھمایون کبیر	: ایک شخصی وصیت	۸٤
۱۳ - محمد حبیب	: انقلاب پسند مولانا	۹٦
۱٤ - جے - سی - گھوش	: رھنمائے تعلیم	۱۲۳
۱٥ - سید عبد اللطیف	: ایک غیر مکمل شاہ کار	۱۳۹
۱٦ - محمد مجیب	: تذکرہ: اشارات وکنایات میں	۱٦۰
۱۷ - آصف علی اصغر فیضی	: اسلام کی تعبیر جدید	۱۸۰
۱۸ - مالکم میکڈونالڈ	: مولانا آزاد اور چڑیاں	۲۱٦
۱۹ - ھوریس الکزنڈر	: مرغ آفتابی کا آشیانہ	۲۲۷
۲۰ - سی - راجہ گوپال آچاری	: خطائے بطلیموسی	۲۳۲
۲۱ - ایم - سی - چھاگلا	: ھندوستان کا دستور	۲۳٥
۲۲ - اے - آر - واڈیا	: اجتماعیات ألسنہ	۲٥۱
۲۳ - تارا چند	: ھندوستان اور مغرب	۲٦٤

افتتاحیہ

مولانا آزاد نے اپنے عنفوان شباب ھی میں ایک ممتاز انشا پرداز اور اصول دین کے عالم کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی تھی، آزاد و بے باک تحقیق اور تلاش حق کے اس جذبہ نے جو اسی زمانہ سے ان کے قلب میں موجزن تھا، ان کی بہت جلد ملک کی سیاسی تحریک کی طرف رھبری کی، کیوں کہ وہ پوری طرح سمجھ گئے تھے کہ انسان کی حقیقی تکمیل حریت ھی کی فضا میں ھو سکتی ھے۔ بیس پچیس سال ھی کی عمر میں وہ ھندوستان کی آزادی کے ایک بہادر سپاھی تھے۔ چنانچہ ھندوستان کی قومی آزادی کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا دور دور تک اعتراف کیا جاچکا ھے۔ جب ان کی عمر ابھی پینتیس سال ھی کی تھی قوم نے انہیں انڈین نیشنل کانگرس کا صدر منتخب کرکے عزت بخشی۔ پھر آزادی کے لئے جد و جہد کے ایک نہایت نازک زمانہ میں انہوں نے کانگرس کی چھ مہیب و طوفان خیز سال تک رھنمائی کی اور سر اسٹفورڈ کرپس، لارڈ ویول اور برٹش کیابنٹ مشن کے ساتھ گفت و شنید کی جس کا انجام سنہ ۱۹۴۷ء میں ''ھندوستان کی آزادی'' کا حصول تھا۔

آزادئ قوم کی جد و جہد میں شرکت کے علاوہ مولانا آزاد کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ھندوستانی زندگی کے ھر دائرہ میں عقلیت اور ترقی و تقدم کے ایک بے باک حامی و داعی تھے۔ وہ تمام مذھبی، اخلاقی، معاشری، معاشی اور سیاسی مسائل کو بے لوث اور پر سکون ھو کر اور تمام جذبات سے قلب کو فارغ کر کے حل کرنا چاھتے تھے اور ھندوستان کے بسنے والے تمام فرقوں کے لئے عدل و انصاف کے خواھاں و جویا تھے۔

مولانا آزاد در اصل ایک عالم تھے جن کو حالات کے جبر نے

سیاسیات میں ڈال رکھا تھا ۔ ان کے علم کی اس شان کا اظہار اس واقعہ سے زیادہ اور کسی چیز سے نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ شہرت خلق سے پرہیز کرتے رہے ۔ سیاسی قائدین ۔ ہندوستان کے ہوں یا کسی اور مقام کے ۔ عام طور پر اپنی قوت عوام ہی کے ربط و ضبط سے حاصل کرتے ہیں ، لیکن مولانا آزاد ایک ایسے عزلت پسند زاہد تھے جن کو اپنا کمرہ سیاست کے میدان سے زیادہ قابل ترجیح نظر آتا تھا ۔ ان کی اس کم آمیزی اور خلوت پسند طبیعت نے ان کو قوم میں اور زیادہ محبوب بنا دیا تھا ، اس کا ثبوت غم و حزن ، مدح و ثنا کے ملے جلے جذبات کے اس عظیم الشان مظاہرہ سے ہوتا ہے جو قوم نے ان کی موت پر کیا ۔

مولانا آزاد کو شہرت سے جو نفرت تھی اس کے پیش نظر ان کے بعض دوستوں نے کافی پس و پیش کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ ان کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء ۔ ایک عام تقریب ہو ۔ بڑی مشکل سے مولانا کو راضی کر لیا گیا اور اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ۔ یہ کمیٹی ڈاکٹر یس ۔ رادھا کرشنن ، پنڈت جواہر لال نہرو ، سی ۔ راج گوپال چاری ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، پنڈت گوبند ولبھ پنت ، ڈاکٹر بی ۔ سی ۔ رائے ، اچاریہ ، جے ۔ بی ۔ کرپلانی ، یو ۔ ین ۔ دھیبر اور ہمایوں کبیر پر مشتمل تھی ۔ مولانا کی سترویں سالگرہ منانے کا موزوں ترین طریقہ یہ قرار دیا گیا کہ ایک عام جلسہ میں ان کو مدعو کیا جائے اور ان کی خدمت میں " کتاب المیلاد " پیش کی جائے ۔

لیکن قضا و قدر کا فیصلہ کچھ اور تھا اور مولانا آزاد نے ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء میں رحلت فرمائی ۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے منصوبہ کو ترک نہ کرے اور بجائے کتاب المیلاد کے " کتاب التذکرہ " شائع کرے ۔ پیش نظر کتاب اس فیصلہ کی تعمیل میں شائع کی جارہی ہے ۔

کمیٹی ان تمام حضرات کی رہین منت ہے جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں اس کی مدد فرمائی ۔ اس کا منافعہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس کو دیا جائے گا جو دو انعامات کے عطیہ میں اس کو صرف کرے گی ۔ ایک انعام تو اس مقالہ پر ہوگا جو ہندو مذہب کے کسی پہلو پر ہندوستان یا پاکستان کا کوئی مسلم شہری پیش کرے گا ، اور دوسرا انعام اس مقالہ پر ہوگا جو اسلام کے کسی پہلو پر ان ممالک کا کوئی ہندو شہری لکھے گا ۔ نوجوان طبقہ سے مولانا آزاد کو جو محبت تھی اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ یہ مقابلہ ان ہی افراد تک محدود رکھا جائے جو ۲۲ فبروری کی تاریخ تک تیس سال یا اس سے کم عمر کے ہوں اور اسی تاریخ یہ انعامات بھی دے جائیں ۔

نئی دھلی

۱۲ جنوری سنہ ۱۹۵۹ ء

ھمایوں کبیر

ایک عظیم المرتبت انسان کی رحلت

از

پنڈت جواہر لال نہرو

جناب صدر، اس ایوان میں یہ فریضہ اکثر میرے ہی ذمہ رہا ہے کہ میں کسی رفیق یا کسی عظیم المرتبت انسان کی وفات کا ذکر کروں، مجھے اس فرض کو، اس الم ناک فرض کو، آج بھی ادا کرنا ہے، یہ اس ہستی کے سلسلہ میں ہے جو آج سے کچھ روز قبل ہمارے ساتھ تھی اور کچھ اچانک ہی ہم سے رخصت ہوگئی اور نہ صرف پارلیمنٹ کے رفقاء ہی کے قلوب کو مغموم ومحزون چھوڑ گئی، بلکہ ملک کے بے شمار افراد کو بھی اپنے میں مبتلا کر گئی!

یہ معمول سا ہوگیا ہے کہ جب کسی ممتاز شخصیت کا سانحۂ ارتحال پیش آتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ: اس کا ہمیں کوئی بدل مل نہیں سکتا اور اسکی رحلت سے ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ جو کسی طرح پر نہیں ہوسکتا. یہ کسی حد تک اکثر صحیح بھی ہوتا ہے، لیکن مولانا آزاد کی وفات پر ہمارا یہ کہنا، میں یقین کے ساتھ بول سکتا ہوں کہ قطعا اور لفظ بہ لفظ صحیح ہے! میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان میں آیندہ کوئی بڑا آدمی پیدا نہ ہوگا، ہم میں بڑے آدمی گزرے ہیں اور آیندہ بھی ہونگے، لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جس خاص عظمت کے مولانا آزاد حامل تھے اس کا ہندوستان میں یا کسی اور مقام پر اعادہ یا ظہور ثانی ممکن نظر نہیں آتا!

میرے لئے یہ ضروری نہیں کہ میں ان کے صفات کا تذکرہ کروں، ان کے بے پایاں علم وفضل یا ان کی عظیم الشان خطابت کا ذکر کروں۔ وہ ایک عظیم المرتبت مصنف تھے اور ان کی عظمت کی مختلف شانیں تھیں۔ دوسرے بھی عالم ہیں، دوسرے بھی مصنف ہیں،

اور بھی خطیب ھیں لیکن مولانا آزاد میں ماضی اور حال کی عظمت یک جا موجود تھی ۔ وہ تاریخ کے ان جلیل الشان افراد کے نمائندہ تھے اور مجھے ان ھی کی یاد دلایا کرتے تھے جو آج سے کئی سو سال پہلے گزرے ھیں ، مثلاً یورپی تاریخ میں نشاۃ جدیدہ کے فرید العصر افراد ، یا بعد کے زمانہ کے قاموس نگار جو انقلاب فرانس سے قبل گزرے ھیں ، مردان عقل ، مردان عمل مجھے وہ عہد سلف کی عظیم صفات کی بھی یاد دلاتے ھیں اور ان کے احسان وکرم کی بھی ۔ قدیم زمانہ میں کچھ مذموم صفات بھی تھیں ، لیکن اس زمانہ میں ایک قسم کی حلاوت اور لطافت تھی ، بشاشت وادب تھا ، تحمل اور صبر تھا جو آج کی دنیا میں مفقود معلوم ہوتے ھیں ۔ آج کی دنیا میں ھمیں یہ نہیں ملتے گو ھم سائنس ، فنون وصنائع میں زیادہ ترقی کرگئے ھیں ۔ گو ھم چاند تک پہنچنے کی سعی کر رھے ھیں لیکن ھماری اس سعی میں تحمل اور رواداری نہیں ، وہ چیزیں نہیں جو زندگی کی ابتداء ھی سے زندگی کو قابل قدر بناتی رھی ھیں ۔ ماضی کی ان ھی صفات حمیدہ ، لطف وحلاوت ، عمیق علم ، رواداری وتحمل اور زمانہ حال کے محرکات کا فہم ، اور ان سب صفات کی ایک نادر اور بے مثل ترکیب نے مولانا آزاد کو وہ مقام بخشا تھا جس پر وہ فائز تھے ۔

ھر شخص جانتا ھے کہ عنفوان شباب ھی میں ھندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ ان کے قلب میں موجزن تھا اور اس کے حصول کے لئے انہوں نے تشدد آمیز انقلاب کے طریقوں کو استعمال کرنا بھی پسند کیا تھا ، لیکن بہت جلد انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ حصول مقصد کے لئے مفید نہیں ۔

وہ اس جلیل القدر مترکب تمدن کے ایک خاص ومؤثر نمائندہ تھے جسکا ھندوستان میں تدریجی طور پر ارتقاء ھوا ھے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس مترکب تمدن کی نمائندگی کے لئے ھر شخص کو مولانا آزاد کی طرح

ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس کے بہت نمائندے ملتے ہیں، لیکن مولانا آزاد اپنے خاص میدان عمل میں، دھلی، بنگال یا کلکتہ، جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک زیادہ حصہ بسر کیا ہے، ان مختلف تمدنوں کی ایک خوشگوار ترکیب کو پیش کرتے تھے جو یکے بعد دیگرے ہندوستان میں پیدا ہوئے. انکی مثال ان ندیوں کی سی ہے جو ہندوستان میں بہہ نکلیں اور ہندوستانی زندگی اور ہندوستانی فطرت کے سمندر میں گم ہوگئیں، ان کو متأثر کیا، ان کو بدل دیا اور خود ان کے اثر سے بدل گئیں!

اس طرح وہ ہندوستان کے اس تمدن کی خاص طور پر نمائندگی کے لئے پیدا ہوئے تھے جو مغربی ایشیا کے اقوام کے تمدن سے، ایرانی تمدن سے، عربی تمدن سے متأثر ہوا اور ہزاروں سال متأثر رہا، خصوصا ایرانی تمدن سے، جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے۔ اس معنی میں میں نے کہا تھا کہ میں کسی دوسرے شخص کا خیال بھی نہیں کرسکتا جو ان کا قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہو، کیونکہ جس دور نے انہیں پیدا کیا تھا وہ خود بدل گیا ہے اور گزر چکا ہے۔ ہم میں سے جو چند رہ گئے ہیں اسی دور کے باقیات ہیں جنہیں اس دور کا جو گزر چکا ہے صرف ایک دھندلا سا تصور ہے۔

میں نہیں جانتا کہ جس نسل کا نشوونما ہورہا ہے وہ اس دور کا احساس بھی کرسکتا ہے۔ اب ہم ایک مختلف طریقہ سے عمل کررہے ہیں، مختلف طریقہ سے سوچ رہے ہیں، اور ذہن وفہم کا ایک فصل ہمیں اور ہماری نسلوں کو اس دور سے جدا کررہا ہے.

ہم میں یہ تغیر جائز بھی ہے، میں کوئی شکایت نہیں کررہا ہوں۔ تغیر ضروری ہے، اسلئے بھی کہ ہم کسی ایسی گذشتہ عادت کے اسیر نہ ہوجائیں جو گو کسی زمانہ میں اچھی تھی لیکن بعد میں اچھی نہ رہی۔ لیکن میں تأسف کے اس جذبہ کو ظاہر کئے بغیر بھی

نہیں رہ سکتا کہ شر کے ساتھ. زمانۂ ماضی کا خیر بھی فنا ہورہا ھے اور اسی خیر کی خاص طور پر مولانا آزاد نمائندگی کرتے تھے۔

ایک خاص چیز کا میں یہاں ذکر کرنا چاھتا ھوں اور وہ یہ کہ ایک عجیب غلطی مولانا آزاد کی زندگی اور تعلیم کے بارے میں خود مجھ سے ھوگئی۔ آج صبح کے اخبار میں مولانا آزاد کے متعلق حکومت کی ایک قرارداد شائع ھوئی ھے۔ غلطی یہ ھے کہ قرارداد میں بیان کیا گیا ھے، جیسا کہ بعض دفعہ میں نے بیان کیا تھا، کہ انھوں نے جامعۂ ازھر میں تعلیم پائی تھی۔ واقعہ ایسا نہیں۔ یہ ایک غیر معمولی غلطی ھے جسکی کافی شہرت بھی ھوچکی ھے۔ اور جیسا کہ میں نے کہا خود مجھے بھی یہی خیال تھا۔ واقعہ یہ ھے کہ مولانا نے جامعۂ ازھر میں تعلیم ھی نہیں پائی۔ وہ قاھرہ ضرور گئے تھے، مگر صرف دیکھنے کے لئے گئے تھے، وھاں تعلیم نہیں پائی۔ تعلیم دوسری جگہ حاصل کی ھے۔ دراصل انھوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی ھے، وھاں کے عربی مدارس میں اور دوسرے مدارس میں بھی۔ ان کی پیدائش وھیں ھوئی ۱. اور مصر وہ ضرور گئے جیسا کہ مغربی ایشیا کے دوسرے شہروں کو بھی دیکھ آئے تھے.

بہر حال آج ھم ایک ایسے عظیم المرتبت انسان کی رحلت پر ماتم کررھے ھیں جو ایک نہایت قوی عقل اور نورانی فراست کا مالک تھا اور ایسی حیرت انگیز استعداد کا حامل تھا کہ فوراً کسی بھی مسئلہ کے قلب تک جاپہنچتا تھا۔ میں نے «نورانی» کا لفظ استعمال کیا ھے۔ میرے خیال میں اسکے ذھن۔ نورانی ذھن کی تعبیر کے لئے اس سے زیادہ موزوں لفظ نہیں۔ جب ھم ایک ایسے رفیق، دوست، شریک،

---

(۱) مولانا مکۂ مکرمہ میں پیدا ھوئے جیسا کہ انھوں نے تذکرہ میں لکھا ھے «مولد و منشأ طفولیت وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم ھے یعنی مکۂ معظمہ» ص ۲۸۹ (مترجم).

ساتھی ، قائد ، استاد ۔ کسی نام سے بھی انہیں یاد کیجئے ۔ سے محروم ہوجاتے ہیں ، جدا ہوجاتے ہیں تو ہماری زندگی اور عمل وحرکت میں ایک مہیب خلا پیدا ہوجاتا ہے !

یہ ممکن ہے کہ ابتدا میں اس خلا کا ہمیں کامل احساس نہ ہو۔ ابتدا تو غم وحزن اور صدمہ سے ہوئی ہے ۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے جائینگے یہ خلا وسیع اور عمیق ہوتا جائے گا اور ہمیں محسوس ہوگا کہ اس جگہ کا پر کرنا جو جانے والے نے خالی کی ہے کس قدر مشکل ہے ۔ لیکن دنیا میں یہی ہوتا ہے اور ہمیں اسکا جم کر مقابلہ کرنا ہے ۔ اس کا مقابلہ سلبی انداز سے نہیں ایجابی طریقہ پر کرنا ہے ، اور وہ اسطرح کہ ہم اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف اور مختص کردیں جو وہ کررہا تھا اور جو اس نے اور دوسروں نے ہمارے لئے چھوڑا ہے ، یہ سب ہماری پر امن قوتوں کے قائد اور امیر عسکر رہے ہیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی ، ترقی اور تقدم کے لئے کام کیا ہے ، جو آئے بھی اور گزر بھی گئے اور اپنا پیغام چھوڑ گئے اسلئے مجھے امید ہے کہ گو جانے والا جاچکا ہے تاہم وہ ہم میں زندہ رہے گا ، اس کا پیغام زندہ رہے گا اور ہماری راہ کو روشن کرتا رہے گا جیسا کہ اس نے اسکے پہلے اپنی زندگی میں کیا تھا !

طلب اور وصول

از

یس - رادھا کرشنن

مولانا آزاد ایک ممتاز شخصیت کے انسان تھے اور ان میں غیر معمولی جرأت، بے خوفی، استقامت اور آزادی کی پرجوش محبت پائی جاتی تھی۔ تقریبا دو پشت سے وہ ھماری سیاسی زندگی میں ایک بے مثال مقام پر فائز تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ع میں کانگرس میں شریک ھونے سے پہلے بھی وہ انقلاب کے داعی رہے ھیں. ان کی سیاسی حکمت، جذبۂ حب وطن، اور ایثار کا بہت جلد اعتراف کرلیا گیا اور انھیں سنہ ۱۹۲۳ع ھی میں انڈین نیشنل کانگرس کا صدر بنا دیا گیا اور وہ اس عہدہ پر سالھا سال بعد میں کئی مرتبہ مختلف نازک موقعوں میں بھی فائز رہے. ملک کی انھوں نے ایک ھوش مند مدبر، پرجوش محب وطن، اور روشن خیال حکیم کی حیثیت سے جو خدمت کی ھے وہ اپنی قیمت کے لحاظ سے بے بہا ھے. اپنے عقائد کی وجہ سے انھوں نے ایذائیں برداشت کیں لیکن ان کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہیں کیا. قیادت کی عظیم الشان صفات میں سے ایک صفت ان میں یہ تھی کہ انھوں نے کسی مقبولیت عامہ کی خاطر اپنی رائے کے اظہار میں پس و پیش نہیں کیا، قائد کو تو ثابت قدم ھونا ھی پڑتا ھے. کوئی شخص قائد بن ھی نہیں سکتا اگر وہ اپنے خیالات کے اظہار کی خاطر عدم مقبولیت کا خطرہ مول نہ لے. جو شخص ھر کسی کو خوش کرنا چاھتا ھے وہ کسی کو خوش نہیں کرسکتا!

مولانا آزاد نے ان معائب کا پتہ لگا لیا تھا جو محکومی کا باعث ھوتے ھیں اور ان کو رفع کرنے کے لئے اپنی ساری قوت اور قابلیت صرف کردی. قومی افتراق بار بار ھماری ذلت اور محکومی کا سبب

بنا ھے . وہ اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ملک میں اتحاد واستحکام پیدا کرنا چاھا ـ وہ خود ایک مؤمن قانت تھے اور قرآن حکیم پر ان کی تحقیق تفسیر کے سلسلہ میں استناد کا مرتبہ رکھتی ھے لیکن ساتھ ھی وہ قومی اتحاد اور فرقہ واری اتفاق کے زبردست داعی تھے ـ انھوں نے ھندو، مسلم، سکھ، عیسائی میں کبھی فرق نہین کیا، انکا خیال تھا کہ جو بھی اس ملک میں ھے اس کا ملک ھے . ان کی زندگی کی قوت محرکہ قومی جذبہ تھا . وہ قومی اتحاد اور فرقہ واری اتفاق کے پیام بر تھے ، اب بھی ھمیں ان کے دئے ہوئے پیامات کو یاد رکھنا چاھئے کیونکہ ملک میں اب بھی وہ قوتیں کام کررھی ھیں جو ھم میں افتراق پیدا کرنا چاھتی ھیں . ھندوستانی اتحاد یا وحدت کو ایک مسلمہ امر مانا نہیں جاسکتا . لسانی اور طبقہ واری مناقشون کے اس دور میں اس اتحاد کی کامل احتیاط کے ساتھ پرورش کی جانی چاھئے . اختلافات کی اس کثرت کو ھندوستان کی وحدت کی تقویت کے لئے استعمال کیا جانا چاھئے .

مولانا آزاد میں حقوق انسانی کی حمایت کا جوجذبہ تھا وہ تو مشہور ھی ھے ، اسکے علاوہ انھیں عوام کے معاملات میں اختیار کی جانے والی حکمت عملی کے خطا و صواب کی کامل بصیرت حاصل تھی . شخصی تعلقات میں تو وہ اپنے عمل کو رحم وشفقت کے جذبہ سے متأثر ہونے بھی دیتے تھے لیکن عامۃ الناس کے معاملات میں عدل وانصاف کے اصول سے انھوں نے کسی وقت انحراف نہیں کیا . اگر کوئی شخص ان کی توھین کرتا تو وہ معاف بھی کردیتے لیکن قومی مفاد کو ضرر پہنچانے والا اپنے کیفر کردار کو پہنچایا جاتا . شخصی تعلقات میں رحم اور عوامی معاملات میں عدل ان کا اصول تھا . اگر ھم نظم ونسق میں دیانت سے غفلت برتیں تو حکومت کا استحکام اور ھمارے معاشرہ کی تعمیر میں خرابی پیدا ھوجائے گی . وہ حق و صواب کے اس قدر

شیدائی تھے کہ خطا اور حیلہ ان کے سامنے عاجز تھے۔ جب کبھی انتظامی صلاحیت کا سوال پیدا ہوتا تو نظم و نسق عامہ میں انہوں نے اعلی معیار کے تحفظ کے لئے مجاہدہ کیا۔ یہ ان کی دوسری تنبیہ ہے جو ہمیں یاد رکھنی چاہئے۔

جب ایک دفعہ آزادی حاصل ہوگئی تو پھر انہوں نے محسوس کیا کہ ہمیں اس آزادی کو معاشرتی فلاح کی تکمیل میں، ملک کو مرض، گندگی، جہل وغیرہ سے نجات دلانے میں استعمال کرنا چاہئے اور اپنے قلوب کا وہم، ظلمت پسندی، تعصب سے تزکیہ کرنا چاہئے۔ وہ حریت نفس کے قائل تھے۔ وہ نفس جو قوم، زبان، صوبہ، مذہب یا فرقہ کے تنگ تعصبات سے آزاد اور فارغ ہو۔ مولانا کا نفس نفس مزکی تھا!

جب بھی میں ان سے گفتگو کرنے جاتا تھا انھیں عربی اور فارسی علوم سے مملو پاتا، میں یہ زبانیں نہیں جانتا لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ ان پر بے مثل عبور رکھتے تھے اور ان کی تقریریں۔ جو اردو زبان میں ہوا کرتی تھیں۔ اپنی ساخت میں محکم اور اپنی بندش میں بےعیب اور بلند اور اپنے مقصد میں قوی اور معین ہوا کرتی تھیں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انہوں نے قومی اتحاد، نظم و نسق کی اصلاح اور معاشی ترقی کی تکمیل کے لئے کام کیا۔ یہی وہ نصب العین ہے جو ہم نے اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارے لئے ان کی یاد کے احترام کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اسی نصب العین کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور ہر روز محاسبہ کریں کہ کیا ہم قومی اتحاد، نظم ونسق کی اصلاح اور معاشی اور مادی ترقی کے لئے کوشاں ہیں یا نہیں؟ یہی طریقہ ہے ان کی زندگی کے درس سے استفادہ کرنے کا۔

کتابیں ان کی دائمی رفیق رہی ہیں۔ ان کی گفتگو عربی وفارسی کی معتبر وقدیم کتابوں کے اقتباسات سے مملو رہا کرتی تھی۔

انھوں نے « تاریخ فلسفہ مشرق و مغرب » کا مقدمہ لکھا تھا جسکی ابتداء فارسی کے ایک شعر سے کی ھے اس میں کائنات کی تشبیہ ایک کہنہ کتاب سے دی گئی ھے جسکے پہلے اور پچھلے صفحے گم ھیں، اسلئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ کتاب کسطرح شروع ھوئی اور نہ ھم یہ جان سکتے ھیں کہ اس کا اختتام کیسے ھوگا۱ یہی مفہوم گیتا میں اسطرح ادا ھوا ھے:

« اے بھارت کے پوت! تمام مخلوقات، جن کی بدایت ایک سرغامض ھے، اپنی زندگی کی صرف درمیانی منزل ھی سے واقف ھیں، انھیں اسکا بھی کوئی علم نہیں کہ موت کے بعد کیا ھوگا، جب اپنی ذات کے عرفان کے متعلق انسان کا یہ حال ھے تو پھر غم کا ھے کا»
(بھگوت گیتا: ۲۸)

فلسفیانہ تحقیق و طلب کا مقصد حیات اور وجود کے معنی کا معلوم کرنا ھے۔ ممکن ھے کہ ھمیں اسکے معلوم کرنے میں کامیابی نہ ھو لیکن اس طلب میں انہماک خود اپنا انعام آپ ھے۔ وہ اس مقدمہ کو دوسرے فارسی شعر پر ختم کرتے ھیں جسکا مطلب یہ ھے کہ جو اس راہ کے رھرو ھیں وہ کبھی نہیں تھکتے کیونکہ عشق خود راہ بھی ھے اور منزل بھی ۲۔ خود ان کی زندگی اسکی ایک مثال ھے۔ وہ راہ بھی تھی اور منزل بھی!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ھمیں ان کی مثال ملنی ممکن نہیں، وہ ایک عظیم المرتبت انسان تھے، پر رعب، صاحب عزم، اور عمل میں بے خوف!

---

(۱) ما ز آغاز و انجام جہاں بے خبریم
اول و آخر این کہنہ کتاب افتاد است

(۲) رھرواں را خستگیء راہ نیست
عشق ھم راہ است ھم خود منزل است

ایک لافانی شخصیت

از

عزت مآب شیخ احمد الباقوری

« مرد حق ! اور ایسے مرد حق کم ہی ہوتے ہیں ! »

یہ تقریر اس موقع کے لئے لکھی گئی تھی جب ہندوستان کے قائدین کے فیصلہ کے مطابق مولانا آزاد کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں ان کی ان خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کا خیر مقدم کیا جانے والا تھا جو انہوں نے ہندوستانی قوم اور عام انسانیت کے لئے انجام دی ہیں، خواہ ان کا تعلق سیاسی یا تمدنی دائرہ سے ہو یا قومی آزادی کے میدان سے !

لیکن ایک طرف تو اس تقریب کے منانے والے اسکی تاریخ کے تعین میں مصروف تھے دوسری طرف اجل نے مولانا کی تاریخ کا تعین کردیا تھا، اجل ہی نے سبقت کی اور مولانا نے اپنے خالق کی پکار پر لبیک کہا اور اسی طمانیت کے ساتھ جو ان کی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت تھی ! اور کون جان سکتا ہے کہ اگر مولانا ابھی زندہ رہتے تو مقررین. اور مصنفین کے لئے یہ ممکن بھی ہوتا کہ وہ ان کی شخصیت اور ان کی خدمات کے متعلق اپنے جذبات محبت واحترام کا اظہار بھی کرسکتے؟ اسکا امکان اور بھی کم تھا، کیونکہ مولانا کو مدح وستائش سے طبعی نفرت تھی ۔ ان کے لئے اس سے زیادہ کوئی چیز پریشان کن اور تکلیف دہ نہ ہوتی کہ وہ خود اپنی مدح سنیں، گو یہ مدح بالکل جائز اور صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ اس اعتبار سے انہوں نے اپنے آپ کو عظمت کی سطح سے بھی بلند ثابت کیا تھا۔ ان عظیم صفات سے واقف ہونے کے باوجود، جو خدا نے ان میں ودیعت کی تھیں، انہوں نے کبھی مدح و ستائش کے الفاظ سننا پسند

نہیں کیا - تاہم اجل نے مولانا کے ساتھ عدل کرنے اور ان کی خواھشات کی تشفی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا - عدل تو اسطرح کیا گیا کہ مقررین اور مصنفین کو موقع دیا گیا کہ تکدر و اضطراب پیدا کئے بغیر وہ ان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار تقریر و تحریر میں آزادی کے ساتھ کریں - مدح سے جو انہیں کراھت تھی اسکا لحاظ کئے بغیر اب وہ آزادی سے اسکا اظہار کرسکتے ھیں، اپنے پسندیدہ طریقہ سے ان کو پیش کرسکتے ھیں، اور ان کی تصویر الفاظ میں کھینچ سکتے ھیں - مولانا نے انہیں اب تقریر اور تحریر کی آزادی دے دی ھے، کیونکہ مولانا کے وجود کا تعلق اب تاریخ سے ھوگیا ھے - اجل نے ان کی خواھشات کی تکمیل بھی کردی کیونکہ اب وہ صرف صداقت ھی کی آواز سن سکتے ھیں جس پر ان کا کامل ایقان تھا، اور جسکا وہ انبساط کے ساتھ اظہار کیا کرتے تھے - مولانا کی یاد میں اب جو شخص کچھ کہنا یا لکھنا چاھتا ھے وہ صداقت کی آواز بلند کرسکتا ھے - مولانا کی زندگی کو اب وہ ایک بالغ نظر مؤرخ کی طرح تحلیلی انداز میں پیش کرے گا، جس کا کام صداقت کو واضح کرنا اور آنے والی نسلوں تک پہنچانا ھوگا - مولانا کی زندگی اور ان کی شخصیت کو اجاگر کرنا میری ناچیز رائے میں ان کے احباب اور رفقاء کا سب سے بڑا فریضہ ھے - مولانا کے ھر قول اور فعل سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ حق و صداقت کے جویا تھے.

ان کی لوگوں سے ملاقات، خواہ یہ لوگ ان سے اتفاق کریں یا اختلاف، ان کا زندگی کے معاملات میں رد یا قبول، غرض ان کی ھر چیز، حق، صداقت اور خیر ھی کے معیار سے جانچی اور پرکھی جاتی تھی - وہ صرف اسی چیز کو قبول کرتے تھے جو سچی اور اچھی ھوتی تھی اور خیر و صداقت ھی کے اصول پر ان کا قیام تھا - جو چیز بھی ان اصول کے خلاف ھوتی وہ اسکو رد کردیتے خواہ

ایسا کرنے میں فتنہ کتنا ھی شدید کیوں نہ ہوتا اور ایسے وقت شر کے محرکات اور داعیات کتنے ھی قوی کیوں نہ ھوتے۔ مولانا زندگی کا تصور بغیر خیر و صداقت کے کرھی نہیں سکتے تھے۔ قوم کو قوم اسی وقت سمجھا جاسکتا تھا جب اس کا محرك عمل یہی خیر وصداقت ھوتا۔ ان حالات کے پیش نظر ہم یقین و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ھیں کہ مولانا کی روح کو روح و ریحان قطعاً نصیب ھیں۔ ان کی یاد میں جو کچھ کہا جائے گا اس پر صداقت کا نشان ھوگا اور اس میں خیر کی تجلی ھوگی۔ اسکی ایك وجہ یہ بھی ھے کہ ان کا وجود خیر و صداقت کا مادی مظہر تھا۔ ان کی زندگی خیر و صداقت ھی کے لئے وقف تھی۔ مولانا کو احکام قضا سے اور بھی راضی ھونا چاھئے کہ جو دن ان کے اکرام و احترام کا مقرر کیا گیا تھا اسکو تذکرہ کے موقع سے بدل دیا گیا جو قوم کی راہ راست کی طرف ھدایت کرتا اور اعمال صالحہ کی طرف مائل کرتا ھے۔

اجل کا یہ بھی فتوی تھا کہ مولانا سے متعلق جو تجربات مجھے ان کی موت کے بعد حاصل ھوں وہ ان تجربات سے کہیں زیادہ ھوں جو ان کی زندگی میں مجھے حاصل ھوئے۔ اپریل سنہ ۱۹۵۵ع میں جب صدر ناصر اور میں بینڈونگ کانفرس میں شریك ھونے جارھے تھے میری ان سے دھلی میں صرف چند لمحوں کے لئے ملاقات ھوئی تھی۔ سید اسمعیل کامل نے، جو دھلی میں مصر کے سفیر اور ھندوستان کے چاھنے والوں میں سے ھیں، میری ان سے ملاقات کروائی۔ میرا تعارف مصر کی انقلابی حکومت کے ایك وزیر، اور جامعہ ازھر کے ایك فارغ التحصیل مذھبی آدمی کی حیثیت سے کرایا گیا۔ مجھے اب بھی وہ جملے یاد ھیں جو اس موقع پر ان کی زبان سے نکلے۔ انہوں نے کہا تھا کہ: ھدایت والہام کے لئے مذھب پر اعتماد کرنا بنی نوع انسان اور خود مذھب کی خدمت کا بہترین طریقہ ھے۔ ملاقات سے قبل

میں نے مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ملنے کے لئے کافی تیاری کرلی تھی - میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ ان کا قریب سے مشاہدہ کرنے میں کوئی چیز میری توجہ کو پراگندہ اور میرے عزم کو کمزور نہ کرنے پائے، خصوصا جب کہ میں نے ان کے علم وفضل، ان کی شرافت نفس کے متعلق بہت کچھ سنا تھا اور جسکا دور دور شہرہ بھی تھا - میرے پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ میں ایسی عمیق اور ایسی کثیر الفضائل شخصیت کی گہرائیوں تك کس طرح جا پہنچوں اور اسکی عظمت اور اسکی غیر معمولی ذہانت و طباعی کا کسطرح کامل وقوف حاصل کروں - اس مختصر سی ملاقات میں زیادہ سے زیادہ جو چیز مجھے حاصل ہوسکتی تھی وہ نشاط و اہتزاز تھا جو ایك صناع کو فنون لطیفہ کے کسی پیکر کے مشاہدہ سے حاصل ہوسکتا ھے یا وہ رفعت ذہنی تھی جو ایك سائنس دان کو کسی محیر العقل دریافت سے نصیب ہوتی ھے - مولانا کی شخصیت نے مجھے مغلوب کرلیا، ان کی روح کی لطافت و نورانیت نے مجھے بڑا متأثر کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملاقات کے ان چند لمحوں میں وہ زماں کی تحدید و تقیید کے ماورا ہوگئے ھیں - تھوڑے ھی عرصہ میں میں نے محسوس کیا کہ گویا ھم ایك دوسرے کے قدیم دوست ھیں.

یہ مختصر سی ملاقات میرے شوق کی تسکین کا سامان نہ کرسکی - ان کی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کو جاننے کی خواھش اور زیادہ تیز ہوگئی - میری مثال اس تشنہ مسافر کی سی تھی جسکو بیاباں کے بیچ میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ مل جاتا ھے - میں نے ان سے ذہنی و روحانی ربط قائم کرنے کا ارادہ کرلیا اور خود ان کی تصنیفات اور جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ھے ان کا سیر حاصل مطالعہ کرنے کا تہیہ کرلیا - میرا یہ فیصلہ مولانا کے کثیر و وافر خزانہ علم کے پیش نظر، جسکا تعلق اس دنیا سے بھی ھے اور ماورائے دنیا سے بھی، زیادہ تعجب انگیز تو نہ تھا!

مغربی دنیا اپنے عملی وصنعتی ترقیوں اور کامیابیوں کے ذریعے ہمارے ذہنوں سے ہمارے ماضی کی عظمت اور کبرائے ملت کی یاد کو محو کرنے میں کامیاب ہوگئی ھے۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنے ماضی وحال کی تاریخ کے محاسن کو بھی نظر انداز کردیا ھے۔ لیکن مشرق کی موجودہ بیداری ہم میں ضرور ایک نیا شعور پیدا کردے گی جسکی وجہ سے ہم اپنے ماضی وحال کے انمول خزانوں کی قدر کرنے لگینگے اور ھمیں اس امر کا تحقق ہوجائے گا کہ یہ ان نفائس سے کہیں زیادہ قابل قدر ھیں جن کو ہم نے مغربی تمدن سے مستعار لیا ھے اور اتنے ھی یا شاید ان سے زیادہ نفع بخش بھی ھیں۔

جب میں ان سے مل کر جدا ھوا تو میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کروں گا، لیکن ایک طرف تو ان کی مصروف زندگی اور دوسری طرف خود میرے اشغال نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہیں دیا، اور میں ان کے علمی وتعلیمی کاموں پر غور نہ کرسکا اور ان کی تہذیبیٔ سرگرمیوں کے مطالعہ کے لئے کافی وقت نکال نہ سکا۔

قضا وقدر کا منشاء تھا کہ مولانا کی زندگی کا ایک پر سکون انجام ہو۔ ان کی وفات نے تاریخ کے طلباء کو ایک موقع فراہم کیا ھے کہ وہ مولانا کا صحیح نظر سے مشاہدہ کریں اور ان کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کا انکشاف کریں اور ان کو شہرت دیں۔ مولانا اپنی زندگی میں ایک حرکی قوت ثابت ہوئے ھیں۔ ان کی مثال ایک شہاب ثاقب سے دی جاسکتی ھے جو فضا میں ایک ھولناک رفتار سے سفر کررھا ھے اور جسکا مشاہدہ اسکی چمک دمک ھی کی وجہ سے کیا جاسکتا ھے لیکن کوئی یہ جان نہیں سکتا کہ اس نور درخشاں کے اندر کیا ھے!

(۲)

میں نے یہ عرض کیا ھے کہ مولانا سے میرا ذہنی رابطہ ان کی

وفات کے بعد بہ نسبت اس ربط وضبط کے جو مجھے ان کی زندگی میں حاصل ہوا زیادہ عمیق ہوگیا ہے۔

وفات پاکر وہ میرے حافظہ میں زندہ ہوگئے ہیں۔ اپنی زندگی میں انہوں نے ایک عظیم خلا کو پر کیا تھا، لیکن جب انہوں نے اس دارفانی سے رحلت کی اور ان کے قلم کا تازہ چشمہ خشک ہوگیا تو ہم نے اس حادثۂ فاجعہ کے وزن کو محسوس کیا اور جس نعمت عظمی سے ہم محروم ہوگئے ہیں اسکا ہمیں شعور ہوا۔ ہر آفت کے نزول کے وقت ہم انہیں یاد کرتے ہیں، کیونکہ ہدایت و مشورہ کے لئے ہمیں ان کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ جن نعمتوں سے وہ فیض یاب ہو رہا ہے ان کو بھول جاتا ہے لیکن جب یہ نعمتیں سلب کرلی جاتی ہیں تب وہ ان کی قیمت و اہمیت کا احساس کرتا ہے۔ اب وہ ان کی تعریف کے ترانے گانے لگتا ہے اور ان سے محروم ہوجانے کا غم کرتا ہے۔

ہندوستان میں زمانۂ ماضی اور حال میں جو بہت سارے کبرائے قوم گزرے ہیں ان کی طرح مولانا آزاد بھی بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالی کی ایک خاص نعمت تھے۔ انہوں نے صداقت کی تعلیم دی، محبت کا سبق دیا اور اعمال صالحہ کی تلقین کی۔ فلاح انسانی کا حصول ان کی زندگی کا مقصد تھا، اس کے محرکات نہایت رفیع وجلیل تھے۔ یہ مقصد ہمیشہ ان کے ملحوظ خاطر رہا، ان کے ضمیر نے اسکی پرورش کی، اور ان کی غیر معمولی ذہانت نے اسکو تقویت پہنچائی۔ ان کی پاک روح اصول صحیحہ اور اقدار انسانیہ کا مرقع تھی جن کو انہوں نے اپنی زندگی میں جذب کرلیا تھا اور دوسروں کو اسکی تبلیغ کیا کرتے تھے تاکہ زندگی کی صحیح راہ کی طرف ان کی ہدایت ہو سکے۔ جسطرح پانی اس برتن کا رنگ اور شکل اختیار کرلیتا ہے جسمیں وہ ہوتا ہے

اسی طرح اصول اور تصورات بھی شخصیت کا رنگ اور مزاج قبول کرلیتے ھیں ، خواہ یہ شخصیت صالح اور امین ھو یا فاجر اور قبیح۔ نیك اور عادل شخص عموما اپنے علوم و فضائل کو اپنی قوم کی خدمت کے لئے استعمال کرتا ھے۔ اسکا علم اس چشمے کے مانند ھوتا ھے جس سے ھر شخص سیراب ھوتا ھے۔ وھی تعلیم ایك خبیث روح میں بلا و مصیبت کا سبب بن جاتی ھے ، قوم کو گمراہ کرتی ھے اور اس کو اعمال سیئہ پر أکساتی ھے۔ پاك زمین میں جب ایك بیج بویا جاتا ھے تو وہ ایك سرسبز وشاداب درخت کی شکل میں نمودار ھوتا ھے اور پھل دیتا ھے۔ وھی بیج جب خراب زمین میں ڈالا جاتا ھے تو مٹی ھی میں گل سڑ جاتا ھے ، مٹی اس کو اسی طرح کھاجاتی ھے جسطرح زنگ لوھے کو کھا جاتا ھے۔ھمارے رسول کریم ، صلوات اللہ علیہ ، نے اس مفھوم کو اسطرح صحیح طورپر ادا کیا ھے کہ « خدا نے رشد وھدایت کی جس دعوت پر مجھے مامور کیا ھے اسکی مثال بارش کی سی ھے ، اگر یہ صالح زمین پر ھوتی ھے تو اس سے درخت اگتے ھیں اور پھل دیتے ھیں ، جب بنجر زمین پر ھوتی ھے تو یہ پانی کا ذخیرہ کرلیتی ھے جو لوگوں کے کام آتا ھے لیکن اگر یہ بارش غیر صالح زمین پر ھوتی ھے تو نہ اس سے درخت اگتے ھیں اور نہ یہ پانی ھی کا ذخیرہ کرتی ھے کہ پینے یا زراعت کے کام آئے »۔

(٣)

مولانا کی ذات میں خیر ھی کو جگہ مل سکتی تھی اور صرف امن و محبت ھی آسرا پاسکتے تھے۔ ایسی شخصیت میں جب ایك دفعہ صداقت کا ظھور ھوجاتا ھے تو پھر اس کی تجلی سے اوروں کی راہ منور ھوجاتی ھے۔ ایسی شخصیت صداقت کو پانے کے بعد پھلتی اور پھولتی ھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس نکتہ کو یوں ادا کیا ھے :

(٤)

وَالبَلَدُ الطَّیبُ یُخرج نَبَاتُہ بِاِذنِ رَبِّہِ   اور جو شہر پاکیزہ ھے اس کا سبزہ
والَّذِی خَبُثَ لایَخْرُجُ اِلّا نَکِدًا   نکلتا ھے اسکے رب کے حکم سے اور
(الاعراف ع ۷)   جو خراب ھے اس میں نہیں نکلتا
مگر ناقص ۔

مولانا کی یہ خوش نصیبی تھی کہ مکہ مکرمہ ان کا مولد، ھندوستان ان کا موطن، اور اسلام ان کا مذھب تھا ۔ مکہ مکرمہ میں انہوں نے آنکھیں کھولیں ۔ ان کے والدین نےوھاں سکونت اختیار کی اور زمین رسالت کے مقدس ماحول سے فیوض وبرکات حاصل کیں ۔ یہ غیر قرین قیاس نہیں کہ جاذبۂ الھیہ نے مولانا پر اپنا پرتو ڈالا ھو اور ان کے قلب میں جا گزیں ھوگیا ھو کیونکہ متبرک ماحول ھی میں فیوض الھیہ کا ورود ھوتا ھے ۔

مولانا نےاپنی زندگی ھندوستان میں بسر کی جہاں روح مادیت کے قیود سے آزاد ھوتی ھے، جہاں زندگی کی لذات وشہوات سے اجتناب واحتراز ایک عام قاعدہ ھے، وہ ھندوستان جہاں ارباب ھنر پرورش پاتے ھیں، جہاں ذھنی فضائل کو نشو ونما پانے کا موقع ملتا ھے، اور جہاں نقاد اور مبصر پیدا ھوتے ھیں ۔

اسلام، جو مولانا کا دین وایمان تھا، ایک ایسا مذھب ھے جو رنگ ونسل کے اعتبارات سے ماوراء ھوکر انسان کی قدر وقیمت کا اندازہ کرتا ھے ۔ ایک پیدایشی مسلمان اپنے پیدایشی عقیدہ کی بنا پر کسی دوسرے پر ترجیح نہیں پاتا اور نہ کوئی ممتاز مقام حاصل کرتا ھے، اور نہ اسلامی عقیدہ ھی کی وجہ سے کوئی اخلاقی رذائل سے پاک سمجھا جاسکتا ھے ۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے انسان اپنے اعمال وافعال ھی کی بنا پر اور اس خیر وشر کی وجہ سے جو اسکی ذات میں پائے

جاتے ھیں یا تو علوئے مرتبت حاصل کرسکتا ھے یا پھر اسفل السافلین میں جا گرتا ھے۔

اسلامی اصول کو مولانا کی ذات میں ایک خوشگوار اور موافق ماحول ملا۔ بہت جلد ان اصول نے ان پر غلبہ پالیا۔ ان ھی سے ان کے ذھن کی تشکیل ھوئی جس سے وہ سونچا کرتے تھے، ان ھی سے ان کے قلب کی تشکیل ھوئی جس سے وہ محسوس کرتے تھے اور ان ھی سے ان کے ضمیر کی صورت بنی جس سے وہ حکم لگاتے تھے اسلام کے قوانین و روایات پر عمل ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا، نہ اسلام کی راہ پر جادۂ پیمائی اور اس کے اوامر کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کے لئے سخت تھا۔ ان کی ذات میں اسلام ایک سیرت صالحہ اور اپنے تمام باطنی خیرات وحسنات کی صورت میں ظاھر ھوا۔ اگر مولانا مذھبی آدمی نہ بھی ھوتے تب بھی ان کی سیرت تمام اخلاقی رذائل سے پاک ھوتی۔

مولانا کی عظمت کا کامل ظھور وجود باری کے عقیدہ میں ھوتا ھے جو ان کے قلب میں راسخ تھا اور ان کے اسلامی اصول کے صحیح فھم و بصیرت میں۔ بغاوت کے الزام میں انھیں ایک برطانوی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان کے خلاف شہادت کا مواد ان کی دو تقریروں سے حاصل کیا گیا جو انھوں نے کلکتہ میں کی تھیں اور ان میں تمام ھندوستانیوں کو عام طور پر اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکومت کے خلاف شہری مقاومت پر ابھارا گیا تھا۔ مقدمہ سنہ ۱۹۲۲ع میں چلایا گیا جب کہ مولانا میں ابھی شباب کا شعلہ فروزاں تھا۔ زندگی کی اس منزل میں انسان کو عموما یہ خواھش ھوتی ھے کہ اپنے شباب کو قائم رکھے اور اس کو پیری سے دھشت ھوتی ھے۔ عام طور پر انسان لذائذ حیات سے متمتع ھونا چاھتا ھے، اور اپنے ھی معاملات سے اسکو سروکار ھوتا ھے۔ اگر مولانا اپنے زمانہ شباب میں اس پہلو

کو اختیار کرتے تو سمجھا جاتا کہ جوانی کا فتنہ جو مزاج کا یہی تقاضا تھا۔ اگر پیری میں ان کا یہ رویہ ہوتا تو سمجھا جاتا کہ یہ ضعیفی کی یاس و قنوط کا نتیجہ تھا۔ لیکن احکام قضا کا یہ منشاء تھا کہ مولانا اپنی عمر کی اس منزل میں جب کہ وہ جوانی اور پیری کے دوراہے پر تھے عزیمت کا ثبوت دیں۔ اس طرح قضا و قدر رفعت انسانی کی ایک مثال، جبر و استبداد کی مقاومت کا ایک نمونہ، صداقت پر کامل ایقان کا ایک ثبوت جریدۂ عالم پر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد کو مقابلہ کرنا تھا سلطنت برطانیہ کے سطوت و جلال کا جس کی دہشت عوام کے قلوب پر مستولی تھی اور ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور نجات کی ہر امید کو ان کے سینون سے محو کر دیا تھا۔ مولانا تنہا اس عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوے۔ قوی ایمان اور آہنی عزم کے سوا ان کے پاس اور کوئی ہتیار نہ تھے۔ جوری کے سامنے وہ تنہا کھڑے تھے اور ان سے کسی قسم کے رحم یا ہمدردی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ جوری سے ان کی توقع کچھ اسی قسم کی ہوسکتی تھی جو ایک مسکین بھیڑ کے بچے کو بھوکے بھیڑیوں سے ہوسکتی ھے جوں ہی عدالت مین اس جنگ کا آغاز ہوا ظاہر ہوگیا کہ یہ تاریخ کی ایک شدید جنگ ثابت ہونے والی ھے۔ اس جنگ میں مولانا کو بنی آدم کے لئے فتح مبین حاصل ہوی، ایسی فتح جس نے نسلہا نسل تک انسانیت کے مستقبل کا فیصلہ کردیا۔ اب ہم مولانا کے لئے جگہ خالی کرتے ھیں تاکہ وہ اپنے موثر الفاظ میں اس مجادلہ کا قصہ بیان کریں جس مین قوی تن ہی حصہ لے سکتے ھیں اور جو انسان کے قلب کو قوی کرتا اور اس میں جان ڈال دیتا ھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شر کی قوتوں کو شرمندہ اور ذلیل کردیتا ھے۔

مولانا نے عدالت کا مقابلہ جرأت اور استقامت کے ساتھ کیا

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عدالت میں نہیں حاضر ہوئے ہیں بلکہ کسی عزیز سے ملنے آئے ہیں۔ عدالت میں جو سناٹا چھایا ہوا تھا وہ مولانا کے الفاظ سے ٹوٹا۔

«میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لئے نہ تو کسی طرح کی امید ہے نہ طلب ہے نہ شکایت ہے۔ یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے، اس لئے تھوڑی دیر کے لئے اپنی مرضی کے خلاف دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے»

یہ کہہ کر مولانا اپنے لئے قید یا موت کا فیصلہ قریب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ایسے ملک میں رہنے کی بہ نسبت جہاں ظالموں ہی کی چلتی ہو انہوں نے محبس و موت ہی کو ترجیح دی۔ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

«اس جگہ کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد اور شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لئے قابل رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے، کاش غافل اور نفس پرست انسان اسکی ایک جھلک ہی دیکھ پائے، اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لئے دعائیں مانگتے۔

بہر حال میرا ارادہ نہ تھا کہ میں بیان دوں، لیکن جب میرا مقدمہ پیش ہو چکا ہے تو میں نے دیکھا کہ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے

معاملہ میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے حالانکہ میں ایسا شخص ہوں جسکو اسکی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہئے۔

پہلے میرے خلاف دفعہ ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعوی کیا گیا تھا، لیکن جب اس کا ویسا ثبوت بہی بہم نہ ہوسکا جیسا کہ آج کل اثبات جرم کے لئے کافی تصور کیا جاتا ہے تو مجبورا واپس لے لی گئی - اب ۱۲۴ - الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے - لیکن بد قسمتی سے یہ بہی مقصد برآری کے لئے کافی نہیں کیونکہ جو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں وہ ان بہت سی باتوں سے خالی ہیں جو میں اپنی بےشمار تقریروں و تحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور وہ شاید گورنمنٹ کے لئے زیادہ کارآمد ہوتیں۔

یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی - میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں »۔

کیا کسی نے ایسے ملزم کو دیکھا ہے جو اپنے جرم کا ثبوت خود فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عدالت کو اپنے خلاف فرد جرم سنانے میں مدد دیتا ہے؟ اس کام کی توقع محن و ابتلاء کے موقعوں پر صرف عالی نہاد ہستیوں ہی سے ہوسکتی ہے - مولانا نے بیان کے دوسرے حصہ میں اپنے جرم کے ثبوت میں فرمایا:

«اگر یہ بیانات کورٹ کی رائے میں میرے جرم کے ثبوت کے لئے کافی ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ .. گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بےشمار تقریروں میں یہ اوراسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں - ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے ... میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک

بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا - اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بد ترین گناہ کا مرتکب سمجھوں گا »۔

مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ غلط کاموں کو جائز قرار دینا اپنے ضمیر ، خدا اور انسانیت کے خلاف عمل کرنا ھے ان کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ اپنے مذھب اور اپنے ضمیر کے آگے اخلاق طور پر ذمہ دار ھیں کہ وہ باطل کو اپنی پوری قوت سے دفع کریں اور اگر اس مقصود کے حصول میں مادی قوت ناکام ہو تو پھر ظالموں کے جرائم کو واشگاف کر کے رکھ دیں - شیر کی گرج دار آواز میں انھوں نے عدالت کو مخاطب کیا:

” میں مسلمان ھوں اور بحیثیت مسلمان ھونے کے میرا فریضہ ھے کہ میں ظالم کے ظلم کا اعلان کروں - اسلام کسی اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ھو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ھو - وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ھے جو نوع انسان کو اسکی چھینی ھوی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا - یہ آزادی بادشاھوں ، اجنبی حکومتوں ، خود غرض مذھبی پیشواوں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی - وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ھے - لیکن اسلام نے ظاہر ھوتے ھی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں بلکہ خود حق ھے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے - اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے اور دنیا کو بتلادیا کہ سب انسان درجے میں برابر ھیں اور سب کے حقوق مساوی ھیں - نسل ، قومیت اور رنگ معیار فضیلت نہیں بلکہ صرف عمل ھے ، اور سب سے بڑا وھی ھے جس کے سب کام اچھے ھوں . . . انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ھے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس

پہلے ہوا.... ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہوجائے۔ اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقینا ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرسکتے کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے، کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے،،۔

یہ تھی سیرت مولانا آزاد کی۔ وہ پیشہ ور سیاست داں ہرگز نہ تھے جو کسی ناگہانی صورت حال کے مقابلہ کے لئے اور مختلف موقعوں کی ضرورتوں کے پیش نظر اپنا لباس بدلتے رہیں۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھے اور کبھی اپنے مذہب کا سودا کرنے راضی نہیں ہوے وہ کبھی اپنے یقین و اذعان سے دست بردار ہونے تیار نہیں تھے ہمیں یا حق و صواب کی حمایت کرنی چاہئے یا شر کا ساتھ دینا چاہئے حق و صواب کی حمایت میں ایک مسلمان ہر بلا و مصیبت کو برداشت کرنے تیار ہوتا ہے۔ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوے مولانا نے فرمایا:

،،اسلام تمامتر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جابجا کہتا ہے: «مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے»، ہر حال میں سچی بات کہے (وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللهَ)۔...اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لئے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں ان کے لئے دفعہ ۱۲٤ ــ الف کا مقدمہ یقینا کوئی بڑی ڈراونی چیز نہیں ہوسکتا جسکی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔...

میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اسکی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لئے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا۔ یہ بات تو بہر حال ہوتی

ھی تھی ، لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لئے بڑا ھی دردانگیز ھے کہ مسلمان سے کتمان شہادت کی توقع کی جاتی ھے اور کہا جاتا ھے کہ وہ ظلم کو صرف اس لئے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲٤ - الف کا مقدمہ چلایا جاے گا ،،۔

اپنے اس مشہور بیان کو ختم کرتے ہوے وہ اپنے ہم وطنوں کے طرف مخاطب ہوئے جنہیں عدالت میں ان کے خلاف شہادت دینے کے لئے لایا گیا تھا۔ ان کے لئے قیام عذر کی کوشش کی اور خدا سے دعا کی کہ وہ انکی خطا معاف کرے :

،، قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں اپنے ان ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک دو جملے کہوں گا جو اس مقدمہ میں میرے خلاف کام کر رھے ھیں ... میں تسلیم کرتا ھوں کہ سی آی۔ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ھے ، انہوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاھر کیا کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ھے .... البتہ میرا یقین ھے کہ انہوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاھر کیا ھے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ھے وہ ضرور معصیت ھے لیکن ساتھ ھی مجھے انکی کمزوری بھی معلوم ھے وہ محض چند روپیوں کی نوکری کے لئے ایسا کر رھے ھیں اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ھر بات پر ترجیح دیں۔ پس میرے دل میں ان کے لئے کوئی رنج اور ملامت نہیں ھے۔ میں اس کام کے لئے انہیں معاف کرتا ھوں اور دعا کرتا ھوں کہ خدا بھی انہیں معاف کردے ،،

مولانا انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ وہ سب سے یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ عزیمت کے اس مقام تک پہنچ سکینگے جس پر وہ فائز تھے۔ اسی لئے وہ دوسروں کی کمزوریوں کو معاف کرنے اور ان کے لئے قیام عذر کرنے تیار تھے۔ تاھم وہ اپنی قوم کے راہ گم کردہ افراد سے اپنا رابطہ بھی منقطع کرنا نہیں چاھتے تھے۔ وہ

ان سے اس امید پر ربط قائم رکھنا چاھتے تھے کہ ان کی کمزوریوں کا مداوا کریں اور عفو، حکمت و مسامحت کی قوت سے ان کا علاج کریں۔

جب وہ المناک داستان ختم ہونے کو تھی جسکو شہنشاھیت کے حامیوں نے عدل کا جامہ اوڑہ کر پیش کیا تو مولانا نے مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاھتا ہوں! زیادہ سے زیادہ سزا جو اسکے اختیار میں ھے بلا تأمل مجھے دے دے! مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشنری سے ھے، کسی ایک پرزے سے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلیگی، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔"

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینیو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا:

"زیادہ سے زیادہ سزا جو دیجاسکتی ھے بلا تأمل دے دو میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا"

"مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ھے جسکی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ھیں۔ ھمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹھرا آیا ھے، تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ھی ضروری چیز ھے جس قدر یہ کٹھرا۔ آو اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں، مؤرخ ھمارے انتظار میں ھے اور مؤرخ کب سے ھماری راہ تک رہا ھے۔ ھمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رھےگا، یہاں تک کہ

ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ھے۔ وقت اس کا جج ھے اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا، والحمد للہ اولا و آخرا ''۔

یہ تھے مولانا آزاد، اسلام پر یقین کامل نے انہیں تمام بلاء و محن میں استقامت عطا کی تھی۔ نہ ان کے قدم کو لغزش ہوئی اور نہ انہوں نے سواء السبیل سے انحراف کیا۔ اسلام توحید مطلق کی تعلیم دیتا ھے اور اس سے انسان صرف خدا ھی پر توکل کرنا سیکھتا ھے۔ مومن غیر اللہ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ وہ صداقت کی حمایت میں اپنی آواز بلند کرتا ھے۔ مولانا آزاد نے اپنے دین و مذہب کے امر کے امتثال میں صداقت کی حمایت کی۔

اسی وجہ سے انہوں نے قائد ذی شان مہاتما گاندھی سے قریبی تعلق قائم رکھا تھا۔ دین اور عقیدے کے اختلاف کے با وجود دونوں کا صداقت پر ایمان تھا اور دونوں نے اسکی تبلیغ کی۔ مولانا آزاد مومن قانت تھے تو گاندھی جی پکے ھندو۔ ھندوستان کے فرقہ واری جھگڑوں کی وجہ سے ان دونوں میں وحشت پیدا ھوسکتی تھی کیونکہ ان جھگڑوں نے بہت سارے مسلمانوں اور ھندؤں میں تعلقات بگاڑ دئے تھے۔ شہنشاھیت پسندوں نے صدھا سال سے یہ نزاع پیدا کر رکھی تھی اور جب بھی قائدین قوم نے اس آگ کو بجھانا چاھا اس کو اور ھوا دے دی گئی۔ لیکن مذہب کے معنی اور اس کی تاثیر کے متعلق مولانا اور گاندھی جی کو جو گہری بصیرت حاصل تھی اس نے ان دونوں کو رشتۂ محبت میں باندھ رکھا تھا اور شہنشاھیت پسندوں کے خلاف ھندؤں اور مسلمانوں کو متحد کردیا تھا ان دونوں کی سعی بالآخر مشکور ھوئی اور ھندوستان نے برطانیہ کو شکست دینے اور اس کی فوجوں کا یہاں سے تخلیہ کروانے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح اس نے اپنی کھوئی ھوئی آزادی اور عزت کو دوبارہ پالیا۔

مولانا آزاد کے لئے مذہب کوئی ایسی چیز نہ تھا کہ لوگوں کو محض تجرید اور قناعت کی زندگی بسر کرنے اور اپنی ذات کے سوا کسی اور شیء سے سروکار نہ رکھنے کی تلقین کرتا ۔ ان کے پاس مذہب کوئی مال تجارت نہ تھا جو کذب و نفاق کی خریدی میں استعمال کیا جا سکے یا پھر مادی منفعت یا ذاتی وجاہت کے حصول میں کام آئے ۔ مذہب ایسی کوئی چیز ھے بھی نہیں ، وہ اخلاق اور سیرت صالحہ کا نام ھے ، وہ انسان کو ثبات علی الحق اور طیبۃ قلب عطا کرتا ھے ۔ انکی رائے میں مذہب سے انسان وھی سکون حاصل کرسکتا ھے جو ایک پا پیادہ مسافر کو گرمی کے موسم میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے ملتا ھے ۔

اسلام جو مولانا کا دین تھا ایک ایسا مذہب ھے جو انسان پر خیر و برکت کی لگاتار بارش کرتا ھے اور متعدد و مختلف قوموں کو نسل و نسب کی وحدت میں مربوط کردیتا ھے ۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس نکتہ کے متعلق اسلام کا عقیدہ پیش کرتی ھے :

یا ایُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثیٰ وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰکُمْ (پ ۲۶ رکوع ۱٤)

اے لوگو! ھم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ھے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو ، اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ھے جو سب سے زیادہ پرھیزگار ھے ۔

مولانا آزاد کے ذھن میں حصول علم کا مقصد مذہب کی خدمت سے کچھ کم نہیں ۔ انکی نظر میں تعلیم مال جمع کرنے کا ذریعہ نہیں کہ بخیل کی طرح اسکا ذخیرہ کیا جائے یا مسرف کی طرح اس کو پھونک

دیا جائے۔ تعلیم کے سپرد بھی وہی وظیفہ کار ہے جو مذہب کے ذمہ ہے ۔ تعلیم ذہن کو روشن کرتی ، سیرت کا تزکیہ کرتی اور قلب میں وہ جاذبۂ انسانیت پیدا کرتی ہے جو صداقت کی اشاعت کے لئے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے ، اور اسطرح تعلیم اسرار کائنات کو مکشوف کرتی اور قوائے فطرت کو بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے استعمال کرتی ہے۔

تعلیم کے ان فوائد کے پیش نظر مولانا آزاد نے اپنے نفس کو زیور علم سے آراستہ کیا اور اس کے حصول میں اپنی پوری قوت صرف کردی ۔ انھیں اطمینان تھا کہ وہ ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح طلب علم میں مصروف ہیں اور اسی مجاہد کے ایمان و اعتقاد کے ساتھ۔ جو حق و صداقت کی تبلیغ کے لئے مجاہدہ کررہا ہے ، اسی لئے مولانا آزاد نے تعلیم کو اپنے پیام امن کے نشر کرنے کے لئے ایک آلہ قرار دیا ۔ وہ جانتے تھے کہ تمدنی تعلقات لوگوں کو باہم مربوط کرنے میں وہی قوت واثر رکھتے ہیں جو آبائی تعلقات کا ہوتا ہے ۔ وہ بخوبی واقف تھے کہ ان تعلقات کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوجاتے ہیں اور جوں ہی ان کے خیالات و تصورات میں یگانگت پیدا ہوتی ہے وہ ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوجاتے ہیں ۔ ان کی رائے میں لوگ تمدنی تعلقات ہی کی بنا پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں ۔ اسی طریقہ سے ایک جامع وحدت انسانی کا حصول ممکن ہوتا ہے اور لوگوں میں محبت و مودت پیدا کی جاسکتی ہے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس کے پہلے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا :

" تمدنی تعاون بین الأقوامی نقطۂ نظر سے بھی نہایت ضروری تھا ۔ اگر ہم محبت اور حسن ارادت کی اساس پر افراد کے عظیم اجتماعات کی تعمیر میں کامیاب ہوجائیں تو پھر لوگوں کے دلوں

سے شک و شبہ ، بعد و بیگانگی رفع ہوجائینگے اور ہم بین قومی اتفاق واتحاد پیدا کرنے اور امن عالم کو قائم کرنے میں کامیاب ہوجاینگے»
تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تمدنی رشتے سیاسی رشتوں سے بھی زیادہ لوگوں میں اتحاد پیدا کرتے ہیں ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سیاسی تعلقات کی بنا تو ذاتی منفعتوں پر قائم ہے لیکن تمدنی تعلقات خلوص و اتفاق پیدا کرتے ہیں ۔ اسلام کی تعلیمات اور علم و تربیت کی اہمیت پر غور و فکر نے ان کے قلب میں جذبۂ محبت کو بیدار کیا اور اعمال صالحہ کی خواہش پیدا کی ۔ اپنی ساری زندگی میں انہوں نے نہ کسی سے نفرت کی نہ کسی کو ضرر پہنچایا خواہ ان کا مخالف کتنا ہی بد یا بد نام کیوں نہ ہو ۔ اور نہ انہوں نے ان لوگوں سے نفرت کی جو ہندوستانی قوم کو غلام بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور ان کے وطن کی حرمت کی ہتک کررہے تھے ۔ گاندھی جی کی طرح انہوں نے برطانیہ کی استعماریت کے خلاف جنگ کی ، اہل برطانیہ کے خلاف نہیں ! وہ جنگ ایسی نہیں تھی جس میں ہندوستانیوں نے اہل برطانیہ کے خلاف ہتیار اٹھائے ہوں ۔ اس جنگ میں جو ہتیار استعمال ہوے وہ اخلاقی ہتیار تھے ، برطانوی سامان کا مقاطعہ کیا گیا ۔ ہندوستانی کوئی ایسی چیز نہیں استعمال کرتے جو برطانیہ میں بنی ہو ۔ انہیں برطانوی باشندوں سے ملنے اور ان سے سماجی تعلقات قائم رکھنے کی اجازت تھی ۔ کوئی شخص اس وقت خیال نہیں کرسکتا تھا کہ یہ تحریک کسقدر مؤثر ثابت ہوگی ، لیکن عملاً یہ منجنیقی آلات سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی ۔ اس نے شہنشاہیت کے ایوان میں زلزلہ ڈالدیا اور اس کے حامیوں کو بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا ۔ یہ تھے آزاد ، گاندھی جی کی طرح ان کا بھی ایقان تھا کہ خیر سے خیر ہی صدور کرتا ہے اور شر سے شر ہی پیدا ہوتا ۔ حق وصداقت ہی کے تمسک سے ہندوستان کو بالآخر فتح حاصل ہوئی ۔

صداقت اور راستی کے ھی اصول پر ھندوستان نے اپنی زندگی کی تعمیر میں کامیابی حاصل کی اور مملکت کو محبت و امن کی اساس پر قائم کیا۔

مولانا آزاد کی وفات سے ھندوستان کو جو نقصان ھوا وہ سارے عالم انسانیت کا نقصان ھے، کیونکہ عالم انسانیت بھی صداقت کے ایک روشن منار سے محروم ھوگیا! اس کا صدمہ اور بھی زیادہ محسوس ھونے لگتا ھے جب ھمیں اس امر کا احساس ھوتا ھے کہ عالم انسانیت صداقت کے حامیوں اور داعیوں کا کسقدر محتاج ھے! اس جان کاہ صدمہ کی تسکین صرف اس خیال سے ھوتی ھے کہ مولانا نے اپنے علمی و عقلی کمالات کا ایک وافر ذخیرہ چھوڑا ھے جو حق و صداقت و حریت کے نشرو اشاعت کے کام میں لایا جاسکتا ھے، گو ان کی سوانح حیات موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے شمع ھدایت کا کام دے سکتی ھے تاھم بلا خوف تردید یہ بھی کہا جاسکتا ھے کہ بہت سے لوگ ھندوستان میں اور ھندوستان سے باھر مسلم اور غیر مسلم ممالک میں ان کی لافانی شخصیت سے پورا استفادہ کرسکتے ھیں اگرچہ مولانا کی عمر کا آفتاب غروب ھوچکا ھے تاھم وہ ابد تک ضیاء پاشی کرتا رھے گا! اگرچہ ان کی تاریخ حیات کا یہ درخشاں باب ختم ھوچکا ھے تاھم ابدی تاریخ میں اس کا اپنا ایک موزوں مقام ھوگا۔ ان درخشاں صفحات کے مصنف کا مقلدین میں ایک خاص مقام ھوگا۔ ھندوستان، جو بجائے خود ایک اقلیم ھے، جب بھی اپنے فلسفیوں، رھبروں، اور ٹیگور، گاندھی، اقبال، اور آزاد کے پایہ کی شخصیتوں کی یاد تازہ کرتا ھے تو اس کو یہ توقع اور امید ھوتی ھے کہ اسکے موجودہ اور زندہ قائد اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرینگے جو گاندھی، ٹیگور، اقبال اور آزاد کی رحلت سے پیدا ھوگیا ھے۔ ھندوستان تو عالم انسانیت کے سورماؤں کا جنم بھوم اور گہوارہ رھا ھے۔

خدا کی رحمتیں اس لافانی روح پر نازل ہوں ، خدا اس کی سالگرہ کے دن کو فیض و ہدایت کا سرچشمہ بنادے حق تعالی اپنے کرم سے ۔ ہندوستان اور سارے عالم کے اس عظیم الشان نقصان کی تلافی کا سامان کرے ! آمین !

خراج تحسین

از

لارڈ پتھک لارنس

مجھے اپنے قدیم دوست مولانا آزاد کی وفات کی خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ گزشتہ سال ڈسمبر کے مہینے میں انہوں نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے مکان (نئی دھلی) میں مدعو کیا تھا۔ اس وقت انکی صحت اچھی تھی اور وہ اپنی سترویں سالگرہ کے منتظر تھے۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے میری دلچسپی کی بہت ساری چیزوں کے متعلق معلومات فراہم کئے تھے اور مجھے بتلایا تھا کہ ھندوستان میں لوگ نوشت و خواند کی قابلیت کس تیزی سے حاصل کر رہے ھیں، عورتوں میں تعلیم کیسے پھیل رہی ھے، اور قریوں اور دیہاتوں میں مدارس کی تعداد کس سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ھے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں جب میں ھندوستان کیبنٹ مشن کی قائد کی حیثیت سے گیا تھا تاکہ حکومت کی منتقلی کا انتظام کیا جاسکے تو میں اپنے قیام کے دوران میں ان سے ہر روز ھی ملا کرتا تھا۔ وہ اس زمانہ میں کانگرس کے صدر تھے اور انہیں ایک ممتاز، فاضل اھل علم کی حیثیت سے ایک بے مثل اور بعض دفعہ مشکل فریضہ انجام دینا تھا۔ میں نے انکی سیرت اور عقلی فضائل کے متعلق بڑی اچھی رائے قائم کی اور انکا رویہ نہایت باوقار اور محتاط تھا۔

نہ صرف ھندوستان ھی میں بلکہ دولت مشترکہ کے ان تمام حصوں میں جہاں انکی شخصیت سے لوگ واقف تھے ان کی موت کا ماتم کیا جائے گا، وہ ایک مشہور خادم ملت تھے جنھوں نے اپنی اعلی قابلیتوں کو اپنے ملک کی آزادی کے حصول میں اور اپنی قوم میں علم و کمال کے بلند معیار کی تعمیر میں صرف کیا تھا۔

مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں

از

لوی ماسینو

جب میں ان خیالات کو ذہن میں مستحضر کر رہا تھا جو میں اپنے دوست کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں پیش کرنے والا تھا، مجھے مشرق ہواؤں کی سرسراہٹ نے، بحر الھند سے گزر کر نرم سسکیوں میں، ان کی وفات کی ماتم انگیز و المناك خبر سنائی!

اور اب میرے قلب مین غم و الم میں ڈوبی ہوئی وہ یاد تازہ ہو رہی ھے جب میں ان سے پہلی مرتبہ اور پھر آخری دفعہ ملا تھا اور صرف دو ھی مہینے تو گزرے ھیں کہ میں لاھور گیا تھا اور سرحد پار کر کے ایك مرتبہ اور ان سے مل سکتا تھا!

ان سے میری پہلی ملاقات پچاس سال پہلے سنہ ۱۹۰۷ - ۱۹۰۸ء میں بغداد میں ہوئی تھی - ھم مسجد مرجان میں ملے تھے، ھم دونوں اپنے محترم استاد الحاج علی آلوسی کے شاگرد تھے، جن کا مرقد اسی مسجد میں ھے - وفات کے وقت وہ قاضی القضاۃ تھے اور انھوں نے جنوری ۶ - ۷، سنہ ۱۹۲۲ء کی رات میں اس دار فانی سے رحلت کی تھی - یہ حنفی فقیہ نعمان آلوسی کے فرزند ارجمند تھے جو جلاء العینین کے مصنف، ابن تیمیہ کے حامی و طرف دار، اور محمود کے پوتے تھے جو تفسیر روح المعانی کے شھرۂ آفاق مصنف گزرے ھیں - علی اپنے ابن عم ابو الحسن محمود شکری کے ساتھ ھی رھا کرتے تھے (ان کی وفات ۸ مئی سنہ ۱۹۲٤ء میں ہوئی، میں نے ان کی مزار پر ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۲٤ء میں فاتحہ پڑھی تھی، یہ مزار مدفن جنید میں ھے) آلوسی مہمان کی حیثیت سے میں ان ھی کے قریب محلہ حیدر خان میں رھا کرتا تھا، اب اس محلہ کو نئی سڑکوں نے توڑ دیا ھے - (صرف عقولی مسجد اور ان کا قدیم مکان باقی ھے، جو اب سرکاری مدرسہ بن چکا ھے) -

هم دونوں نے (مولانا اور میں) علی کی زبان سے وہ تعلیم حاصل کی تھی (جس سے مولانا پہلے ھی سے مانوس تھے) جس پر نواب سید صدیق حسن خاں بھوپالی کا گہرا اثر تھا - سید صدیق حسن خاں (وفات سنہ ١٣٠٧ ھ / ١٨٨٩ ء) نے ھندوستان میں علی کو ان کے شباب کے زمانہ میں پڑھایا تھا - وہ اھل حدیث کے ھاں مجدد مانے جاتے تھے - علی نے اس سلفی تحریک میں حصہ لیا تھا جو تمام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے شروع کی گئی تھی - جب میں قاھرہ گیا تو علی نے (جو بعلبك میں قاضی رہ چکے تھے) مجھے عراقی اور مصری سلفیوں سے ملایا جن میں سے قابل ذکر جمال قاسمی اور رشید رضا ھیں - بیس سال بعد میں نے اپنے نوجوان دوست و شریك کار ھنری لاؤست کی ملاقات رشید رضا سے کروائی اور ان ھی کی زیر نگرانی انھوں نے ابن تیمیہ اور وھابیت پر اپنی قابل ذکر تحقیقات شروع کیں -

میں تصوف اور صوفیاء کے مختلف خانوادوں کا معاشری نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے میں مصروف تھا ، آلوسیوں نے مجھے سمجھایا کہ شہید بغداد حسین منصور حلاج پر حنبلی عقیدہ کی کتنی گرفت تھی اور انھوں نے مجھے ان کے حنبلی حامیوں ، ابن عقیل اور ھرات کے انصاری اور ابن قدامہ کی بھی نشان دھی کی - اور علی ھی سے میں نے سید صدیق حسن خاں کی صحیح قدر و قیمت کرنی سیکھی جو اردو میں ١٠٣ ، عربی میں ٧٤ اور فارسی میں ٤٥ رسائل کے مصنف تھے .

آخری ملاقات سے قبل ھماری ایك ملاقات نئی دھلی میں ھوئی جہاں مجھے مولانا نے گاندھی سمینار میں شرکت کے لئے مدعو کیا تھا - میں اس دن کو بھول نہیں سکتا (٨ جنوری سنہ ١٩٥٣) جب وہ مجھے اکیلے اپنے ساتھ دوپہر کے کھانے کے لئے گھر لے گئے تھے - ھم دونوں کی زندگی کا بڑا حصہ ختم ھوچکا تھا - ھم دوبارہ مل رھے تھے اور دونوں اس امر کے خواھش مند تھے کہ اسلام کو ایك تیسری بڑی قوت کا مقام

دلائیں ، اور مسلمان اقلیتوں کی مساواۃ کے حقوق حاصل کرنے میں
مدد کریں ، وہ ھندوستان میں اور میں مغربی افریقہ میں ۔ ھم دونوں سلف
ھی کو ھر معاشری اصلاح کے طریقوں کی مستحکم اساس تسلیم کرتے تھے ۔
میں نے ان سے اس ورثہ کا ذکر کیا جو بغداد میں اس سال مجھے
نصیب ھوا جب ھم ایک ساتھ تھے (سنہ ۱۹۰۷ء تا سنہ ۱۹۰۸ء)
اور جب حسین منصور حلاج نے ایک عجیب و غریب کشف کے ذریعہ
میری تمام علمی و معاشری تحقیقات کا ڈھانچہ تیار کردیا اور صرف اسی
دنیا کے لئے نہیں ۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ مجھے بنگال میں حلاجی اثر و نفوذ سے
کس قدر دلچسپی رھی ھے ۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی رائے میں
منصور کے یہ پیرو حلاج کے اس ابلیسی نمونہ کے مشابہ ھیں جسکو اقبال نے
اپنے جاوید نامہ میں پیش کیا ھے ۔ (اقبال نے خود مجھے اپنی وفات سے دو سال
قبل پیارس میں مل کر پرجوش طریقہ سے اس کو سمجھایا بھی تھا) ھم نے
سید سلیمان ندوی کے متعلق بھی گفتگو کی (جن کو اقبال نے حلاج پر میری
تحقیقات کی نسبت لکھا تھا) ، اور موت سے قبل ان کی خلوت و عزلت کا
بھی ذکر رھا ۔ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ مولانا کو حلاج کے نظریۂ صداقت
«انا الحق» کی اس تعبیر سے دلچسپی تھی جس کو میں نے پیش کیا تھا اور اسی
کی وجہ سے میں گاندھی جی کی ستیا گرہ میں معاشری حیثیت سے شریک تھا ۔
اور وہ میرے بہت قریب ھی معلوم ھوتے تھے جب میں نے اس واقعہ کا
ذکر کیا جب میں نے قاھرہ کے حسین ھیکل اور طھران کے متین دفتری
کے ساتھ خواجہ قطب الدین بختیار کی قبر کی زیارت کی تھی ، جو مھرولی
میں واقع ھے ، مھرولی کی یہ زیارت گاندھی جی کی وفات سے چار روز
پہلے ان کے آخری برت کے احترام کے خاطر تھی جو انھوں نے مسلمانوں
کے ساتھ انصاف کئے جانے کی غرض سے رکھا تھا ۔

ھم میں خطوط کا آخری تبادلہ مھرولی کے مسلمانوں کے لئے
دعا کے رابطہ کے سلسلہ میں ھوا اور اس زمانہ میں بھی جب میں

اپنے وطن مین مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے بار بار کوشش کررھا تھا۔

ان سے آخری ملاقات ۱٤/ جولائی سنہ ۱۹۵۵ع میں پیارس میں ھوئی جو فرانسیسیون کی قومی عید کا دن تھا۔ میں مسجد سے واپس ھورھا تھا جہاں ھم نے ان پانچ فرانسیسی الجزائری مزدوروں کی یاد منائی تھی جو دوسال قبل اپنی عید کے جلوس مین نہایت غیر قانونی طریقہ سے شہید کردئے گئے تھے۔ وہ میرے احساسات کو پوری طرح سمجھ رھے تھے اور مخالف قوتوں کے خلاف میرے قلب میں جو غیظ وغضب تھا اس پر ھلکا سا تبسم بھی ان کے چہرہ پر نہ تھا۔ ان کا بھی آخری کام استقامت اور آگے کی طرف قدم کا اٹھانا تھا۔

اللّٰہ وحدہ!

پیاریس، ۳۱/ مارچ سنہ ۱۹۵۸ع

عقل کی آواز

از

جے - بی - کری پلانی

مولانا آزاد کی شخصیت، ان کے گونا گوں کمالات، اور ملک کی سیاسی، عقلی اور تمدنی زندگی میں ان کی مساعدت پر کوئی جامع مانع اور تنقیدی بحث کرنی قبل از وقت ہے - جن شخصیتوں نے کسی قوم کی سیاسی اور عقلی زندگی کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ان کے کام کا صحیح اندازہ قائم کرنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے - تاہم مولانا کے متعلق ہم اس قدر جان چکے ہیں کہ اگر اس وقت بھی ان کے کاموں کا ایک تنقیدی جائزہ لیں تو مرور زمانہ سے اس پر کوئی اثر نہ ہوگا -

میں انہیں سنہ ۱۹۱۳ء سے جانتا ہوں - میری یہ واقفیت ان کے ہفتہ واری اخبار «الہلال» کے ذریعہ حاصل ہوئی - وہ زمانہ ہندوستانی صحافت کا درخشاں دور تھا - تلک، بی پن پال اور آرو بندو اور دوسرے بہت سارے لکھنے والوں کا دور! مولانا کی صحافت کا پایہ نہایت بلند تھا - اس زمانہ میں میں بہار کے کسی کالج میں تاریخ کا پروفیسر تھا - میرے لئے یہ ایک عجیب و غریب سی بات تھی کہ ایک نوجوان جو کسی جدید یورپی زبان سے واقف نہ ہو کس طرح ہم عصر داخلی اور بین قومی سیاسی حالات پر اسی تیقن کے ساتھ بحث کرسکتا ہے جو ایک بالغ نظر اور مشاق ماہر ہی کا کام ہے - وہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ پر، عام طور پر استعماریت اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے تعلق سے بحث کیا کرتے تھے - ان کی رائے میں برطانوی شہنشاہیت کی زنجیروں سے ہندوستان کی نجات وہ شرط مقدم تھی جسکے حصول کے بغیر اسلامی ممالک کا وہ زنجیرہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا تھا جن میں ان کو مغربی شہنشاہیت پسند اقوام اور خصوصا برطانیہ نے کس رکھا تھا -

چنانچہ دوسرے ممالک اور اقوام کو غلام بنانے کے لئے ہندوستانی سپاہیوں ہی سے کام لیا جاتا تھا ۔ اسی لئے مولانا کے نزدیک ہندوستان کی قومی جدوجہد میں حصہ لینا نہ صرف وطن کے لئے بلکہ مسلمانوں کے لئے بھی ایک اہم فرض کا ادا کرنا تھا ۔

اس سلسلہ میں جو کچھ مولانا نے اپنے اخبار میں لکھا اس کی ، اور ان کے مشتبہ انقلابی کارناموں کی بنا پر ان کو سنہ ۱۹۱۶ ء میں رانچی میں قید کردیا گیا ۔ گو رانچی میں میری ان سے شخصی ملاقات نہیں ہوئی تھی تاہم ان دوستوں کے توسط سے جو اس زمانہ میں انقلابی تحریک میں حصہ لے رہے تھے میرا ان سے ربط پیدا ہو چکا تھا ۔

مولانا کو سنہ ۱۹۲۰ ء میں رہا کردیا گیا ۔ گاندھی جی کی قیادت میں آزادی اور خلافت کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں ۔ اس وقت ممتاز مسلم قائد حکیم اجمل خاں ، ڈاکٹر انصاری ، مولانا آزاد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تھے ۔ آخر الذکر دونوں بھائی سب سے زیادہ مقبول اور فعال قائد سمجھے جاتے تھے ۔ یہ دونوں ، اول الذکر تین قائدین کی گویا ضد تھے جو زیادہ شستہ ، شائستہ اور حساس واقع ہوئے تھے اور عام جلسوں اور جلوسوں سے زیادہ ایوان مجلس میں کارآمد تھے ۔ مولانا بعض دفعہ عام جلسوں اور خلافت کے اجتماعوں میں آیا کرتے تھے لیکن چپکے سے مخل صحبت ہوئے بغیر شہ نشین کے پیچھے جا بیٹھتے اور شاذ و نادر ہی بولتے ۔ لیکن جب انہیں تقریر کرنے پر آمادہ کرلیا جاتا تو پھر ان کی شیریں بیانی اور ان کے اپنے دعوے کی مدلل توضیح سن کر طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ۔ وہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے ، تاہم ان کی حجت اتنی قوی ہوتی کہ وہ جذبات کو ضرور متأثر کرتی ۔ ایک دفعہ میں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ آپ کیوں محمد علی اور شوکت علی کو ان کے وفور جذبات و حرکات

کے با وجود ذی ہوش مہذب اور خاموش مولانا پر ترجیح دیتے ہیں؟
گاندھی جی کا جواب پر معنی تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مولانا کے
علم و فضل سے اور ان کی لطافت اور شائستگی سے خوب واقف ہیں
لیکن ان کو آگے بڑھانے کی جو بھی کوشش کی گئی ناکام ہوئی۔
یہ چیز ایک عمومی تحریک کی قیادت کے لئے مفید نہیں۔ میں نے
اس گفتگو کا ذکر کسی عداوت انگیز مقابلہ کی خاطر نہیں کیا ہے
بلکہ اس سے میرا مقصد ایک تاریخی صداقت کا اظہار اور مولانا کی
سیرت کے ایک پہلو کا نمایاں کرنا ہے۔

لیکن عوام الناس میں اپنی مقبولیت کی اس کمی کی تلافی
انہوں نے اس قائم و راسخ وفاداری سے کردی جو انہیں قومی آزادی
و استقلال اور ہندو مسلم اتحاد کے تصورات سے تھی۔ ان کے اکثر
مسلم ہم وطن حکومت برطانیہ کی اس حکمت عملی کا شکار ہوگئے تھے
کہ دو بڑے فرقوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھا جائے لیکن
مولانا نے اپنے شباب ہی میں جو راہ اپنے لئے مقرر کرلی تھی،
آخر وقت تک اسی پر قائم رہے۔ انہوں نے نہایت استقامت کے ساتھ
اپنے فرقہ کے اختلاف اور اہانت کے باوجود، اپنا کام جاری رکھا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کو کانگرس کے اس خاص اجلاس کا
صدر منتخب کرلیا گیا جو دہلی میں ہوا۔ ان کی اعتدال پسندی نے
اس افتراق کو رفع کردیا جو تغیر کے موافقین و مخالفین میں پیدا ہوگیا تھا۔

ان لوگوں کے قلوب پر جنہیں تیس سال کے طویل عرصہ تک
مولانا کی معیت کا شرف حاصل رہا ہے، خصوصا اس زمانہ میں
جب کہ ہندوستان کے استقلال کی جدوجہد جاری تھی، کیا خاص
اثر ہوا؟ میں سمجھتا ہوں کہ تمام اساسی معاملات پر انہوں نے اپنے
زمانۂ شباب ہی میں غور کرلیا تھا اور خاص نتائج اخذ کرلئے تھے
اور وہ یہ تھے کہ ہندوستان کا آزاد ہونا ضروری ہے اور یہ آزادی

نہ صرف ہندوستان ہی کی خاطر بلکہ تمام مستعمراتی دنیا کی خاطر جس میں اسلامی ممالک بھی شامل ہیں ۔ اسلئے ہندوستانی شہری کی حیثیت سے جو ان کے فرائض تھے وہی دین اسلام کے عالم ہونے کی حیثیت سے تھے ، ان دونوں میں کوئی اختلاف نہ تھا ۔ جب وہ دوسروں کے ساتھ عدم تشدد کی تحریک میں شریک ہوئے ، جو ہندوستان کی آزادی کے لئے گاندھی جی کی قیادت میں چلائی جا رہی تھی ، تو ان کا یہ عمل انتہائی خلوص اور یقین کامل پر مبنی تھا ۔ انہیں یقین تھا کہ آزادی کے حصول کا واحد طریقہ عوام الناس کو اس تحریک میں شریک کرنا ہے جن کے اتحاد عمل کے بغیر ملک کی آزادی ناممکن تھی ۔ اور اس کے لئے عدم تشدد اور ہر راز کا پردہ فاش کرنا ضروری تھا اپنے قلب کو اس یقین سے مستحکم کر لینے کے بعد نہ ان کے عقیدہ میں کبھی تزلزل ہوا اور نہ گاندھی جی کی قیادت میں انہیں شبہ ہوا ۔ اس میں شک نہیں کہ بہتوں کی طرح عدم تشدد پر ان کو اعتقاد نہ تھا ، لیکن جس حکمت عملی کو کانگرس نے غور و فکر کے بعد عملی وجوہ کی بنا پر اختیار کر لیا تھا اس کا انہوں نے ہمیشہ ساتھ دیا ۔ مولانا کے خیال میں پر تشدد انقلاب کے تصور سے دل بہلانا یا اس کے حامیوں کا ساتھ دینا فضول تھا یہ بات بہت سارے دوسرے قائدین کے متعلق نہیں کہی جاسکتی تھی ، خصوصاً بنگال کے قائدین کے متعلق تو یہ بالکل صحیح نہیں ہوسکتی ۔

مولانا کے ان تیقنات پر نیرنگی زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوا ۔ ان کی سیاسی زندگی کا کوئی تغیر یا ملک کی قوتوں کی نئی صف بندی ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکی ۔ ان کے محرکات عمل کی کوئی غلط توجیہ ، کوئی افتراء و بہتان ، اراذل کی اہانت و شماتت (یاد رہے کہ وہ نہایت حساس واقع ہوے تھے) ان کو اس راہ سے منحرف نہ کرسکی ، جو انہوں نے اپنے لئے اختیار کرلی تھی ۔ تمام چیزوں میں عقل و تمیز اور اعتدال ان کا مسلک تھا اور جہاں تک کہ ان کے اساسی تیقنات کا معاملہ تھا وہ ایک مضبوط

چٹان کی طرح ان پر قائم تھے ۔ یہاں مصالحت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔

مولانا سے میرے شخصی تعلقات سنہ ۱۹۲۰ ء ہی سے قائم ہوگئے تھے لیکن ان سے قریبی ربط اس وقت پیدا ہوا جب میں کانگرس کی مجلس عاملہ کا رکن اور اس کا معتمد عمومی بن گیا ۔ گو میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ کانگرس پارٹی کی تمام تفصیلات میں یا خاص خاص متنازع فیہ مسائل میں میں مولانا کے ساتھ کامل اتفاق کرلیتا تاہم قومی مسائل کے متعلق ان کے نقطۂ نظر اور معاملات پر ان کی عقلی گرفت کی داد دئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا ۔ ان کے علم سے متأثر نہ ہونا مشکل تھا ، جو عمیق بھی تھا اور وسیع بھی ۔ ان پر اس کا کوئی ثقل محسوس نہیں ہوتا تھا ۔ سالہا سال تک کانگرس کی مجلس عاملہ کا گویا ایک خاندان سا رہا اور جب کبھی ہم مجلس عاملہ کے ارکان دوپہر کے کھانے پر یا چائے پر یا شام کے کھانے پر یکجا جمع ہوتے یا واردھا میں سیٹھ جمنا لال بجاج کی سادہ لیکن فیاضانہ مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تو اس خاندان کے حلقے میں مولانا کا علمی تبحر ، ان کی زندہ دلی اور خوش طبعی ان کی گفتگو میں جھلک کر جان ڈالتی رہی !

تفریح طبع کے لئے ہماری ان صحبتوں میں تاریخ و جغرافیہ ، بڑی شخصیتوں کی سوانح ، خصوصا ممالک اسلامیہ سے متعلق قصے بیان کئے جاتے تھے ۔ مولانا ہمیں بتلایا کرتے کہ کسی خاص رسم کی ابتدا کہاں ہوئی یا کوئی خاص میوہ یا کوئی خاص قسم کا کھانا کہاں سے ہندوستان آیا ۔ سروجنی نائیڈو کی گپوں (جو ہمیشہ معصوم تو ہوا نہیں کرتی تھیں) سردار پٹیل کے مزاحیہ فقروں ، اور مولانا کی عالمانہ اور معلومات سے لبریز گفتگو سے یہ صحبتیں ہمیشہ ہی دلچسپ ہوا کرتی تھیں ۔ میں یقین کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ آزادی کی جد وجہد کے ان مضطرب

ایام میں جو گونا گوں مشکلات سے مملو تھے ہم نے زندگی کا رغبت اور شوق سے لطف اٹھایا اور یہ لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ھے جب ایک بلند اور شریف مقصد کے حصول کی کشمکش اور بے چینی قلب میں موج زن ہوتی ھے ۔

ابتدا ھی سے مولانا بین الاقوامی اتحاد کے قائل رھے ھیں ۔ ان کی پیدائش ، تعلیم ، تربیت اور مطالعے کے جملہ ماحول نے ان میں ایک وسیع نظر پیدا کردی تھی ۔ دین اسلام کے ایک عالم ہونے کی حیثیت سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے مذھبی خیالات میں تقلید پسند ہوں گے ۔ لیکن مذھبا وہ ایک نہایت وسیع المشرب انسان تھے ۔ اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ مذھب میں تکاسل یا تساھل کو پسند کرتے تھے بلکہ مشرب کی یہ وسعت ان کی فلسفیانہ اور تاریخی معلومات ، ان کی فہم و بصیرت اور وسعت قلبی کا نتیجہ تھی ۔ ان کے خلقی حسن و خیر کی بنا پر ان کے لئے یہ سوچنا ھی ممکن نہ تھا کہ انسانیت کی نجات کسی خاص دین ، یا خاص رسول ، یا خاص عقائد و شعائر و مناسک کے ماننے ھی سے حاصل ہوسکتی ھے ۔ مثلا وہ یہ خیال ھی نہیں کرسکتے تھے کہ جو لوگ قومی زندگی میں ان کے ساتھ شریک ھیں اور دوسرے دین کے پیرو ھیں ، ان کے لئے بہتر یا قابل قبول ہوتے اگر وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے ۔ یہ عقیدہ ان بعض مسلم قائدین کا تھا جنہوں نے خلافت اور قومی تحریک میں حصہ لیا تھا ۔ مولانا کا خیال تھا کہ دین کی اصل اعمال صالحہ ھیں ، یا پھر اگر گہرائیوں میں جائیں ، تو سرّیت ۔ جواھر لال نہرو نے سچ کہا جب انہوں نے پارلیمنٹ میں مولانا کی یاد کے احترام میں کہا کہ وہ انہیں ان علماء و فضلاء کی یاد دلاتے ھیں جو یورپی تاریخ میں نشأۃ جدیدہ کے زمانہ میں گزرے ھیں یا پھر اٹھارھویں صدی کے ان قاموس نگاروں کی جو انقلاب فرانس سے قبل پیدا ہوئے ۔ میں نہیں جانتا جب جواھرلال نے یہ کہا تھا اس وقت انہیں اس امر کا احساس

بھی تھا کہ مولانا اپنے خیالات میں تو ان ھی کی طرح آزاد تھے لیکن اجتماعی زندگی میں اپنے عمل کے لحاظ سے مسلمہ رسم و رواج کے ویسے ھی پابند بھی تھے۔ بہت ممکن ھے کہ مولانا آزاد بھی بڑے ھندو فلسفیوں اور پنڈتوں کی طرح یہ جان گئے ھوں کہ علماء کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ عوام الناس کے ذھن کو پراگندہ کریں جو رسم و رواج کے پابند ھوتے ھیں ، بشرطیکہ یہ رسم و رواج مضر نہ ھوں ۔ تاھم مولانا ان لوگوں کی بھی قدر کرتے تھے جو حیات نو اور فکر جدید کی ضروریات کی تکمیل کے لئے معاشری رسوم کی شاھراہ سے انحراف بھی کرلیا کرتے ھیں ۔ مولانا اپنے اسی امتیازی وصف کی وجہ سے ایک مذھبی یا معاشری مصلح کا مقام حاصل نہ کرسکے ! ان کی عقل نے انہیں کوئی ایسا فریضہ انجام دینے سے روک رکھا تھا جس میں کسی قدر ادعائیت کی ضرورت تھی ، اگر ھم عصبیت دینیہ کی ضرورت نہ بھی کہیں !

ان کی آواز حقیقت میں عقل کی آواز تھی جو مرادف ھے اعتدال و سلامتی کے ۔ ھندوستان کی آزادی کی انقلابی جنگ میں بھی ان کے یہی امتیازی اوصاف رھے ۔ گو عامۃ الناس کی انہوں نے رھبری کی ، لیکن خود ان کا شمار ان میں نہیں ھوسکتا ۔ گاندھی جی نے بہتوں کو جو پیدائش اور مقام کے لحاظ سے اغنیاء سمجھے جاتے تھے عوام کے دوش بدوش کام کرنے پر آمادہ کیا لیکن مولانا شروع سے آخر تک مولانا ھی رھے ۔ وہ بلند مقام دانا جو اپنی بلندیوں سے عوام پر شفقت کی ایک نگاہ ڈال رھا ھو !

لیکن وہ عدل وانصاف کے معاملہ میں بے حس نہ تھے ۔ یہ سب جانتے ھیں کہ حصول آزادی کے بعد اھل اقتدار کی مجلس مشاورت میں ، بہت سارے عوامی معاملات کو ، جنہیں نئے نظام نے پیدا کیا تھا ، ان کی تائید حاصل رھی ۔ ان کی رائے مستقل اور آزاد ھوا کرتی تھی ۔ جہاں کسی کو مخالفت کی ھمت نہیں ھوتی تھی وھاں بھی وہ رد وقدح

کیا کرتے تھے ۔ شاذ موقعوں میں وہ کامیاب بھی ہوئے ھیں ، ان کی موت پر عوام کا یہ محسوس کرنا فطری تھا کہ اب ملک کی سیاسی زندگی سے دانش و خرد کا وہ عنصر بھی غائب ہو گیا جو کسی چیز کو اپنی حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتا تھا!

مولانا در اصل ایک عالم لوذعی تھے ۔ قومی تحریک کے بہت سارے دوسرے قائدین کی طرح اگر انہیں اختیار دیا جاتا تو وہ سیاست کے میدان میں قدم ھی نہ رکھتے اور خاموشی کے ساتھ علوم ادبیہ کے اکتساب میں اپنی زندگی بسر کردیتے ۔ لیکن ایک محکوم ملک میں ایک حساس اور ذمہ دار شخص صاحب اختیار نہیں ہوتا ۔ عدل و انصاف اور حب وطن اس کو مورچہ سنبھالنے پر مجبور کرھی دیتے ھیں ۔ ہم نے اکثر ان قربانیوں کا ذکر سنا ھے جو آزادی کی خاطر پیش کی جاتی ھیں ، لیکن کوئی قربانی اس قربانی سے زیادہ عظیم نہیں قرار دی جاسکتی جس کی خاطر ایک شخص اپنی زندگی کے اصل کام کو چھوڑ دیتا ھے ، وہ کام جس کی وہ خاص صلاحیت رکھتا ھے ، اور آزادی کے حصول کی جد و جہد میں مشغول ہو جاتا ھے ۔ مولانا نے یہی عظیم الشان قربانی پیش کی ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ھے کہ ان کی اس مہتم بالشان قربانی کی وجہ سے علوم ادبیہ اور فضل و کمال کی دنیا محروم نہیں رہ گئی ۔ مولانا نے جو کتابیں چھوڑی ھیں وہ مخلد الذکر ھیں ۔ ان میں قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی ھے ۔ ان کی خود نوشت سوانح جس کی تکمیل انہوں نے حال ھی میں کی تھی بہت جلد شائع ہو جائے گی ۔ اگر وہ اپنی زندگی کو صرف علوم ادبیہ ھی کے لئے وقف کردیتے اور تحریک آزادی کے زلزلہ افگن حادثات کی طرف سے بے خبر ہوجاتے تو یہ ممکن تھا کہ ان کی تصانیف کی تعداد کی کثرت میں تو اضافہ ہوتا لیکن ان میں وہ حکمت و بالغ نظری پیدا نہ ہوسکتی جو اس زندگی کا عطیہ ہوتی ھے جو جد و کد میں بسر ہوتی ھے اور

جس پر ابتلاء اور درد و محن کے اثرات منقوش ہوتے ہیں ۔

یہ تھے مولانا ، ذی مرتبت فاضل الہیات ، بلند مقام ادیب ، اردو کے مشہور خطیب ، قومی آزادی کے مجاہد اعظم ! اپنے ملک سے پر جوش محبت رکھنے کے باوجود وہ بین الاقوامی اتحاد کے دل سے قائل تھے ۔ گو جنگ آزادی میں ان کا حصہ عظیم الشان رہا ہے تاہم ان کی یاد ہمارے قلوب میں اس وجہ سے رہے گی کہ وہ ایک حسین شخصیت کے مالک اور علم و حکمت کے معدن تھے !

تعجب کی کوئی بات نہیں کہ جب عوام نے موت سے دو روز پہلے ان کی صحت کی نازک حالت کی خبر سنی تو وہ جبلی طور پر سخت اضطراب میں مبتلا ہوگئے ۔ ان کی وفات کے بعد دہلی میں جو ماتم کیا گیا اور ملک پر غم و حزن کے جو شدید آثار نظر آئے ان سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ عوام الناس نے ، جو شاذ و نادر ہی انہیں دیکھ پاتے تھے ، محسوس کرلیا کہ وہ اپنے ایک دوست ، فلسفی و رہنما سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے ! ان کے مداحون نے سچ کہا ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان کی تاریخ اور اس کی تہذیب کے اقدار کا ایک ایسا دور گذر گیا جس کی تخلیق شاید پھر کبھی نہ ہو سکے ! مولانا اس دور کے ایک درخشاں گوہر تھے !

ایک نورانی شخصیت

از

سید محمود

احمد نگر کی جیل میں جہاں مولانا آزاد کو، انڈین نیشنل کانگرس کے صدر ہونے کی وجہ سے ان کی مجلس عاملہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ قید کر دیا گیا تھا اور یہ سنہ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" قرار داد منظور کرنے کی پاداش میں تھا میں نے مولانا کو اکثر عرب شاعر، ابوالعلاء معری کا ایک شعر زیر لب گنگناتے سنا جس کا مفہوم یہ تھا:

ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کا زندگی میں کوئی درمیانی مقام نہیں!

ہمارا قدم یا تو ذروۂ کمال پر ہوتا ہے یا پھر قبر ہی ہمارا مسکن و ماوی ہوتی ہے۔

ایک دوسرا شعر، جو کسی فارسی شاعر کا ہے، ان دنوں ان کو بہت مرغوب تھا:

کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوی ثمر پیشتر از باغ وجودم!

(صدرائے شیرازی)

ان دو اشعار سے مولانا کے ذہن کی امتیازی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنی آپ مثال تھے، اسی لئے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ عام معیار سے نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی میں جو کام بھی انہوں نے انجام دئے، خواہ وہ ایک عالم کی حیثیت سے ہوں، خواہ ایک ادیب، مفکر، قائد یا حریت، صداقت و عدالت کے مجاہد کی حیثیت سے، ان سب میں ان کی ایک خاص شان تھی اور خاص وقار!

علوم اسلامیہ کے ماہر اور اردو کے ایک نئے اسلوب کے موجد کی حیثیت سے مولانا نے اولا میری توجہ کو جذب کیا۔ یہ سنہ ۱۹۰۶ء کا

ذکر ھے - میں نے ان کے چند مضامین ان ھی کے رسالہ " لسان الصدق " اور امرت سر کے اخبار " وکیل " میں پڑھے تھے - اس وقت میری عمر صرف سترہ سال کی تھی - میرے قلب میں ان کا وقار کچھ اس قدر قائم ھوگیا تھا کہ میں ان سے براہ راست ملنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا - اس لئے ملاقات کا انتظام لکھنؤ میں ایک سن رسیدہ عالم کی وساطت سے کیا گیا جن سے میں اس زمانہ میں خوب واقف تھا اور جن کا اسم گرامی علامہ عبداللہ عمادی تھا - ملاقات سے قبل میں یہ خیال کررھا تھا کہ میں ایک صاحب ھیبت و وقار شخصیت سے ملنے جارھا ھوں - لیکن میں حیران سا رہ گیا جب میری ملاقات ایک نوجوان سے ھوئی جو تقریبا میرے ھی سن و سال کا تھا (اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی)، دبلا پتلا، سرخ رخسار، روشن آنکھوں والا، پاکیزہ لباس، مطمئن، ساکن الجوارح، دل آویز گفتگو کے آداب سے واقف! مجھے تو وہ ایک شاھزادہ نظر آتا تھا جو پرستان سے آیا ھو اور کسی معنی میں مولانا تو نہ تھا - زندگی کی اس منزل میں ان سے مل کر صرف میرا ھی یہ تأثر نہ تھا - زیادہ سن رسیدہ لوگ، جیسے مولانا حالی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سر عبدالقادر بھی جب اُن سے انجمن اسلامیہ، لاھور کے سالانہ اجلاس میں ملے تو میری ھی طرح حیران رہ گئے - وہ انجمن کو " اسلام میں عقلیت " کے عنوان سے مخاطب کرنے والے تھے - اجلاس کے سن رسیدہ منتظمین جب ان سے پہلی مرتبہ ملے تو خیال کیا کہ مولانا آزاد، مدیر " لسان الصدق " نے اپنے صاحبزادہ کو اپنا مقالہ سنانے کے لئے بھیجا ھے - ان کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی جب انہیں پتہ چلا کہ وہ خود ابوالکلام سے گفتگو کررھے ھیں!

ان سے میری دوسری ملاقات سنہ ۱۹۰۸ء میں علیگڈھ میں ھوئی جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے کالج کے کمرے میں تشریف لائے، کچھ دن بعد میں انگلستان چلا گیا اور جب سنہ ۱۹۱۲ء میں ھندوستان

لوٹا تو مولانا آزاد "الهلال" کے مدیر کی حیثیت سے کافی مشہور و مقبول ہو چکے تھے۔

مولانا آزاد علمائے دهلی کے خاندان سے هیں۔ جب ان کے والد مکۂ مکرمہ میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رهے تھے مولانا پیدا هوئے۔ والدین کی هندوستان میں واپسی کے بعد مولانا کی تعلیم کا کلکته کے مدارس میں انتظام کیا گیا جهاں انهوں نے اسلامیات کے درس کی تکمیل کی۔ عالم شباب هی میں انهیں مغربی ایشیا کے ممالك دیکھنے کا موقع ملا۔ مصر میں کچھ عرصه ان کا قیام رها اور وهاں وہ اس اصلاحی تحریك سے کافی متأثر هوئے جو سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبده کی رهنمائی میں جاری تھی۔ اول الذکر اس زبردست اتحاد اسلامی تحریك کے قائد تھے جس کا مقصد مغربی ایشیا کے ممالك کو شهنشاهیت پسندوں، خصوصا برطانیه کے تسلط سے نجات دلانا تھا۔ ان هی دو عظیم المرتبت علماء کا اثر تھا جس نے جوان سال ابوالکلام کو اپنے دیس میں اسی قسم کی تحریك کے شروع کرنے پر آمادہ کیا۔

اپنے آغاز کے پہلے هی دن سے الهلال هندوستان میں برطانوی اقتدار کی بقا کا سخت مخالف تھا اور اس زمانه کی فضا کے لحاظ سے کسی اخبار کے لئے یه روش اختیار کرنا آسان نه تھا اور خصوصا اس اخبار کے لئے جس کو فرقۂ اقلیت کے ایك رکن نے جاری کیا هو جو سنه ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سے حکومت کی سرپرستی اور اس کی نظر عنایت سے یکسر محروم هو چکا تھا۔ الهلال کے شائع هونے تك "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی اپنے نقطۂ کمال تك پہنچ چکی تھی، اور هندوستان کے مسلمانوں کی ذهنیت یه هو گئی تھی که وہ حکومت برطانیه کی رضاجوئی کا هر طریقه استعمال کر رهے تھے تاکه اس کے لطف و کرم کا مورد بن سکیں۔ اس قوم کو برطانوی اقتدار کے خلاف اکسانا بظاهر جوکھم کا سودا تھا۔ انهوں نے محسوس کیا که افسردگی اور

حزن ہی کی کیفیت میں، جو اس وقت ملک پر مستولی تھی، عظیم قوتیں مجاہدانہ اعمال کے لئے بیدار کی جاسکتی ہیں اور انہوں نے دعوت عمل کا صور اپنی پوری قوت سے پھونکا:

”ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جب کہ انسانوں کے لئے زندگی کی خواہش معصیت ہوجاتی ہے اور زندہ رہنے سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہوتا۔ جب کہ اونچی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کی آبادی بڑھ جاتی ہے اور آہنگر کی صنعت کی سب سے زیادہ مانگ ہوتی ہے، جب کہ درختوں کی ٹہنیوں میں رسیاں لٹکائی جاتی ہیں اور جب کہ لکڑی کے تختے بنائے جاتے ہیں تاکہ ان پر فرزندان آدم کھڑے کئے جائیں۔ یہ وقت آتا ہے اور انقلاب امم کے ایک قدرتی قانون کے تحت گزر جاتا ہے اور پھر بربادی وہلاکت کا ہر وہ بیج جو زمین میں ڈالا گیا تھا نئے موسم کے شروع ہوتے ہی زندگی اور حیات قائم ودائم کا پھل پیدا کرتا ہے“

یہ تھی للکار الہلال کی جب اس کا آغاز ہوا! اور مولانا نے لکھا:

”میرے اعتقاد میں پہلی چیز کاموں کی تلاش نہیں بلکہ کام کرنے والوں کی تلاش ہے۔ دنیا میں کاموں کی کبھی کمی نہیں رہی اصل کمی کام کرنے والوں کی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر ایک جنگ کا دور ہے، ہمارے اندر بھی اور ہم سے باہر بھی۔ دشمنوں کا ہر طرف ہجوم ہے اور کوئی گوشہ نہیں جو حملہ آوروں کے اسلحہ کی جھنکاروں سے خالی ہو۔ پس جو لوگ اپنے اندر ایک سپاہی کا جوش اور ایک جانباز کی ہمت رکھتے ہیں ان کے لئے میدان کار کی کوئی کمی نہیں۔ وہ مستعد ہو کر باہر نکلیں۔ پھر کونسا گوشہ اسلامی ہے جو آج اپنے جانبازوں کے ورود کا منتظر نہیں، کونسا میدان ہے جہاں سے «اجیبوا داعی اللہ» کی صدائیں نہیں آرہی ہیں ... پھر کہتا ہوں کہ آج جب کہ قومی زندگی کا کوئی شعبہ ہی نہیں جو محتاج احیاء نہ ہو

کاموں کی کوئی کمی نہیں، کمی صرف مجاہدین حق اور جاں نثاران ملت کی ھے،،

مولانا کی یہ آواز سارے ملک میں گونج اٹھی ۔ بلقان کی جنگ اور دور دور کے مسلمانوں پر اس کے جو المناک اثرات مرتب ھوے ان سے عمل کا میدان کھل گیا ۔ الہلال کے پڑھنے والوں میں غصہ اور اضطراب کی ایک ھذیانی کیفیت پیدا ھوگئی، اور وہ برطانوی شہنشاھیت کی عمارت کو ملک میں مسمار کردینے پر تل گئے اور میں خود اس جذباتی بحران میں مبتلا ھوگیا جو سارے ملک میں پیدا ھوگیا تھا ۔

جب میری دوسری ملاقات مولانا سے ھوئی تو اس وقت میں لکھنؤ میں تھا ۔ مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس نے علیگڈھ میں مسلمانوں کے لئے ایک جامعہ کے قیام کی غرض سے جو مجلس تشکیل دی تھی اس وقت اس کا اجلاس یہیں ھورھا تھا ۔ الہلال کا شہرہ ھوگیا تھا اور مولانا کو آزادی کی جنگ کا مجاھد اعظم سمجھا جارھا تھا ۔ ھمارا یہ جلسہ قیصر باغ کی بارہ دری میں ھو رھا تھا ۔ جوں ھی مولانا نے ایوان میں قدم رکھا ھر گوشہ سے آوازیں بلند ھوئیں کہ مولانا خطاب کریں ۔ جن لوگوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ حکومت کی شرائط کو قبول کرائیں گے وہ اس جلسہ میں مولانا کی تقریر پسند نہیں کرتے تھے ۔ لیکن اصرار برابر جاری رھا اور جب مولانا نے تقریر کی تو تحریک کے خلاف حاضرین کے جذبات اس قدر مشتعل ھوگئے کہ بالآخر تصفیہ کرنا پڑا کہ شرائط مسترد کردی جائیں ۔ سیاسیات میں علیگڈہ کا جو رجحان تھا اس تقریر نے اس کی نفی کردی ۔ مولانا کی یہ قطعی رائے تھی کہ ھندوستان کے مسلمان حکومت برطانیہ سے اپنی وفاداری کا اظہار قطعا ترک کردیں اور اس کے دیرینہ تسلط کے خلاف اپنی رائے جرأت کے ساتھ ظاھر کردیں ۔

ملک میں برطانیہ کے ارباب اقتدار کا الہلال کے وجود کو برداشت نہ کرنا فطری تھا ۔ الہلال کی عارضی موقوفی، اس کی بجائے البلاغ کی اشاعت اور پھر اس کا بھی انقطاع، یہ سب ایک مشہور قصہ ھے، اور

مولانا کی رانچی میں طویل نظر بندی سے بھی سب واقف ھیں ۔ یہ ایک سخت ابتلاء اور محکم عزائم کا زمانہ تھا۔ اسلئے جب وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں رانچی کی قید سے باھر نکل آئے تو سیاسیات میں شدت سے حصہ لینے لگے الہلال کے صفحات میں انہوں نے اپنی یہ رائے پوری قوت کے ساتھ پیش کر دی تھی کہ ھندوستان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا قطعی حل یہ ھے کہ وہ سیاسیات میں اپنے ھندو بھائیوں کے ساتھ مخلصانہ طور پر تعاون عمل کریں ۔ لیکن رانچی کے حادثہ کے بعد تو اس خیال نے ان کے قلب کا احاطہ کر لیا ۔

یہ وہ وقت تھا جب ھندوستان میں مہاتما گاندھی نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ مولانا پہلی دفعہ دھلی میں اس سال ان سے ملے ۔ یہ وہ موقع تھا جب ھندو اور مسلمان قائدین یکجا جمع ھوکر اس مسئلہ پر غور کر رھے تھے کہ کیا ان کے ایک متفقہ وفد کا ویسرائے سے ملنا بہتر ھوگا ۔ جس طریقہ سے کہ مولانا آزاد نے اس خیال کی مخالفت کی اور اس کی بجائے حکومت برطانیہ سے مطلق ترک موالات کی تجویز پیش کی وہ گاندھی جی کو اس قدر پسند آئی کہ ان دو عظیم قلوب میں اسی آن پائدار محبت کا رشتہ مضبوط ھو گیا ۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے مہاتما کی موت (سنہ ۱۹۴۸ء) تک یہ دونوں دوش بدوش نصرت و کامرانی کے ساتھ مصروف عمل رھے !

سنہ ۱۹۲۰ تا سنہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ برطانوی شہنشاھیت کے خلاف سخت جد وجہد اور معرکہ کا زمانہ تھا ۔ اس کا آغاز خلافت اور ترک موالات کی تحریک سے ھوا ۔ حصول آزادی کی اس راہ میں ان دو قائدین ، ان کے رفقاء و شرکائے کار کو بار بار نظر بند کر دیا گیا ۔ لیکن اس کا انجام یہ ھوا کہ ھندوستان سے برطانوی حکومت غائب ھو گئی ۔ بد قسمتی سے جو آزادی حاصل ھوئی وہ اس نوع کی نہ تھی جس کا خواب یہ دو مجاھدین دیکھ رھے تھے ۔ اس آزادی کے ساتھ ساتھ غم و حزن

بھی تھے اور ملک کی تقسیم بھی ۔ اس طویل ابتلاء کا بیان اس وقت میرا کام نہیں ۔ اس کو دوسرے لوگ پیش کریں گے ۔ یہاں پر میں اس عظیم رزمیہ کا ایک قصہ بیان کروں گا جس سے مولانا کی شخصیت پر روشنی پڑتی ھے ۔ یہ قصہ سی ۔ آر ۔ داس کے ساتھ ان کی گرفتاری کا ھے جس کا مقدمہ کلکتہ کی عدالت میں سنہ ۱۹۲۱ء میں چلایا گیا ۔ اس موقع پر انہوں نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بیان دیا جو ھندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک عظیم الشان باب ھے ۔

یہ بیان اردو میں ھے جس کو بعد میں قول فیصل کے عنوان سے شائع کر دیا گیا ۔ میں اس کے چند اقتباسات یہاں پیش کر رھا ھوں تاکہ یہ معلوم ھو جائے کہ مولانا کا خمیر کس مواد سے تیار ھوا تھا :۔

به بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ھنوز از بادۂ پارینہ ام پیمانہ بر دارد

الحمد للہ وحدہ !

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں ۔ یہ ایک ایسی جگہ ھے جہاں ھمارے لئے نہ تو کسی طرح کی امید ھے، نہ طلب ھے اور نہ شکایت ھے ۔ یہ ایک موڑ ھے جس سے گزرے بغیر ھم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے ۔ اس لئے تھوڑی دیر کے لئے اپنی مرضی کے خلاف دم لے لینا پڑتا ھے ۔ یہ نہ ھوتی تو ھم سیدھے جیل چلے جاتے ۔۔۔۔

تاریخ شاھد ھے کہ جب کسی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ھتیار اٹھائے ھیں تو عدالت گاھوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ھتیار کا کام دیا ھے ۔۔ تاریخ عالم کی سب سے بڑی نا انصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ھی میں ھوئی ھیں ۔ دنیا کے مقدس بانیان مذھب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ھے جو مجرموں کی

طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو... میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنۂ متوسط کی پر اسرار «انکویزیشن» وجود نہیں رکھتی؛ لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے، ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے....''

''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف ان ہی دو موقعوں پر بلکہ گزشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲٤۔الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں....''

''میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے، اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں...''

''میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوع انسان کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی

حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالا دستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دئے اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ معیار فضیلت نہیں. بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے سب کام اچھے ہوں!...''

''انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلاب فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مؤرخ گبن کے لفظوں میں «اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا''... یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے، وہ خود کتنی ہی قابل ملامت ہو، لیکن زندگی کی خواہش قابل ملامت نہیں ہے... ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اسلئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جد وجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانان ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پر پیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا....،،

"ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔ الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا...."

اس بیان کے آخری حصہ میں مجسٹریٹ سے کہا گیا ہے کہ "زیادہ سے زیادہ سزا جو اسکے اختیار میں ہے بلا تأمل دے دے" اور ختم ان الفاظ پر ہوتا ہے:

"مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مؤرخ کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا، والحمد للہ اولا وآخرا،،

ان الفاظ کی ایک معجزانہ شان تھی۔ مولانا ہی کی زندگی میں خدا کی عدالت کا دروازہ کھل گیا اور ان کے کانوں نے وقت کا وہی فصیلہ سنا جس کی خود انہوں نے پیشین گوئی کی تھی!

رانچی سے رہائی کے بعد مولانا کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی ابتدائی دور میں میں نے ان کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دفعہ فیصلہ کرلینے کے بعد میں نے خوشی سے ان کے

اور دوسروں کے ساتھ ساری ابتلائیں برداشت کیں یہاں تک کہ ہم نے اور سارے ملک نے آزادی کی نورانی دنیا میں قدم رکھا!

مولانا کی شخصیت کا بیان کرنا آسان نہیں۔ ان کے فضائل بے شمار ہیں۔ دنیا تو ان کے علم و فضل اور ان کثیر قربانیوں ہی سے واقف ہے جو ملک کے لئے انہوں نے پیش کیں۔ لیکن ان کے ذہن وقلب کی خصوصیات ممیزہ سے تو صرف وہی لوگ واقف ہوسکتے ہیں جو ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ میں یہاں صرف ان چند خصوصیات کا ذکر کروں گا جن کا میرے قلب پر گہرا اثر ہوا ہے۔

مولانا کے خاندان کے ساتھ ہمیشہ ہی بڑی عزت و احترام کا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور مولانا کو یہ مقام ورثہ میں ملا۔ بنگال کے ہزاروں مسلمانوں کو ان سے اس لئے محبت تھی کہ وہ ایک جلیل القدر مذہبی رہنما کے صاحبزادے تھے۔ جب ان کے والد محترم کا انتقال سنہ ۱۹۰۹ء میں ہوا تو ان کے بے شمار مریدوں نے مولانا آزاد کو ان کا خلیفہ و جانشین قرار دیا اور نذرانے پیش کئے۔ مولانا نے ان نذرانوں کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ نذرانے، جو زیادہ تر رقمی شکل میں پیش کئے گئے تھے، خاندان کے غرباء ہی میں تقسیم کردئے جائیں، اور اس بات پر وہ اپنی ساری زندگی قائم رہے۔ اپنی زندگی کی نہایت نازک گھڑیوں میں بھی انہوں نے اپنے خاص احباب تک کو اپنی عسرت یا افلاس کی خبر ہونے نہ دی۔ جو کچھ انہوں نے اپنی محنت سے کمایا اس میں ان کم نصیبوں کو بھی شریک کر لیا جو ان کے قریب اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنی وزارت کے زمانہ میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کل کے لئے کچھ اٹھا رکھنے کے قائل نہ تھے۔ وہ اس قدیم ضرب المثل پر عامل تھے کہ سیدھا ہاتھ جو دے اس کی خبر بائیں ہاتھ کو نہ ہو۔ جب کوئی شخص ان کی عطایا کا ذکر کرتا تو وہ بہت ناخوش ہوتے.

مولانا کی دوسری خصوصیت ممیزہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ جفا کی تھی ان کا ذکر وہ بے دردی کے انداز میں کبھی نہیں کیا کرتے تھے۔ ہر شخص اس تنقید سے واقف ھے جو بعض مسلمانوں نے ان پر کی تھی جب انہوں نے ان چند کمزوریوں کا برملا ذکر کیا جو مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھیں اور جن کو کچھ مسلمانوں نے ھتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ انہوں نے ان پھبتیوں کا کبھی جواب نہ دیا جو ان پر کسی جاتی تھیں۔ مسٹر جناح کا طرز عمل جو ان کے ساتھ رھا وہ ھر شخص جانتا ھے لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی انہوں نے اس کا انتقام لینے کی فکر نہ کی۔ مجھے وہ اجلاس خوب یاد ھے جو ھندوستان کی تقسیم کے بعد لکھنؤ میں ھوا تھا۔ اس جلسہ میں وہ مسلمان بھی موجود تھے جو تقسیم سے پہلے مولانا کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اب اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ان کی اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کتنی غلط تھی۔ جب مولانا اس عظیم اجتماع کو مخاطب کرنے لگے تو ھر شخص نے خیال کیا کہ وہ اس موقع پر مسٹر جناح کو ضرور ھدف ملامت بنائیں گے اور ان کی اس حکمت عملی کی دھجیاں اڑائیں گے جس کے نتیجہ کے طور پر یہ بلا نازل ھوئی، لیکن مولانا نے ملامت کسی کی نہیں کی۔ جو الفاظ ابتداء ھی میں ان کی زبان سے نکلے یہ تھے: ''میں یہاں کسی پر ملامت کرنے نہیں آیا ھوں۔ جو نہ ھونا تھا وہ ھوا، اب ھمیں مستقبل کی فکر کرنی چاھئے''۔ ان الفاظ کا سننے والوں پر بڑا اثر ھوا۔ انہوں نے محسوس کرلیا کہ مولانا کا اخلاقی معیار کس قدر رفیع و بلند ھے اور یہ اکابر قوم کے کس قدر شایان شان ھے۔ زندگی بھر انہوں نے مسٹر جناح کے خلاف کوئی درشت کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اگر اتفاقیہ طور پر ان کے سامنے پرانی چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے: ''قلب کے داغوں کو تازہ کرنے سے کیا فائدہ! ملامت کے قابل کوئی نہیں، صرف میں ھی مستحق ملامت

ہوں ۔ خود میں اس قدر نا اہل تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عمداً خود کشی کرنے سے روک نہ سکا!"

مولانا کی ایک اور چیز جس کا مجھ پر کافی اثر ہوا ان کی ہمہ گیر طبیعت ہے ۔ کسی خانگی محفل میں ہو یا کسی عام مقام پر جب بھی کسی موضوع پر گفتگو شروع ہوتی ، اس موضوع کا تعلق خواہ ادب سے ہوتا خواہ فلسفہ سے ، مذہب سے ہوتا یا سیاسیات سے ، یا سائنس سے ، یہ مشرق سے متعلق ہوں یا مغرب سے ، مولانا ان میں عالمانہ طریقہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے اور ان پر ایسا تبصرہ کرتے جو ایک ماہر فن ہی کرسکتا ہے ۔ ان کا حافظہ حیرت انگیز تھا ، بے شمار اشعار ان کو یاد تھے ، وہ نہایت آسانی کے ساتھ ان واقعات کا تذکرہ کیا کرتے جن کو لوگ بہت عرصہ پہلے ہی فراموش کرچکے ہوتے!

مولانا سخت محنت کے عادی تھے ۔ جو کام بھی ان کے تفویض کیا جاتا اس میں وہ نہایت انہماک کے ساتھ مشغول ہوجاتے ، اور بعض دفعہ حد سے زیادہ کام کرجاتے ۔ فرصت کے چند لمحوں میں وہ ان نئی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے جو آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں ، اگر ان کا تعلق ان مضامین سے ہوتا جن سے مولانا کو دلچسپی تھی ۔ اس بات کا عام طور پر لوگوں کو علم نہیں کہ مولانا نے اپنے ذاتی مطالعہ سے انگریزی زبان میں اتنی مہارت پیدا کرلی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ سائنس ، ادب ، فلسفہ اور سیاسیات کے جدید رجحانات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے ۔ ان کو اپنے کام اور اپنے مطالعہ میں اس قدر انہماک رہتا کہ وہ قلت خاطر ہی سے ملاقاتیوں کے لئے وقت نکالنے پر آمادہ ہوتے ۔ لوگ خیال کرتے کہ مولانا میں خوش خلقی کا فقدان ہے ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو لاطائل گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ لیکن جب وہ یہ خیال کرتے کہ گفتگو سے کسی کو کچھ فائدہ حاصل ہوگا یا ملک ہی کے مفاد کے لئے اس کو مناسب سمجھتے تو وہ

خواہش مند اصحاب سے گفتگو کرنے فوراً راضی ہوجاتے۔

مولانا کی ایک اور عظیم صفت ان کی وہ سرعت فہم تھی جس کی وجہ سے وہ حقائق اشیاء کا فوری ادراک کرلیتے تھے۔ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کا ان کو خوب ملکہ حاصل تھا۔ جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے وہ ان کی اس صفت سے کافی متأثر ہوے ہیں۔ عظیم اجتماعات میں جب کوئی مسئلہ غور و فکر کے لئے پیش کیا جاتا اور نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے اضطراب پیدا ہوتا تو مولانا کا ذہن حقائق پر مرکوز ہوکر ایسا حل دریافت کرلیتا جو جانبین کے لئے قابل قبول ہوتا۔ وہ اضطراب و اضطرار کے موقعوں پر بھی کبھی پریشان نہیں ہوتے بلکہ طمانیت خاطر اور بردباری کے ساتھ خود سوچتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی ان ہی خطوط پر سوچنے آمادہ کردیتے جو ان کے ذہن رسا میں واضح ہو جاتے اور اس طرح انہیں ایک ایسے حل تک پہنچنے میں مدد کرتے جو وقت کے اقتضاء کے عین مطابق ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا سن ابھی بیس اور تیس سال کے درمیان تھا کہ شیخ الہند دیوبندی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی محترم ہستیوں نے انہیں خلافت کانفرنس کے جلسوں کی صدارت کے لئے مدعو کیا اور اسی وجہ سے جب ان کی عمر صرف پینتیس برس کی تھی کہ پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس مہاتما گاندھی، محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے انہیں انڈین نیشنل کانگرس کا صدر منتخب کیا۔

ایک اور اعلی صفت جو انہیں دوسروں سے ممیز کرتی ہے وہ ثبات عزم ہے۔ وہ احتیاط اور اطمینان سے فیصلے کیا کرتے تھے اور جب کوئی فیصلہ کرلیتے تو پھر ایسے عزم و ثبات کے ساتھ اس پر قائم رہتے کہ کوئی شخص انہیں اپنے اس فیصلہ کو بدل دینے پر آمادہ نہ کرسکتا۔ اسی چیز کو مولانا محمد علی ان کی "ضد" سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ الہلال کی اشاعت کے زمانہ ہی سے ایک اعلی تصور نے ان کے ذہن کا

احاطہ کرلیا تھا اور ان کے ہر عمل کو اپنا تابع کرلیا تھا اور وہ ملک کی آزادی کا تصور تھا جس کا حصول ان کے نزدیك هندو مسلم اتحاد و اتفاق هی کے ذریعہ ممکن تھا ۔ وہ آزادی سے زیادہ اتحاد و اتفاق پر زور دیتے تھے ، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ آزادی تو ایك روز مل هی جائے گی ۔ وہ کہتے تھے کہ :

"آج اگر ایك فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دهلی کے قطب مینار پر کھڑا هو کر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ھے ، بشرطیکہ هندوستان هندو مسلم اتحاد سے دست بردار هوجائے تو میں سوراج سے دست بردار هوجاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ هوں گا ۔ کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر هوئی تو یہ هندوستان کا نقصان هوگا لیکن اگر همارا اتحاد جاتا رها تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ھے"

اتحاد اور آزادی کے مسئلہ کے بارے میں گاندھی جی کا بھی بالکل یہی خیال تھا ۔ مولانا نے محسوس کیا کہ خلافت اور ترك تعاون کی تحریکوں سے ان کے خوابوں کی تکمیل هورهی ھے لیکن بعد میں جو کچھ هوا اس سے ان کی بے چینی بہت بڑھ گئی ۔ ان کے اطراف ظلمت طاری هوگئی اور اس ظلمت نے ان کے حساس قلب کو سخت اذیت پہنچائی ، لیکن وہ عزم ثاقب کے ساتھ اپنی راہ پر قائم رھے ۔ نہ اهل اقتدار کی اذیتوں نے ، نہ خود اپنے بھائیوں کی روز افزوں هجو و ملامت نے اور نہ تلخ نوا جناح کی تلخ نوائیوں نے ان کے پائے ثبات میں تزلزل پیدا کیا ۔ وہ شر سے مصالحت کرنے کسی صورت تیار نہیں تھے !

مولانا کی پر جوش پکار پر کسی نے توجہ نہیں کی ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا دونوں فرقوں کے اختلافات بڑھتے هی گئے ، اور ان کا انجام سنہ ۱۹۴۷ء کی تباهی پر هوا ۔ میں جانتا هوں کہ مولانا پر اس کا

کیا اثر ہوا ۔ خنجر کا ہر وار جو ایک ہندوستانی دوسرے ہندوستانی پر کرتا تھا اس کی زد در اصل مولانا کی روح پر پڑتی تھی ! انہوں نے اس کرب کو سکوت و خاموشی کے ساتھ برداشت کیا اور ہندوستان کو جدید اساس پر از سرنو تعمیر کرنے میں مشغول ہوگئے ۔ جس حکمت و فراست کے ساتھ انہوں نے یہ کام انجام دیا اور جس شاندار طریقہ سے بر سر حکومت رفقائے کار کے ساتھ بحران کے زمانہ میں ملک کی راہ ہموار کرنے میں تعاون عمل کیا اس کا بھلایا جانا آسان نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کی صبح جب مولانا کا اچانک انتقال ہوگیا تو ہر قلب غم و حزن میں مبتلا نظر آتا تھا !

اب جب کہ وہ ہم سے رخصت ہوچکے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا ہر فرد معترف ہوگیا ہے ! اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں مقام عظمت پر فائز نہیں تھے یا ان کا احترام قلوب میں نہیں تھا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دومرتبہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کی صدارت کے لئے منتخب نہ ہوتے اور آزادئ ہند کی جدوجہد کے آخری زمانہ میں انہیں مرکزی مقام دیا نہ جاتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اول سے آخر تک وہ مقام عظمت پر فائز تھے ۔ تقدیر کا فیصلہ تھا کہ ان کا شمار ہندوستان کے ان عظیم سپوتوں میں ہو جن کا کام یاس کے وقت ہمارے قلب میں فرح و سرور کا پیدا کرنا ، ہماری ہدایت و رہبری کرنا ، ہمارے مسائل کو حل کرنا اور ہمارے فیصلوں میں استناد کی قوت پیدا کرنا تھا ۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی باطنی تجرید و تفرید اور ان کی دیر آشنائی و کم آمیزی بعض دفعہ غلط فہمی کا باعث ثابت ہوئی ہیں ، لیکن یہ سب تحفظ قوت کے محض ذرائع تھے تاکہ اس کا اظہار شدید ضرورت کے وقت شدت کے ساتھ ہوسکے ۔ مولانا کی موت سے ہم اپنے نفس کے ایک اہم جزء ہی سے محروم ہوچکے ہیں ! ہندوستان نہ صرف اپنے ایک عظیم المرتبت اور جلیل القدر سپوت سے

محروم ہوچکا ہے بلکہ اس کا ایک مخلص دوست اور دانا رہنما بھی اس سے جدا ہوگیا ۔ لیکن ہمیں اس نقصان کو برداشت کرنا ہے اور زمانہ کے عارضی مصائب سے گھبرائے بغیر اس کے نصب العین کے تحقق کی سعی کرنی ہے اور یہ ہندو مسلم اتحاد کا نصب العین ہے جس کی خاطر مہاتما گاندھی نے اپنی جان دی اور جس کے لئے مولانا آزاد نے دم آخر تک جد و جہد کی !

میں ان سے جس طرح واقف تھا

از

پی - سباروین

اس سال کی ابتداء میں مجھ سے خواهش کی گئی تھی کہ میں مولانا آزاد کے یوم ولادت کے تحفہ کے لئے کچھ لکھوں جو ان کی سترویں سالگرہ کے موقع پر پیش کیا جانے والا تھا - لیکن اب مجھے نہایت غم وحزن کے ساتھ ماضی کی داستان ایک ایسے تحفہ کے لئے لکھنی ھے جو کبھی ان کے حضور میں پیش نہیں کیا جاسکتا !

گو مولانا آزاد کی صحت کچھ برسوں سے کمزور ضرور تھی لیکن کسی کو یہ خیال تک نہ تھا کہ انجام اس قدر قریب ھے ، ھم سبھوں کو امید تھی کہ مولانا ھمارے ساتھ ابھی کافی عرصہ رھیں گے اور ان کے بیش قیمت مشوروں سے قوم استفادہ کرتی رھے گی - ان کی ناگہانی علالت اور پھر ۲۲ فبروری کو ان کی وفات کی خبر سے مجھے سخت صدمہ ھوا - اب بھی میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل ھے کہ وہ ھم سے رخصت ھوچکے ھیں - میرے حق میں وہ ایک عظیم المرتبت قائد و رھنما تھے جن پر مجھے کامل ایمان تھا اور وہ میرے نہایت عزیز اور با اعتماد دوست بھی تھے - وہ مجھ سے ھمیشہ محبت و شفقت ھی سے پیش آتے رھے اور میں نے ان کی ھدایت ومشورہ پر ھمیشہ بھروسہ کیا - مجھے ان کی جدائی کا بڑا غم ھے اور اب ان کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار میرے لئے بہت مشکل ھے !

مولانا ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے جن کا اثر آزادی کی تحریک پر تقریبا نصف صدی رھا - مشکل معاملات و مسائل کو سمجھنے کی جو خدا داد قابلیت ان میں پائی جاتی تھی اس میں ان کا عمیق مطالعہ ،

ان کا بے کراں علم اور وسیع تجربہ چار چاند لگاتا تھا ۔ ان ھی صفات نے انہیں ایک عظیم الشان قائد اور ایک دانشمند مشیر بنا رکھا تھا ۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں انہوں نے اپنے جریدہ الہلال میں جنگ کے طریقہ پر ایسی صاف گوئی سے کام لیا تھا کہ انہیں رانچی میں نظر بند کردیا گیا تاکہ وہ کوئی ایسی چیز لکھنے یا کہنے نہ پائیں جس سے لوگ یہ جان لیں کہ ھندوستان میں برطانوی راج کے کیا مظالم ھیں مولانا نے اپنے ھم وطنوں میں یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ان کا اولین مقصد آزادی کا حصول ھونا چاھئے، کیونکہ اس کے بغیر کسی قسم کی ترقی ، خواہ وہ سیاسی ھو یا معاشی یا معاشری ، ھندوستان کو نصیب نہیں ھو سکتی ۔ جب گاندھی جی نے ھندوستان کی سیاست کے دائرہ میں قدم رکھا تو مولانا جیسے جلیل القدر محب وطن کے لئے یہ محسوس کرنا فطری تھا کہ اب ھمیں ایک ایسا قائد ملا ھے جو آزادی کے ساحل کی طرف ھماری رھنمائی کرسکتا ھے اور ھمیں اس کا اتباع خلوص اور وفاداری کے ساتھ کرنا چاھئے ۔ گاندھی جی نے بھی ان کے فضائل عظیمہ کی قدر کی اور بہت جلد ان کا شمار ان "رجال خمسہ" میں ھونے لگا جنہوں نے گاندھی جی کی تحریک آزادی کے چلانے میں مدد کی اور جن پر انہیں کامل اعتماد تھا ۔ گاندھی جی کی قیادت پر ان کا ایقان آخر تک رھا اور وہ ان چند افراد میں سے تھے جن سے مہاتما تمام مشکل مسائل میں مشورہ کیا کرتے تھے ۔ جن موقعوں پر مولانا یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں مہاتما کی رائے سے اتفاق کرنا ممکن نہیں وہ صاف گوئی سے کام لے کر کہہ دیا کرتے تھے کہ انہیں اتفاق نہیں ، لیکن جو بھی فیصلہ کیا جاتا اس کی تعمیل ایک وفادار کانگرسی کی طرح کیا کرتے ۔ سیاسی رھنماؤں اور مدبروں میں حب وطن اور وفا شعاری اتنے ھی قیمتی اوصاف ھیں جتنے کہ خلوص و تدین ، اور ان ھی اوصاف نے مولانا کی شخصیت کو ایک عظمت عطا کی تھی ۔

اضطراب کے اس زمانہ میں جب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کونسل میں شرکت کے مسئلہ پر کانگرس میں تشتت پیدا ہوجائے گا مولانا ھی نے باعزت مصالحت کی راہ سجھائی اور ان ھی کی دانش مندی اور سیاسی فراست نے سواراج پارٹی کو کانگرس چھوڑے بغیر کونسل میں شریک ہونے کے قابل بنادیا - جب انہوں نے کانگرس کے دہلی والے اجلاس کی صدارت کی تو تغیر کے حامیوں اور مخالفوں کے باھمی اختلافات آسانی کے ساتھ رفع ہوگئے - صدر کی حیثیت سے ان کا کام تھا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس اور کیابنٹ مشن سے گفت و شنید کریں اور اس کام کو انہوں نے مجلس عاملہ اور کانگرس تنظیم کے رفقاء کے اطمینان کے مطابق انجام دیا - بحث و مباحثہ میں انہوں نے ملک کے مفاد کو ھمیشہ پیش نظر رکھا - ھر شخص جانتا ھے کہ کرپس کی سفارت کابینہ کی ذمہ داری کے مسئلہ پر ناکام ہوگئی کیونکہ وائسرائے لارڈ لنلتگو اس کو ماننے آمادہ نہ تھے حالانکہ سر اسٹیفورڈ نے مولانا کو اپنی گفتگو میں سمجھا دیا تھا کہ یہ ان کی تجاویز کا لازمی نتیجہ ھے - یورپ میں جنگ کے ختم ہوجانے پر مولانا نے اس گفتگو میں بھی حصہ لیا جو شملہ میں لارڈ ویول کے ساتھ عارضی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں ہوئی تھی - مولانا کے صبر و خلوص کے باوجود یہ گفتگو بھی بارآور نہ ہوسکی کیونکہ مسلم لیگ کے زعماء نے سخت اور غیر منصفانہ مطالبے کئے تھے - کیابنٹ مشن کی ناکامی کے بعد جب عارضی حکومت کے متعلق وائسرائے اور سیاسی قائدین میں گفتگو ہوئی تو اس کا انجام بھی مایوس کن رہا - صاف ظاہر ھے کہ لارڈ ویول پر کانگرس کے قائدین کے خلوص و حب وطن کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو شریک کئے بغیر ھی عارضی حکومت قائم کردی - مولانا بعد میں اس حکومت کے ایک رکن ہوگئے اور اپنی ناگہانی وفات تک متعدد کابینوں کے ایک رکن رکین رھے -

وہ ملک کی تقسیم سے بالکل خوش نہ تھے لیکن اپنے دوسرے رفقائے کار کی طرح اس کو محض اس لئے قبول کیا تھا کہ وقت کا تقاضا ھی یہ تھا - قوم کی عظیم الشان خدمت جو انہوں نے انجام دی وہ یہ تھی کہ اپنے ھم مذھبوں کو تحریک آزادی کی تائید پر آمادہ کیا اور فرقہ وارانہ اختلاف پیدا کرنے سے روکا - مسٹر جناح اور دوسرے مسلمانوں کے شدید اختلافات اور مسلم عوام میں اس سے پیدا ہونے والے جوش اور ان ملامتوں کے باوجود جن کا نشانہ انہیں بننا پڑا مولانا نے خالص قومیت پر آخری دم تک اپنا ایقان قائم و باقی رکھا اور فرقہ واریت کو ھر قسم کی ترقی کے لئے سخت مضر قرار دیا -

جب کانگرس نے سنہ ۱۹۳۵ء کی ایکٹ کی تحت تیقنات حاصل کرنے کے بعد حکومت سنبھالنے کا تصفیہ کیا تو مولانا سہ رکنی پارلیمانی بورڈ کے ایک رکن بن گئے اور کانگرس کی صوبائی وزارتوں کی بڑی اعانت کی - گو میرا صوبہ مدراس ان کے تفویض نہ تھا لیکن میں یہ جانتا ھوں کہ انہوں نے اختلافات کو دور کرنے اور نظم و نسق کی راہ ھموار کرنے میں سردار پٹیل کی کس قدر مدد کی جن کے ذمہ یہ صوبہ کیا گیا تھا -

مولانا ایک عظیم المرتبت عالم تھے اور انہیں ھماری تہذیب و ثقافت کی ترقی و تقدم سے بڑی دلچسپی تھی - ان کا نقطۂ نظر عالم انسانیت کے ایک فرد کی طرح وسیع و ھمہ گیر تھا ، کسی خاص مذھب و ملت سے مختص نہ تھا - وہ فطرۃ حلیم اور رقیق القلب تھے ، اور مشکل مسائل کو سچی ھمدردی، فہم و فراست و حکمت سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے - کردار کے لحاظ سے بھی وہ اس قدر بلند تھے کہ سارے ملک میں بلکہ تمام دنیا میں ان کے تدین اور راست بازی کے ان اعلی معیارات کا احترام کیا جاتا تھا جن پر وہ اپنی زندگی میں عمل پیرا تھے - ھماری تہذیب جن تعمیری اجزاء سے مرکب ھے ان کا انہوں نے اپنی

زندگی میں تحقق کرلیا تھا ، وہ ہماری اس مرکب تہذیب کی باطنی قوت پر کامل ایقان رکھتے تھے۔ ان کا احساس فرض بھی نہایت قوی تھا۔ گو ان کی صحت گر رہی تھی تاہم اپنی موت سے چند روز قبل انہوں نے ہماری بزم تہذیب کی مجلس عاملہ اور اس کی مجلس عام کے جلسوں کی صدارت کی اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ تجویز ان ہی کی تھی کہ ہمیں اپنی اس بزم کی سرگرمیوں میں وسعت پیدا کر کے بیرونی ممالک میں انہیں جاری کرنا چاہئے اور ساری دنیا میں ہندوستانی تہذیب اور فلسفے اور ان کی قدر و قیمت کے افہام و تفہیم کے لئے مراکز قائم کرنے چاہئیں۔

یہ سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ایک دانا مشیر تھے اور ان کا اولین مقصد سنجیدگی کے ساتھ اس امر پر غور کرنا تھا کہ حق و صواب کیا ہے ۔ جب انہیں یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ کوئی حکمت عملی یا کوئی فعل صائب اور مستقیم ہے تو پھر وہ اپنی رائے کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہیں کیا کرتے ۔ وہ ہر اہم معاملہ پر غور و فکر کرتے اور جب انہیں صداقت کی یافت ہو جاتی تو پھر ان کا فیصلہ اٹل ہوتا۔ضیق کے لمحوں میں اگر کوئی شخص ان سے مشورہ کرنے جاتا تو وہ کامل غور و خوض کے بعد اس کو اپنا مشورہ دیتے ، اب اگر اس شخص کو صحیح راستہ اختیار کرنا ہوتا تو وہ ان کی رائے کو نظر انداز نہ کرسکتا۔

مولانا کے وجود سے محروم ہوکر ہم ایک جلیل القدر حکیم ، ایک وسیع العلم عالم ، جہاد آزادی کے ایک عظیم الشان مجاھد اور ایک نکتہ رس و فریس سیاست داں سے محروم ہوگئے ہیں! ایک ایسے وقت جب ملک کو ان کے تجربہ اور عقل کی سخت ضرورت تھی وہ جاکر ایک مستقل خلا ہم میں چھوڑ گئے ہیں۔

ہماری ساری ہمدردیاں وزیر اعظم کے ساتھ ہیں جو اپنے ایک قدیم اور عزیز رفیق سے اچانک محروم ہوگئے! وزیر اعظم نے سچ کہا کہ ساری قوم ہی ان کی موت سے خود کو تنہا و بے کس محسوس کر رہی ہے! گو مولانا مادی طور پر ہم میں نہیں تاہم میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کا اسوۂ حسنہ اور وہ عظیم خدمت جو ملک کی ترقی کے لئے انہوں نے انجام دی، ہم میں بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کو اپنے ملک کی خدمت میں صرف کر دینے کے لئے ایک نیا جوش اور ایک نئی تخلیقی قوت پیدا کرتی رہے گی!

ایک عظیم المرتبت ہندوستانی

از

رفیع الدین احمد

اس صدی کی ابتداء سے اب تک جو سال گزرے ہیں جب میں ان پر ایک نظر باز پسیں ڈالتا ہوں تو مجھے اپنے ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم سنہ ۱۹۰۶ء کا سال نظر آتا ہے جب اہل برطانیہ نے اپنے نزدیک یہ طے کرلیا کہ انہیں ہندوستان میں اپنی حکومت کو دوام عطا کرنے کے لئے صرف ایک طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کا پیدا کرنا ہے۔ بنگال کی تقسیم سے جو اضطراب پیدا ہوا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کی روشن خیال قیادت کے تحت ہند ایک متحد ملک بن کر رہے گا اور یہاں برطانوی اقتدار کو کچل دینے کے قابل ہو جائے گا۔ اب یہ کوئی راز نہیں کہ اسی سال علیگڈہ کی تعلیم یافتہ ایک جماعت نے سر آغاخاں کی سرکردگی میں مسلم لیگ کو جنم دیا۔ تحریک تو برطانوی تھی لیکن بہت سارے مسلمانوں نے اس کو چلانے پر آمادگی ظاہر کی۔ فرقہ واری اختلاف کا بیج بودیا گیا اور اس کا پھل فرقہ واری حلقۂ انتخاب کی شکل میں رونما ہوا۔

جس شخص نے کاٹ پھانس کی اس چال کو بھانپ لیا اور ہمت کے ساتھ اپنی رائے پر اصرار کرتا رہا بدقسمتی سے وہ اب ہم میں موجود نہیں! رنج و حزن میں، تاریک اور مکدر ایام میں مولانا آزاد کی معیت ہمیں نصیب رہی یہاں تک کہ ہم نے ان کی رہنمائی میں اپنے مقصود و مطلوب کو پالیا جو ہندوستان کی آزادی تھی! آئندہ نسلوں کے لئے یہاں اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ سنہ ۱۹۱۲ء ہی سے جب انہوں نے الہلال شائع کیا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے

والی حکمت عملی کے سخت مخالف تھے اور اس کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رھے ۔ ان کی بے خطا فراست نے ان پر اس امر کو آشکار کر دیا تھا اور اس کو انہوں نے اپنے ھم ملک اور ھم مذھب ساتھیوں کو جتلا بھی دیا کہ بنی آدم ایک قوم ھیں اور ھمیں اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاھئے ۔ بارھا قرآن حکیم کی یہ آیت انہوں نے پیش کی تھی :

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً[۱] (المائدة ، رکوع ۱۱)	ھر ایک کو تم میں سے دیا ھم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاھتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا

لیکن مولانا کی اس نصیحت کا مسلمانوں کے بعض طبقوں پر کچھ اثر نہ ھوا ۔ جن لوگوں نے یہ بیہودہ خیال پیدا کیا کہ مسجدوں کے سامنے موسیقی کے آلات نہ بجائے جائیں انہیں انعامات اور خطابات سے سرفراز کیا گیا ۔ اور جنہوں نے اس نظریہ کی تبلیغ کی کہ ھندوستان میں دو قومیں آباد ھیں ان کی ستائش کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کانگرس اور قوم پرست مسلمانوں کے شدید اختلاف کے باوجود ملک میں جدا گانہ حلقۂ انتخاب قائم کئے گئے ۔ مسلم لیگ کے ارکان کی ایک کثیر تعداد مشترکہ حلقۂ انتخاب کے موافق تھی لیکن ان سے کبھی مشورہ نہیں کیا گیا ۔ اس دوران میں مولانا آزاد ایک بہادر جماعت کی قیادت کر رھے تھے جس کا ایقان وحدت انسانیہ پر کامل تھا ۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ان گرجدار الفاظ میں رھنمائی فرمائی :

” میں اپنے ھم مذھبوں کو یاد دلانا چاھتا ھوں کہ آج بھی میرا خیال وھی ھے جو سنہ ۱۹۱۲ء میں تھا جب میں نے انہیں اس بارے میں خطاب کیا تھا ۔ اس عرصہ میں میں نے ان بے شمار واقعات پر

---

(۱) اس آیت سے تو مقالہ نگار کے دعوے کی شاید تردید ھوتی ھے ۔ مترجم ۔

غور و فکر کی ھے جو رونما ھوئے - میری آنکھوں نے ان کا مشاھدہ کیا ھے اور میرے قلب نے ان پر تفکر کیا ھے - یہ واقعات یوں ھی گزرتے نہیں چلے گئے ، یہ مجھ پر گزرے ھیں اور ان میں میں نے شرکت کی ھے ، اور ھر واقعہ کا میں نے غور سے مطالعہ کیا ھے - میں اپنے اذعان کے خلاف نہیں جاسکتا ، میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دباسکتا - میں آج پھر اسی چیز کی تکرار کرتا ھوں جو اس پوری مدت میں پیش کرتا رھا کہ نو کرور مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل وھی ھے جس کی طرف میں نے انہیں سنہ ۱۹۱۲ء میں دعوت دی تھی"-

اس سے زیادہ صحیح قیادت کسی اور قائد قوم نے نہیں کی - لیکن محمد علی جناح اور ان کی مسلم لیگ کے ساتھیوں نے یہ کہہ کر ھلچل جاری رکھی کہ ھندوستان میں دو قومیں بستی ھیں - اس کذب کی قابل نفرت حد تک تکرار کر کے انہوں نے بعض لوگوں کو یہ یقین دلادیا کہ اس میں کچھ صداقت پائی جاتی ھے - اس تحریر کا مصنف سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک بنگال پریسیڈنسی مسلم لیگ کا اعزازی معتمد رھا ھے - وہ مسلم لیگ سے اپنے تعلقات منقطع کرنے پر اس لئے مجبور ھوا کہ مسلم لیگ کا طریقۂ فکر غیر معقول تھا - قوم پرست مسلمانوں نے (اسی نام سے وہ اس زمانہ میں یاد کئے جاتے تھے) کانگرس کے جھنڈے کے تلے ملک کی آزادی کی جنگ جاری رکھی - میکڈونالڈ قوم واری فیصلہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مشترکہ انتخابات کی حامی تھی - مجھے یاد ھے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ میں ھم نے ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور مسٹر جناح سے خواھش کی تھی کہ وہ اس کی صدارت کریں - اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ مشترکہ انتخابات کی تائید میں مسلمانوں کی رائے حاصل کی جائے - میرا خیال ھے کہ جو لوگ اس کانفرنس میں جمع ھو کر غور و خوض کر رھے تھے ان میں اسی (۸۰) فی صد مشترکہ انتخابات کے حامی تھے - مسٹر جناح ھی نے

بعد میں اپنی "دوقوموں" والا ھوّا نکالا اور پہلی دفعہ ھم نے سنا کہ مسلمانوں کو اپنے لئے ایک علیحدہ وطن ملنا چاھئے۔

شیرازہ یہیں سے بکھرتا ھے۔ تمام قوم پرست مسلمان اکٹھے ھوکر لیگ سے علیحدہ ھوگئے اور مولانا آزاد کی قیادت میں انہوں نے کانگرس سے اپنا تعلق استوار کرلیا ۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد بھی مختلف قومی تحریکوں میں (مثلاً سنہ ۴۰ء کی تحریک میں ، اور "ھندوستان چھوڑدو" والی تحریک میں) مسلمانوں کا حصہ کافی نمایاں رہا ھے۔ ھزاروں مسلمانوں نے اپنے ھندو بھائیوں کے ساتھ ملک کے لئے قید اور اس کے مصائب کا خیر مقدم کیا۔ مولانا آزاد کو ان کے خیالات و تیقنات کی بناء پر بار بار قید کیا گیا ۔ لیکن برطانوی اھل اقتدار نے کبھی یہ نہیں مانا کہ مسلمانوں کی کثرت رائے متحد ھندوستان اور مشترکہ انتخابات کے نظام کی حامی ھے ۔ اس خوف سے کہ کہیں قوم پرست مسلمان وھی رائے پیش نہ کردیں جو کانگرس نے پیش کی تھی اگر انہیں ان کانفرسوں میں دعوت دی جائے جو حکومت برطانیہ طلب کررھی تھی ، انہیں آگے آنے کا موقع ھی نہیں دیا گیا حکومت کے لئے تو مسلمانوں کی رائے کی صحیح نمائندہ صرف لیگ ھی تھی۔ قوم پرست مسلمانوں کو ایک حقیر اقلیت قرار دیا گیا اور ان کے قائد ، مولانا آزاد کو محض ایک پیکر خیالی !

دنیا کی تاریخ میں ھمیں مشکل ھی سے ایک ایسا قائد ملتا ھے جس کی نظر اپنے زمانہ سے اتنی آگے جاتی ھے اور حضرت مسیح کی طرح کہہ سکتا ھے کہ "اے خدا انہیں معاف فرما وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کررھے ھیں" سنہ ۱۹۴۷ء ھی میں مولانا نے اس طرح محسوس کیا ھوگا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس سے جو گفت و شنید ھوئی اور سنہ ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول سے شملہ کانفرنس میں جو بحث ھوئی ان میں مولانا کانگرس کے نمائندہ تھے لیکن جب ھندوستان

کے اتحاد کے تحفظ کا سوال پیدا ہوا تو مولانا کی بات نہیں مانی گئی ۔ مہاتما گاندھی ، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے قائدین نے بھی ہند کے اتحاد کے بقا کے لئے پوری کوشش کی ۔ ملک کی تقسیم برطانوی قوم کے مقصد کے عین مطابق تھی ۔ اس لئے محمد علی جناح کو رستم وقت تسلیم کرلیا گیا اور ملک کی تقسیم ہوکر رہی ۔ ان حالات نے مولانا کے قلب کو جو اذیت اور صدمہ پہنچایا اس کا احساس تو ان ہی کو ہوسکتا ہے جو مولانا سے واقف تھے ۔ بہت سارے مسلمان جو کانگرس کے ساتھ تھے پاکستان منتقل ہو گئے ، لیکن مولانا کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں ہوئی اور وہ نہایت استقامت کے ساتھ ان چار کرور مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے جو ہندوستان میں رہ گئے تھے ۔

یہ سطریں لکھی جارہی تھیں کہ ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کو مولانا کی ناگہانی موت کی خبر پہنچی ۔ اس خبر نے ساری قوم کی کمر توڑ دی ! جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ، سارے ملک میں جو جلسے کئے گئے ، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے قلب میں ان کا کتنا اعزاز و اکرام تھا ۔ بے شبہ ہم ایک عظیم المرتبت قائد کے وجود سے محروم ہوگئے ، ایک جلیل القدر ہندوستانی ہم سے رخصت ہوچکا ، لیکن جس نوع کی قیادت ان سے ہوسکی اس پر کوئی تفوق پا نہیں سکتا ! ملک پر جب فرقہ پرستی کے جذبات کا تسلط تھا اور بہتوں کے قلب میں اضطرار و اضطراب برپا تھا ، مولانا اپنے اصول پر ثبات و استقامت کے ساتھ قائم رہے ۔ دستور ہند ، اپنی موجودہ حالت میں بڑی حد تک ان ہی کا رہین احسان ہے ۔ قوم کا ہر طبقہ ، خواہ وہ اس کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے ہو ، مشکل احوال میں ان ہی کی رائے کا احترام کرتا تھا ۔

مولانا کی زندگی اور ان کی خدمات کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ابھی قبل از وقت ہوگا ۔ ہم میں سے وہ لوگ جن کو زندگی میں

ان کی معیت کا شرف حاصل رہا ھے اچھی طرح جانتے ھیں کہ آج ھندوستان میں جو اتحاد و اتفاق نظر آرھا ھے اور مذھب وثقافت کی جو ھم آھنگ ترکیب مشاھدہ میں آرھی ھے اور حکیمانہ اصول پر ھماری زندگی کا جو ارتقا ھورھا ھے یہ سب مولانا کی کوششوں کے نتائج ھیں جو ھندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے حاصل کئے۔

آنے والی نسلیں جب مولانا کی مقدس زندگی کا مطالعہ کریں گی تو وہ اس ذات سے ضرور اکتساب فیض کرسکیں گی جو ھندوستان کے محاسن کا مجسمہ اور آزاد ھندوستان کی معمار اول رھی ھے!

ایران سے خراج تحسین

از

سعید نفیسی

وہ لوگ بھی جنہیں ایران کی تاریخ اور ادب کا محض اتفاقی علم ھی حاصل ھے ھندوستان کا جذب اپنے قلوب میں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ وہ ملک ھے جس کے باشندے تہذیب کی ابتدا ھی سے ایرانی قوم کی روحانی اور مادی زندگی کے ساتھ وابستہ رھے ھیں۔ دنیا بھر میں شاید ھندوستان ھی وہ ملک ھے جس سے تمام ایرانی مانوس ھیں اور اس کی وجہ یہ ھے کہ ھندوستانی اور ایرانی دونوں ایشیا کی اسی ایک آریائی قوم کی اولاد ھیں۔ تاریخ عالم کی ابتداء ھی میں جب ھندوستان اور ایران کے باشندوں نے پامیر کا صحرا قطع کیا اور اطراف کی زمینوں میں آباد ھو گئے تو انہوں نے اپنا باھمی تعلق قائم رکھا۔ شاید قرب و اقربیت کی کوئی مثال دوسرے دو ملکوں میں نہیں مل سکتی جیسی کہ ایران وھندوستان کے باھمی تعلقات میں ملتی ھے۔

مجھے خوب یاد ھے کہ میں اپنی عمر کے پندرھویں سال پہلی مرتبہ ھندوستان آیا تھا تاکہ یہاں تاریخ ایران کا کچھ مواد جمع کرسکوں جس کے لکھنے کا میں خیال کررھا تھا۔ اس دن سے میں نے ھندوستان پر جو کتاب مل سکی اس کا غور سے مطالعہ کیا ھے۔ ھندوستان سے متعلق میرا علم جتنا وسیع ھوتا گیا اتنا ھی قریبی تعلق اس سے میرا ھوتا گیا۔ عنفوان شباب میں مجھے مہاتما گاندھی اور ان کے شہرۂ آفاق رفقائے کار کا نام سن کر ایک سرور سا ھوتا تھا جنہوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے اتنی جد وجہد کی تھی۔ ھندوستان پر جو کتابیں اور مقالے میں نے پڑھے ان سے دو شخصیتوں کا بڑا اثر میرے قلب پر ھوا، ان میں سے ایک تو جواھر لال نہرو کی شخصیت تھی اور دوسری مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ میں نے ان دو عظیم المرتبت افراد کی زندگی

کا گہرا مطالعہ کیا اور بڑے ذوق کے ساتھ ان کے اشغال ادبیہ کے متعلق معلومات حاصل کئے۔ رفتہ رفتہ میں ان کے جلیل القدر کارناموں اور عظیم الشان قربانیوں سے واقف ہوگیا جو انہوں نے مہاتما گاندھی کے رفقاء و شرکاء کار کی حیثیت سے اپنے ملک و قوم کے لئے پیش کی ہیں۔

ڈیڑھ سو سال اغیار کے تسلط کی ابتلاء میں گزار کر ہندوستان نے سنہ ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کی۔ جوں ہی ہندوستان آزاد ہوا اس میں اور ایران میں سیاسی تعلقات پھر قائم ہوگئے۔ جب ایران میں ہند کے پہلے سفیر، سید علی ظہیر طہران پہنچے تو شاید سب سے پہلے میں نے ہی ان سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ اس وقت میرے قلب میں ہندوستان ایک اور مرتبہ جانے کی بڑی خواہش تھی۔ وہی جذبہ میرے باطن میں کار فرما تھا جو زمانۂ ماضی میں عرفی، ظہوری، نذیری، قدسی، کلیم اور صائب اور بے شمار دوسرے علماء و فضلاء کو ایران سے ہندوستان پہنچا چکا ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہری دور تھا۔ اگر میں ایران کے ان افاضل کے صرف ناموں ہی کا شمار کروں جو ہندوستان آئے ہیں اور یہاں اپنے شہ کار پیش کئے ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائیگی۔ غزنوی اور غوری خاندانوں کے بادشاہوں، سلاطین دہلی، صوبائی حکمرانوں، خلجی، تغلق، لودھی خانوادوں کے فرماں روا، بنگال کے حکمران، جے پور، مالوہ، گجرات، کشمیر، خاندیس، گلبرگہ، احمد شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، عادل شاہی اور بہمنیوں کے دربار ان فضلاء کی پناہ گاہیں رہی ہیں۔ بابر، ہمایون، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان، اور اورنگ زیب کی حکومت کے زمانہ میں، بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے تک، ایران اور ہندوستان کے درمیان کوئی مانع موجود نہ تھا۔ ایران کا کوئی شخص بھی آسانی کے ساتھ اس عظیم ملک میں آسکتا تھا۔ جو ایران سے اس قدر قریبی طور پر وابستہ تھا۔

یقیناً یہی وہ وجہ ہے کہ تاریخ نے اپنی تکرار کی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی بازیافت ایران کے لئے بھی ایک نہایت خوشگوار واقعہ ہے۔ میں اپنے ان دوستوں پر رشک کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے ہندوستان آئے ہیں۔ کوئی دوسرا ملک ایسا نہیں جس کو دیکھنے کی مجھے اس قدر آرزو رہی ہو۔ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء میں طہران کے ہندوستانی سفیر نے مجھے اس امن کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی جو اس سال نئی دہلی میں ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس کے اختتام پر مولانا آزاد نے مجھ سے اپنے ملک کی جامعوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کے دیکھنے کی خواہش کی۔

میں نے اس دفعہ ہندوستان میں ساڑھے تین مہینے قیام کیا (۱۵ نومبر سنہ ۱۹۴۹ تا ۲۸ فروری سنہ ۱۹۵۰ء)۔ علیگڈھ، دہلی، لکھنؤ الہ آباد، بنارس، پٹنہ، ناگپور، حیدر آباد، مدراس، بمبئی اور ٹراونڈرم کی جامعات نے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ کانفرنس کے دوران میں میں نے بمبئی، کلکتہ، شانتی نکیتن، سیوا گرام اور دہلی میں متعدد جلسوں میں شرکت کی۔ دو ضخیم روزنامچوں میں میں نے اپنے قیام کی ہزاروں خوشگوار یادداشتیں قلم بند کی ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک بھی ان کی طباعت و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں کرسکا۔ اس زمانہ میں میں دوبار دہلی گیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند اور پنڈت جواہر لال نہرو سے، جو ہند جدید کی سب سے بڑی شخصیت ہیں، ملنے کے بعد میں نے جس تیسرے شخص سے ملنے کی خواہش کی وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اپنے ملک کی آزادی کے حصول میں اور ایشیا کی گزری ہوئی عظمت کی تجدید میں جو مصائب انہوں نے برداشت کیں اور عنفوان شباب ہی سے جو قربانیاں پیش کیں ان سے میں بخوبی واقف تھا۔ قید خانوں کی جاترائیں جو انہوں نے کی تھیں انہیں بھی میں جانتا تھا۔ ان کی دو کتابیں،

تذکرہ اور غبار خاطر جو اردو زبان کی شہ کار ہیں، میری نظر سے گزر چکی تھیں، میں ان دو کتابوں کے امتداد نظر سے کافی متاثر تھا جو مولانا کی وسعت علمی اور خصوصا اسلام اور فارسی شاعری کے متعلق ان کے عمیق علم کا انکشاف کرتی ہیں۔ قرآن مجید کی جو تفسیر انہوں نے لکھی ہے اس سے میں بھی واقف تھا۔ ذو القرنین پر ان کے مقالات کا جب فارسی میں ترجمہ ہوا اور طہران میں دو مرتبہ ان کی اشاعت ہوئی تو میں نے ایک مختصر سی تمہید بھی لکھی تھی۔

جس چیز نے مجھے بہت زیادہ خوش کیا اور مولانا آزاد کی طرف گویا جذب کیا وہ ان کا ذوق شعری تھا۔ اس کی شہادت ان کی تمام کتابوں میں ملتی ہے۔ ہر صفحہ پر فارسی اشعار ملتے ہیں جو موزوں، مناسب، دلفریب و دلآویز ہوتے ہیں۔ فارسی اشعار کے اس غیر معمولی حافظہ پر مجھے سخت تعجب ہوا۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو فارسی ادب سے کتنا شغف تھا اور انہوں نے اس کا کتنا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی ہستی کا ایک جزء بن گئے تھے!

جوں ہی میں دہلی پہنچا مجھے ان سے ملاقات کی خوش خبری سنائی گئی۔ ۱٤ ڈسمبر سنہ ۱۹٤۹ء بارہ بجے میں جمہوریہ ہند کی وزارت تعلیمات کے دفتر پر پہنچا اس شخص سے ملنے کے لئے جس کی ملاقات کا شوق میرے قلب میں سالہا سال سے موجزن تھا! وہاں میرا تعارف پروفیسر ہمایوں کبیر سے کرایا گیا جو اس وقت سائنسی تحقیقات اور امور ثقافت کے وزیر ہیں اور اس وقت وزارت تعلیمات کے ایک وزیر تھے۔ چہرہ مصائب کا ڈھالا ہوا، گال مسنم، خط و خال نفیس۔ یہ تھا صورت کا نقشہ جو مولانا آزاد کی کسی تصویر میں میں نے دیکھا تھا۔ میرا تصور تھا کہ ان جیسا صاحب ایثار، صاحب علم و فضل شخص ہمیشہ اپنے کام میں منہمک ہوگا اور اپنے طور طریق میں

سادہ اور مؤدب ہوگا ۔ پہلی ملاقات سے پتہ چلا کہ میرا یہ خیال غلط نہ تھا ۔

مولانا آزاد خاکی شیروانی میں ملبوس تھے اور سیاہ چمڑے کی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے ۔ میں نے ان کی نکیلی موچھیں دیکھیں اور مختصر داڑھی بھی جو تھڈی کے پاس سفید ہو گئی تھی ۔ ان کا رنگ گندمی تھا اور ان کے گال کی ہڈیاں اونچی ۔ ان کا اونچا اور چھریرا جسم جو سالہا سال کے مصائب کے بعد بھی خم نہیں ہوا تھا ان کے مردانہ اوصاف کا آئینہ دار تھا ۔ وہ فارسی زبان روانی اور فصاحت کے ساتھ بول سکتے تھے ۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فارسی سے بالکل بے تکلف تھے ، اور « شدن » کی بجائے « گشتن » کا استعمال کر رہے تھے اور اس سے میں متأثر بھی ہوا ۔

میں مولانا آزاد سے وزارت تعلیمات کے دفتر میں ایک گھنٹہ تک گفتگو کرتا رہا ۔ اس گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے فلاسفۂ اسلام کی تصانیف کا اور خصوصا فارسی اور عربی شعراء کا گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ انہیں ان فلاسفہ و شعراء کی کتابوں کی تعداد تک بھی یاد تھی ۔ وہ ایران کی تاریخ اور جغرافیہ سے بھی پوری طرح واقف تھے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ قید خانہ میں زیادہ تر فارسی کتابیں پڑھی تھیں ۔ وہ مجھ سے حکمت اشراق ، شہاب الدین سہروردی ، کتاب اصول کافی ، حدیقۂ سنائی اور عطار کی مثنوی پر گفتگو کرتے رہے ۔ اثنائے گفتگو میں میں نے « نحوی اور ملاح » کے قصہ کا ذکر کیا جو مولانائے روم کی مثنوی میں آیا ھے ۔ قصہ یہ ھے کہ ایک نحوی نے ملاح سے پوچھا کہ کیا تو نے نحو پڑی ھے ؟ ملاح نے نفی میں جواب دیا ۔ نحوی نے کہا کہ تیری زندگی کا نصف حصہ ضائع گیا ۔ کچھ ھی دیر بعد طوفان اٹھا اور کشتی ڈوبنے لگی ۔ ملاح نے نحوی سے دریافت کیا کہ کیا تو نے تیرنا بھی سیکھا ھے ؟ اس نے کہا : نہیں !

ملاح نے کہا کہ تیری ساری زندگی ضائع گئی! میں نے جب یہ قصہ سنایا تو مولانا ہنسے اور اس پورے قصے کے اشعار شروع سے آخر تک پڑھ کر مجھے سنادئے!

مولانا نے فرمایا کہ وہ "ثقافتی تعلقات" کے دفتر میں ایک فارسی کتب خانہ مہیا کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے خواہش کی کہ میں ادب، تاریخ، فلسفہ اور تصوف پر فارسی کتابوں کی ایک فہرست تیار کروں۔ یہ بھی تاکید کی کہ اس فہرست میں میں اہل تشیع کی اہم دینی کتابوں کے نام بھی شامل کروں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ان کتابوں کو فراہم کر کے کتب خانہ میں رکھیں گے۔

اثنائے گفتگو میں انہوں نے اپنے معتمد خصوصی مسٹر مسعود کو بلایا اور فرمایا کہ وہ میرے لئے ہندوستان کی بارہ جامعات کے دیکھنے کا انتظام کریں۔ میں نے اس طرح ایک گھنٹہ اس جلیل القدر انسان کی صحبت میں گزارا۔ مجھے یاد آیا کہ ان کا شمار ہندوستان کی آزادی کے عظیم مجاہدین میں ہوتا ہے۔ وہ علم و فضل، تواضع و انکسار کی بھی ایک نادر مثال تھے۔ ان سے میں نے بہت ساری چیزوں کے متعلق گفتگو کی لیکن ہماری گفتگو کا مرکزی نکتہ ہندوستان اور ایران کے باہمی ثقافتی تعلقات تھے۔ آخر میں انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ علیگڈہ سے واپس ہو کر میں ان سے پھر ملوں۔

جب میں ان سے مل کر باہر نکل آیا تو میں نے اپنی یاد داشت میں یہ الفاظ لکھے۔ یاد داشت میرے پیش نظر ہے اور میں اس کا اقتباس پیش کررہا ہوں: "میرے لئے یہ ملاقات نہایت خوش گوار ثابت ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا ایک نہایت فاضل انسان ہیں۔ میں نہیں خیال کرتا تھا کہ وہ اس قدر ذکی و فہیم ہوں گے۔ وہ بلاشبہ ایران کے اکابر علماء کے ہم پلہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں بہت ہی کم عالم ہوں گے جنہوں نے فارسی اور عربی ادب کا اتنا عمیق

مطالعہ کیا ہو ۔ وہ ملک واقعی کتنا خوش نصیب ہے جس کا وزیر تعلیم اس قدر دانا اور قابل ہو"۔

اس وعدہ کے مطابق جو چہارشنبہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو کیا گیا تھا مولانا آزاد نے ایک بجے دن کے اپنی کار میرے لئے بھیجی اور میں ان کے مکان پر پہنچا ۔ مولانا کے معتمد خصوصی اجمل خان نے میرا استقبال کیا اور مجھے مولانا کی خدمت میں پہنچایا ۔ ہم دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا ۔ کھانا نہایت لذیذ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کو ایرانی کھانے بہت پسند ہیں ۔ مولانا نے سوائے شوربے کے کوئی اور چیز نہیں چکھی ۔ میں نے کھاتے ہوئے اور کھانے کے بعد ان سے بہت سی باتیں کیں ۔ انہوں نے ایران کے متعلق مجھ سے بہت سی چیزیں دریافت کیں ۔ ایران سے ان کی دلچسپی صاف ظاہر ہو رہی تھی ۔ ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات کے قیام کے بارے میں جو تجویزیں میں نے پیش کیں انہوں نے ان سب کو قبول فرمایا اور ان کو روبہ عمل لانے کے احکام صادر فرمائے ۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی خواہش کی کہ میں ان کا تعارف ایران کے بعض علماء سے کراؤں تاکہ انہیں ہندوستان کی ثقافتی اور علمی مجالس کا رکن بنایا جاسکے ۔ ایک گھنٹے کے بعد میں ان ہی کی سواری میں اپنی قیام گاہ کو لوٹ آیا ۔

یورپ کے ایک سفر سے واپس آتے ہوئے مولانا نے طہران میں چند روز قیام کیا ۔ وہ حکومت ایران کے مہمان رہے ۔ ان دنوں میرا تعلق مولانا سے زیادہ قریبی رہا ۔ ہر روز کچھ نہ کچھ وقت کے لئے مجھے ان کی معیت نصیب ہوتی رہی ، اور جوں جوں یہ ربط بڑھتا گیا مولانا کا احترام میرے قلب میں زیادہ ہوتا گیا ۔ ہر ملاقات میں میں نے ان سے کافی استفادہ کیا اور ان کے علم کے دریا سے اپنی پیاس بجھاتا رہا ۔

بعد میں مجھے ایرانیوں سے معلوم ہوا کہ ان سے بھی مولانا نے میری خیریت دریافت کی تھی - یہی شفقت تو دوستی کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے - سنہ ۱۹۵۷ء میں جامعہ علیگڈھ کی دعوت پر میں پھر ہندوستان آیا تھا - اس دفعہ دھلی میں میرا قیام ایک ہفتہ رہا - مولانا اس زمانہ میں کچھ علیل تھے اور اپنے کمرہ سے باھر نہیں نکل رہے تھے ، اور نہ ھی کسی سے مل رہے تھے - میں ان کے بستر علالت کے قریب جا بیٹھا تھا اور گزشتہ ملاقاتوں کو یاد کررھا تھا - ان کا احترام میرے قلب میں اور زیادہ تقویت پا رھا تھا - ہم نے ایران کے متعلق پھر گفتگو کی اور انہوں نے میرے ملک میں اسی دلچسپی کا اظہار کیا جو اس سے پہلے کرچکے تھے -

کچھ دن بعد علیگڈھ میں فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کے مہینے میں میں نے اسٹیٹمن میں ایک نہایت درد ناک خبر پڑھی - یہ مولانا کی ناگہانی علالت کی خبر تھی - اس کا سارے ہندوستان پر ایک عجیب اور دہشت ناک اثر ہوا - تین دن تک تمام اخبار ان کی بیماری کی تفصیلی خبریں شائع کرتے رہے - بالآخر ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کو یہ جلیل القدر انسان اس دنیا سے رخصت ہوگیا - جامع مسجد کے قریب تمام مراسم تجہیز و تکفین عمل میں آئیں ، اور وہیں انہیں دفن بھی کیا گیا -

قوم کا ہر طبقہ ان کے علوئے مرتبت کا معترف تھا اور ان کا احترام کرتا تھا - یہ احترام محض اس وجہ سے نہ تھا کہ آزادی کے پہلے ہی دن سے مسلسل گیارہ سال تک وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے بلکہ اس وجہ سے تھا کہ وہ اس اڑتیس کرور نفوس والے ملک کے ایک نہایت عظیم المرتبت اور شہرۂ آفاق سیاست دان تھے اور نہایت سادہ ، صاحب ایثار اور فاضل انسان تھے - معارف اسلامیہ اور عربی و فارسی زبانوں کے ایک جید ماہر ہونے کی حیثیت سے وہ ایشیا

کے ایک جلیل القدر انسان تھے اور شاید سارے عالم اسلام میں سب سے بڑے عالم ۔ وہ حقیقی معنی میں حکیم تھے !

اپنی زندگی میں میں مشرق ، مغرب ، شمال و جنوب کے بہت سارے علماء سے ملا ہوں ۔ ان سے میری ملاقات ایشیا ، یورپ اور آفریقہ میں ہوئی ھے ۔ ان میں سے بہتوں کو میں زیادہ قریب سے جانتا ہوں ، اور مجھے احساس بھی ھے کہ ان سے مل کر میں نے کس قدر استفادہ کیا ھے ۔ مگر میری نظر میں ساری دنیا کے جلیل القدر علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا بہت بڑا رتبہ تھا ۔ ان کا نام صدیوں روشن رہے گا اور مجھے احساس ہوتا ھے کہ بہت ھی کم ان کے مرتبہ تک پہنچ سکے اور شاید ان پر تفوق تو کسی کو حاصل نہ ہو سکا !

ایک شخصی وصیت

از

همایوں کبیر

۱۹۳۶ء کا سال تھا جب میری پہلی ملاقات مولانا ابو کلام آزاد سے ہوئی تھی۔ لیکن اس پہلی ملاقات میں بھی میں اجنبی سا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میری نسل کے دوسرے ہزاروں افراد کی طرح میں نے بھی انہیں بہت سارے عام جلسوں میں دیکھا اور سنا تھا اور ان کے ان عظیم الشان کارناموں سے واقف تھا جو ملک و قوم کے لئے انہوں نے انجام دئے تھے۔ وہ اس وقت بھی افسانوی شہرت کے حامل تھے اور لوگ ان کا ذکر اکرام و احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کی عمر ابھی پچاس برس کی بھی نہیں تھی تاہم انہیں ہندوستان کا ایک بزرگ سیاست داں تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو ان کا ذاتی عز و وقار اور اختفاء و قلت مبالغہ تھی اور کچھ وہ شہرت جو انہیں ان کی عقل و تمیز کی وجہ سے حاصل تھی۔ میں ان کے متعلق مسز سروجنی نائیڈو کا یہ قول بھول نہیں سکتا جو ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا کہ "مولانا کے سن کا ذکر مت کرو، وہ اپنی پیدائش کے وقت ھی پچاس سال کے تھے!"

عنفوان شباب ھی میں مولانا جاذب نظر ہو چکے تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے بھی ان کی ترقی قابل ذکر ھے، عمر کے سولھویں سال ھی میں علوم مشرقیہ کا روایتی نصاب انہوں نے ختم کر لیا تھا۔ حالانکہ قابل طلباء بھی اپنی عمر کے بیس یا زیادہ سال میں کہیں پہنچ کر اس نصاب کی تکمیل کر سکتے ھیں۔ عام روایت کے بر خلاف انہوں نے اپنی تعلیم ملک سے باھر حاصل نہیں کی تھی، کلکتہ ھی میں ان کی

تعلیم ہوئی اور بھی زیادہ تر گھر ہی میں ۔ فارغ التحصیل ہو کر ہی انہوں نے ہندوستان سے باہر قدم رکھا ۔ جب وہ علوم اسلامیہ کے مراکز کے سفر کے لئے نکلے تو قاہرہ کی جامعہ ازہر کا بھی عجلت میں معائنہ کیا ۔

یہ شہرت کہ ان کی دماغی صلاحیتوں کا قبل از وقت نشو و نما ہو چکا تھا ایک سے زیادہ قصوں پر مبنی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک مشہور عالم سے کسی علمی مسئلہ پر طویل مراسلت کی تھی، لیکن بحث نا تمام رہی اور اس عالم نے مولانا کو شخصی طور پر گفتگو کرنے کی دعوت دی ۔ جب جواں سال مولانا مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان سے شائستہ انداز میں پوچھا گیا کہ ” آپ کے والد محترم خود تشریف لانے کے بجائے آپ کو کیوں بھیج دیا ہے؟ “ اسی طرح یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ لاہور کے ایک جلسہ میں مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے بلایا گیا تھا لیکن انہیں جلسہ گاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک خام و ناتجربہ کار نوجوان وہ شہرۂ آفاق فاضل جلیل کیسے ہوسکتا تھا جس کا انتظار کیا جارہا تھا !

غیر ممالک کے سفر سے واپس ہوتے ہی مولانا نے سیاسی تحریک میں حصہ لینا شروع کردیا ۔ اس سفر سے بہت پہلے ہی مولانا کو سیاسیات سے کافی دلچسپی تھی لیکن ممالک اسلامیہ میں سیاسی قائدین سے مل کر انہیں اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلم سیاسیات کی صحیح سمت کا پھر سے تعین کرنا نہایت ضروری ہے ۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمان حزن، یاس و بے اعتمادی کی فضاء میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔ سر سید احمد خان نے ان کی گرتی ہوئی حالت کو ایک ایسی حکمت عملی کے ذریعہ سنبھالنے کی کوشش کی جس کے دو پہلو تھے ۔ ایک طرف

تو وہ حکمراں قوتوں کی رعایت و عنایت کے خواہاں تھے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کو عملی سیاسیات سے علحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اس حکمت عملی کا سلبی پہلو خود بھی برا تھا اور ملک و ملت کے لئے خطرناک بھی۔ مسلمانوں کو سیاسیات سے علحدہ رکھنے کی کوشش کے بالمقابل ہندوؤں میں قومیت کا بھڑکتا ہوا جذبہ تھا، اور کچھ دن بعد اس سے باہمی تنازع اور غلط فہمی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

سرسید احمد خاں نے گزشتہ صدی میں جو حکمت عملی اختیار کی تھی اس کی جو بھی وجہ معقول مان لی جائے یہ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اس وقت تو فرسودہ ہوچکی تھی جب مولانا آزاد نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے یہ محسوس کرلیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مفاد کا اسی وقت تحفظ ہوسکتا ہے جب وہ آزادی کی قومی جد و جہد میں حصہ لینے لگیں۔ نہ صرف یہ بلکہ مولانا آزاد کی نظر بصیرت پر یہ امر بھی منکشف ہوگیا کہ ہندوستان کی آزادی تمام عالم اسلام کی ترقی اور فلاح کے لئے بھی ضروری ہے اس لئے انہوں نے علیگڈھ پارٹی کے بنیادی اصول پر کھلا اعتراض کیا۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون عمل کرنے اور ہندوؤں سے علحدہ رہنے کی اس حکمت عملی کو مردود قرار دیا جس پر سرسید عمل پیرا تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ قومی تحریک میں حصہ لیں اور برطانوی شہنشاہیت کی قوتوں کا مقابلہ کریں۔

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ گو مولانا آزاد نے اس طرح سرسید احمد خاں کی سیاسی تعلیمات کے خلاف بغاوت کی تھی، تاہم سرسید ھی کی معاشری و مذہبی تصانیف نے انہیں سب سے پہلے اصلاح و تغیر کے حدود میں فکر کرنے پر اکسایا۔ سرسید احمد خاں کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ یقین ان کے قلب میں پیدا ہوا کہ کوئی قوم عصر حاضر میں عروج نہیں کرسکتی جو عصر جدید کے تقاضوں

کو پورا نہ کرسکے ۔ سر سید کی تصانیف ھی سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ عصر جدید میں کوئی تعلیم اس وقت تک کامل نہیں تصور کی جاسکتی جب تک کہ مغربی دنیا کے فلسفیانہ افکار ، سیاسی تصورات اور سائنسی معلومات سے براہ راست واقفیت حاصل نہ کی جائے ۔ اسی تحقیق نے خود مولانا آزاد کو انگریزی سیکھنے پر آمادہ کیا ۔ ھوسکتا ھے کہ خود سر سید ھی نے جواں سال مولانا آزاد کو مسلمانوں کی موجودہ ادعائیت و تقلید پسندی کے خلاف برانگیختہ کیا ھو۔ مولانا آزاد سر سید احمد خاں کے ان خیالات سے متفق تھے کہ تعلیمی اصلاح اور معاشری انقلاب کی ضرورت ھے ۔ کہا جاسکتا ھے کہ اصلاح کے اس عمل کو انہوں نے کچھ اور آگے بڑھایا جس کی ابتدا سرسید نے کی تھی ۔ سر سید تعلیم ، مذھب اور معاشرے میں تبدیل کی سفارش کرتے ھیں ، مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ اسی قسم کی تبدیلیاں مات کے سیاسی نقطۂ نظر میں بھی ضروری ھیں ۔

مولانا آزاد نے اپنے سیاسی عقیدہ کا اعلان الہلال میں کیا جو پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۱۲ ء میں شائع ھوا ۔ اس پرچہ کی اشاعت نے ھندوستان کے مسلمانوں کو دم بھر میں مسخر کرلیا ۔ ادبی لحاظ سے یہ اردو زبان کی تاریخ میں ایک بے مثال سی چیز تھی ۔ فصاحت و بلاغت ، ظرافت و شعریت ، طنز و تصوریت کے لطیف امتزاج کی یہ ایک نادر مثال تھی ۔ الہلال کے اداریوں سے اردو کی ایک نئی انشاء ظہور میں آئی ۔ روشن خیال طبقہ ان سب سے کافی متأثر ھوا ، لیکن نوجوانوں کے تخیل کو جس چیز نے مسخر کرلیا وہ صرف شاعرانہ لطافت یا ادبی حسن ھی نہ تھا بلکہ ایک نئے عقیدہ کی تشکیل تھی ۔ الہلال بہت جلد ھندی مسلمانوں کی دوبارہ جی اٹھنے والی روح کی تجلیات کا مرکز بن گیا !

تقریباً پچاس سال تک مولانا آزاد قومیت ، ترقی ، آزادی اور

جمہوریت کے میر میدان رہے ۔ بعضوں کی نظر میں یہ ایک استبعاد ہے!

مولانا آزاد کا تعلق شیوخ طریقت کے ایک خانوادہ سے ہے، اور ان کی تعلیم و تربیت راسخ العقیدہ مسلمانوں کی سی ہوئی ۔ ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ انہیں دینیات اور علوم اسلامیہ کا عالم تسلیم کر لیا گیا ۔ علوم نقلیہ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے سر سید احمد خاں کے زیر اثر انگریزی پڑھنی شروع کی ۔ بہتوں کو تعجب تھا کہ وہ محب وطن اور مصلح کس طرح بن گئے ۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ۔ ہاں حیرت و استعجاب تو ان ہی کو ہو سکتا ہے جو عہد سلف کی ان روایات کو فراموش کر بیٹھتے ہیں جو جمہوریت، آزادی اور حکمت پروری پر زور دیتی رہی ہیں ۔ چوں کہ مولانا آزاد کو ان اقدار کا علم و عرفان نصیب تھا اسلئے انہوں نے غلامانہ سیاست، جاگیرداری اور ہندوستانی مسلمانوں کے عقلی جمود کو رد کر دیا ۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سیاسی جد و جہد میں حصہ لینے والے ان کے اکثر قریبی رفقائے کار بھی علوم اسلامیہ کے ماہر تھے ۔ مولانا آزاد کے لئے اسلام سیاسی غلامی، معاشی استحصال اور عقلی ظلمت سے نجات حاصل کرنے کا نام ہے ۔ جس چیز نے انہیں زاہد کے صومعہ سے نکال کر سیاست کے میدان جنگ میں پہنچایا وہ حریت اور اس کے تمام روشن پہلوؤں کی ان کی نظر میں اہمیت ہے!

پہلی مرتبہ جب میں مولانا سے ملا تو میرے قلب پر ان کی دو صفات نے کافی اثر کیا: ان کی فکر کی صفائی اور قوت فیصلہ کی پختگی ۔ وہ ہر مسئلہ کے قلب تک جا پہنچتے اور حشو و زوائد کو نظر انداز کر دیتے ۔ حقائق تک پہنچنے کی یہ قابلیت ان کے عدل و انصاف سے تعشق کا نتیجہ تھی ۔ وہ کسی معاملہ کے صرف ایک پہلو پر نظر نہیں ڈالتے تھے بلکہ مخالف پہلو کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے شخصی پسند یا ناپسند شاذ ہی ان کے فیصلہ پر اثر انداز ہوتی ۔ عقلی

تجرید اور مختلف نقاط نظر کو ملحوظ رکھنے کی اس قابلیت کی وجہ سے ان کی بات میں ایک وزن پیدا ہو جاتا تھا ۔ جب بھی کوئی مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا وہ اس کا ایک حل پیش کرتے جو معلوم ہو جانے کے بعد تو بدیہی نظر آتا لیکن اس سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آتا ۔

جذبات سے آزاد ہو کر فیصلہ کرنے کی یہ قوت شاید اس وجہ سے مولانا میں پائی جاتی تھی کہ سیاسیات ان کے علم پر مسلط نہیں ہو گئی تھیں ۔ عالم کا تعلق زندگی کے دائمی اقدار سے ہوتا ہے اور سیاست داں کی توجہ زیادہ تر واقعات یومیہ پر مرکوز ہوتی ہے ۔ مولانا آزاد مدبر تھے نہ کہ محض موقع شناس شاطر سیاسیات ۔ ان کی طبیعت میں شاعر کی زود حسی موجود تھی لیکن وہ اپنے جذبات کو سیاسی فیصلوں پر غالب ہونے نہیں دیتے تھے ۔ وہ ہر معاملہ کو تجرید ذہنی اور واقعیت پسندی سے جانچتے اور یہ چیز ان کے دوست اور دشمن دونوں کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوتی !

مولانا کی بصیرت کی صفائی ان کی قوت فیصلہ کی صلابت اور اعتدال پسندی کا باعث تھی ۔ جب تک انسان عقل کی اتباع کرتا ہے اور ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھتا ہے وہ خطا سے محفوظ رہتا ہے ۔ سیاسیات میں بھی خطا اسی وقت سرزد ہوتی ہے جب تعصبات کا ہمارے قلب پر غلبہ ہو جاتا ہے اور ہم کسی معاملہ کے مختلف پہلوؤں کو ملحوظ نہیں رکھتے ۔ مولانا آزاد کی فکر کی صفائی اور قوت فیصلہ کی پختگی نے ان کے سیاسی آراء میں لاشخصیت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی جس سے دوست تو مرعوب ہو جاتے اور مخالف بدحواس ! یہی وجہ ہے کہ شدید سے شدید مناقشوں میں بھی ان کی زبان سے ان لوگوں کے خلاف غیظ و غضب یا الزام کا ایک لفظ نہیں نکلتا جو ان کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ۔ عین طوفان میں وہ ساکت

و مطمئن نظر آتے! اس ریاضت کا ثمرہ ان کی وہ زبردست شخصیت تھی جس کا اثر ہر ملنے والے پر طاری ہوئے بغیر نہ رہتا!

رام گڑھ کانگرس کے اجلاس کے دوران میں مجھے مولانا آزاد سے قریبی تعلق پیدا ہوا۔ کانگرس کے اجلاس سے قبل کی شام انہوں نے مجھے اپنے مہمان کی حیثیت سے بلایا۔ جب کی اس تجلی سے میں حیران رہ گیا، کیونکہ میں اس وقت ان کے لئے اجنبی سا تھا، لیکن بہت جلد ان کی علوئے ہمت اور فیاضی کی اور بھی شہادتیں میرے مشاہدہ میں آئیں۔ میں وہ دو تین دن بھول نہیں سکتا جو ان کی معیت میں میں نے بسر کئے۔ صبح کے ناشتے، دوپہر اور شام کے کھانوں میں پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو اور دوسرے احباب بھی مولانا آزاد کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ گفتگو سیاسیات ھی کی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسانی تاریخ و تمدن کی تمام وسعتوں پر حاوی ہوتی۔ ان اکابر کے ضیابار مکالمہ کو سن کر قلب کو فرحت ہوتی اور مجھے بار بار مولانا کے اس جدید و عقلیت پسند زاویۂ نگاہ پر حیرت ہوتی تھی جو وہ تمام مسائل کے حل میں اختیار فرمایا کرتے تھے۔ وہ ایک پرجوش وطن پرست تھے۔ لیکن ساتھ ھی انہوں نے انسانی زندگی اور انسانی فطرت کا بھی بڑا غائر مطالعہ کیا تھا۔ مباحثوں میں وہ ایک عالم کی تجرید ذہنی سے کام لیتے اور ایسی رواداری کا مظاہرہ کرتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ سبھاس چندرا بوس اس زمانہ میں کانگرس کی ضد میں مصالحت کی حکمت عملی کے خلاف جاسے کر رہے تھے اور اکثر کانگرسی اس سے اذیت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن مولانا کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ انہوں نے سبھاس چندرا بوس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ھی ان جلسوں کے خلاف۔ انہوں نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ گو وہ سبھاس چندرا بوس کے زاویۂ نگاہ اور طریق عمل دونوں کے خلاف تھے تاہم وہ کبھی اس حقیقت کو فراموش

نہیں کرسکتے تھے کہ سبھاس چندرا بوس ہندوستان کے ایک سچے اور مخلص محب وطن ہیں۔

مولانا آزاد نے مسلم لیگ اور اس کے قائدین کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی اسی رواداری اور وسعت قلبی سے کام لیا۔ ان قائدین نے مولانا آزاد کو وقت بے وقت برا بھلا کہا لیکن خود مولانا جب ان کا ذکر کرتے تو تواضع و شائستگی سے کرتے۔ وہ اپنے سیاسی عقیدہ پر قائم تھے اور لیگ کی حکمت عملی کے مخالف، لیکن انہوں نے کبھی لیگ کے اکابر پر حملہ نہیں کیا۔ رہے وہ طلباء اور دوسرے نوجوان جن کو لیگ نے گمراہ کردیا تھا مولانا آزاد نے ان پر ملامت کرنے یا ان کو سزا دینے سے صاف انکار کردیا، کیوں کہ یہ ان کی رائے میں ملامت کے اتنے مستحق ہی نہ تھے جتنے کہ وہ زعماء جنہوں نے انہیں بے راہ بنا دیا تھا۔ داد منصفانہ کی ہمیں ایک مثال ملتی ہے کہ یہی نوجوان بعد میں مولانا کی خدمت میں مشورہ اور امداد کے لئے حاضر ہوتے اور مولانا ان کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی اور مروت ہی سے پیش آتے تھے۔

قبول یا عدم قبول خلق کا مسئلہ مولانا کے ہاں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ ان کی رائے میں جو حق و صواب ہوتا اسی کا وہ اظہار کرتے اور اسی پر عمل پیرا ہوتے اور اسی پر قائم رہتے۔ مسلم لیگ کے وعدوں اور وعیدوں کا جس طرح انہوں نے مقابلہ کیا وہ سب ہی جانتے ہیں۔ سالہا سال تک وہ کلکتہ میں عید کی نماز پڑھایا کرتے تھے اور ہزاروں لوگ نماز میں شرکت اور خطبہ کے سننے کے لئے آیا کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے بعض افراد نے ان کو امامت کی اس خدمت سے معزول کرنے کی تحریک شروع کی۔ مولانا آزاد کے ہزاروں شیدائیوں نے اس کو سخت ناپسند کیا اور ان سے التجا کی وہ ایک حقیر و گمراہ جماعت کے اس غلط عمل سے متأثر نہ ہو جائیں۔ خود

مسلم لیگ کے سنجیدہ افراد اپنے ساتھیوں کے اس عمل سے شرم محسوس کررھے تھے اور انہوں نے مولانا سے درخواست بھی کی کہ وہ امامت کے فرائض ادا کرتے رھیں، بعض مسلمانوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اگر ایسا کرنا ھی پڑے تو دو جماعتیں ھو سکتی ھیں، ایک کی امامت مولانا آزاد کریں اور دوسری کی مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ۔ مولانا آزاد نے قطعیت کے ساتھ کہہ دیا کہ سیاسی اختلافات کا اثر دینی معاملات پر ھرگز نہ ھونا چاھئے اور اگر کلکتہ کے بعض مسلمان ان کی امامت پسند نہ کریں تو وہ کسی صورت اس فریضہ کو انجام دینے تیار نہیں۔

رام گڑھ کانفرنس کے بعد ھی مولانا آزاد اور ان کے دوسرے کانگرسی رفقائے کار کو قید کرلیا گیا۔ جب جاپان عالمی جنگ میں کود پڑا تو انہیں تھوڑے عرصہ کے لئے رہا کردیا گیا، لیکن جب کانگرس نے اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں ”ھندوستان چھوڑدو“ قرارداد منظور کی تو پھر کانگرس کے تمام زعماء کو قید کردیا گیا۔ یاد رھے کہ اس سارے عرصہ میں مولانا آزاد انگریزوں سے مفاھمت کرنے کی سعی کرتے رھے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاھتے تھے کہ کس طرح ھندوستان تمام جمہوریتوں کے ساتھ ھم رتبہ رفیق کار کی طرح اشتراک عمل کرسکتا ھے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ انہوں نے اس امر کا اعلان کیا کہ ھندوستان جمہوریتوں کا ساتھی ھے لیکن برطانیہ کی انتہا پسندی نے ھندوستان کو اپنا صحیح فرض ادا کرنے سے روکے رکھا۔ انہوں نے کہا کہ ھندوستان سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی ھے کہ وہ آزادی اور جمہوریت کی بقا کے لئے جنگ کرے جب خود اس کو آزادی اور جمہوریت سے محروم کیا جارھا ھے!

یہ وہ آخری موقع تھا جب مولانا آزاد نے محبس کو محبوب کہا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں جب وہ رہا ھوے تو میں ان کے ھزاروں

شیدائیوں کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ کچھ دن بعد وہ شملہ جارہے تھے تاکہ اس گول میز کانفرس میں شرکت کریں جس کے داعی لارڈ ویول تھے اور جس میں ھندوستان اور برطانیہ کے تعلقات پر غور کیا جانے والا تھا۔ وہ سنہ ۱۹۴۲ء سے اب تک قید میں تھے اور ان کی صحت ابھی کمزور تھی۔ انہوں نے مجھ سے اپنے مکان پر ملنے کی خواھش کی اور جب میں ان سے ملا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے داخلی حلقہ میں شریک ھو جاؤں اور اس طرح میری عزت افزائی فرمائی۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ انہوں نے قلعہ احمد نگر کے قید خانہ میں میرے مہا راجہ سایاجی خطبات پڑھے جو ھندوستان کی ثقافت کی وحدت پر میں نے دئے تھے۔ اور جو بعد میں "ھندوستانی ورثہ" کے عنوان سے شائع ھو گئے۔ اور جو توجیہ میں نے ان خطبات میں پیش کی تھی اس سے بڑی حد تک انہیں اتفاق تھا۔ پھر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں شملہ کانفرنس میں ان کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے پر راضی ھوں؟ میں نے فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اس طرح وہ ربط قائم ھوا جو ان کے وقت آخر تک باقی رھا!

میری یہ خوش بختی ھے کہ میں نے مولانا کا کام نہ صرف شملہ کانفرنس ھی میں دیکھا بلکہ ان کو اس برطانوی کابینہ کے وفد کے ساتھ معاملہ کرتے ھوئے بھی دیکھا جس کی قیادت لارڈ پیتھک لارنس کر رھے تھے۔ مولانا آزاد کی عقل کے جوھر ان مباحث میں جس قدر کھل کر ظاھر ھوئے کہیں اور شاید نہ ھو سکے۔ اپنی خود نوشت سوانح میں انہوں نے دیش بندھو چترنجن داس کی بڑی تعریف کی ھے۔ مولانا آزاد کی رائے میں دیش بندھو داس کی ذات میں ایک تصوریت پسند فلسفی کی بصیرت اور ایک فعال مدبر کی عقل سلیم جمع تھیں۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں «دیش بندھو داس مطارب اور ممکن میں توافق پیدا کرنا جانتے تھے» ۔ یہی خوبی مولانا آزاد کے زاویۂ نگاہ کی تھی ان بے شمار

مسائل کے حل میں جو برطانیہ اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کو بگاڑ رہے تھے! ناممکن مطالبات یا کامل اطاعت ۔ افراط و تفریط کی ان دو طرفین سے وہ صاف بچ کر نکل جاتے تھے اور قصد الامور کی راہ پر گام زن ہوتے تھے! کانگرس کی صدارت کے زمانہ میں ان کی اس مہارت کا بارہا مظاہرہ ہوا جس کی وجہ سے وہ دو مخالف جماعتوں کے اختلافات کو رفع کردیتے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کردیتے تھے ۔ برطانوی کابینہ کے وفد کے مباحث میں بھی یہی مہارت زیادہ روشن ہو کر نظر میں آئی ۔

مولانا آزاد مخالف و متضاد نقاط نظر میں توافق اس لئے پیدا کرسکتے تھے کہ وہ تمام مسائل پر علمی اور تنقیدی طریقہ سے غور و فکر کرتے تھے ۔ واقعہ یہ ھے کہ میں نے اکثر مسائل کے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ کو جدید تعلیم کے حاملین سے زیادہ جدید اور معقول پایا ۔ مولانا آزاد نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کبھی انگریزی نہیں پڑھی تھی ۔ بعد میں انہوں نے اپنی کوشش سے انگریزی سیکھی اور گو ان میں اتنی قابلیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی مضمون پر بھی وہ انگریزی میں کتابیں پڑھ لیتے تھے تاہم وہ انگریزی زبان سے بے تکلف نہیں ہوسکے تھے ۔ انہیں اس کا دعوی بھی نہیں تھا، چنانچہ مسٹر اٹلی سے جب وہ لندن میں ملے تو ان سے صاف کہہ دیا کہ اسی وجہ سے وہ ایک مترجم کی وساطت سے ان سے گفتگو کر رہے ھیں ۔ اس کے باوجود مولانا آزاد جدید ہندوستان میں انگریزی زبان کے ایک زبردست حامی و مؤید تھے ۔ انہوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے انگریزی زبان جدید سائنسی معلومات حاصل کرنے اور جدید سیاسی ومعاشری انکشافات کے جاننے کا سب سے زیادہ آسان ذریعہ ھے ۔

اکثر یہ کہا جاتا ھے کہ قانون مکافات ھی قانون حیات ھے ۔ اسی صداقت کو ہم اس طرح بھی ادا کرسکتے ھیں کہ واھب العطایا

نے مختلف افراد کو مختلف عطیے بخشے ھیں ۔ بعض کو اس نے مادی قوت دی ھے اور بعض کو عقلی شرف ۔ بعض کو وہ دولت سے نوازا کرتی ھے اور بعض کو شہرت سے ۔ شاذ و نادر ھی ایسا ھوتا ھے کہ یہ ساری نعمتیں ایک ھی فرد کو نصیب ھوتی ھوں ! مولانا آزاد وہ خوش نصیب فرد تھے جن کو وہ ساری نعمتیں بھرپور عطا کی گئی تھیں جن کی کوئی انسان تمنا کرسکتا ھے ، لیکن یہ تضاد بھی فہم انسانی سے ماوراء ھے کہ یہ ساری نعمتیں ایک ایسے حساس قلب میں جمع کردی گئی تھیں جو مصائب انسانی کو دیکھ کر ، اس کے حمق و بطلان و منافرت کا مشاھدہ کر کے اپنے سارے فضائل و کمالات کو غم و کرب میں مبدل پاتا ھے ۔

ان تمام نعمتوں کی موجودگی میں اور اس حساس قلب کو لئے ھوئے یہ بات ناگزیر سی تھی کہ مولانا آزاد سا شخص روحانی اعتبار سے تجرید و تفرید کے عالم میں بسر کرے ۔ جو شخص بھی ان سے قریب ھوا اس نے ان کی اس تجرید روحانی کا ضرور مشاھدہ کیا ۔ وہ متواضع ، حلیم اور لامتناھی خوبیوں کے انسان تھے لیکن کم آمیز ، وہ اپنے افکار و خیالات ھی کی دنیا میں رھتے اور یہیں سے انہیں وہ قوت ملا کرتی جو انہیں دنیا کے آلام و مصائب کو برداشت کرنے کے قابل بناتی تھی ۔ مصائب انسانی کا نازک احساس رکھتے ھوئے بھی ان میں صبر و تحمل کا خاص مادہ تھا اور انسان کے ذاتی محاسن پر بھی وہ ایمان رکھتے تھے اور ان کے تمام درد و غم میں یہی صفات ان کی تسلی و تشفی کا باعث ثابت ھوئیں ۔ طبعاً تو وہ عقلیت پسند تھے لیکن انہیں اس امر کا کامل یقین تھا کہ « ارادۃ اللہ » ھی بالآخر غالب رھتا ھے ۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی قوم کو ان کی وصیت ، وہ قوم جس سے ان کو محبت تھی اور جس کی انہوں نے اس خوبی سے خدمت کی ۔

انقلاب پسند مولانا

از

محمد حبیب

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی زندگی کی تعبیر ایک حرکت سے لی جاسکتی ہے جو بے حد قوی بھی ہے اور منطقی بھی، لیکن اس میں کچھ ناگزیر موڑ بھی ہیں، یہ موڑ انہیں قرون وسطی کی اسلامی مدرسیت (جس پر جدید سائنس اور فلسفہ کا مطلق اثر نہ ہوا تھا) سے ہندوستان کی "دنیاوی" حکومت اور اس کی طریق زندگی کی طرف لے جاتے ہیں۔

مولانا کے والد محترم حضرت شیخ محمد خیرالدین نے مکۂ مکرمہ ہجرت کی تھی اور مولانا کی ولادت اسی مقدس شہر کے محلہ دار السلام میں نومبر سنہ ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد ایک مشہور عالم اور صوفی تھے جن کے پیرو ہندوستان میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ وہ ایک محتاط عالم دین تھے اور اسلام کی ان تمام توجیہات کو نا پسند کرتے تھے جو روایات سلف کے خلاف ہوتیں۔ مولانا کی تعلیم ان کے والد کی سخت نگرانی میں ہوئی۔ جب مولانا کی عمر تقریبا دس سال کی ہوئی تو ان کے والد کو ہندوستان واپس بلا لیا گیا اور وہ زیادہ تر کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ والد کے انتقال سے پہلے ہی، گویا سنہ ۱۹۰۹ء میں، مولانا ان فکری قیود سے نکل آئے تھے جن میں ان کا نشو و نما ہوا تھا اور ان پر سر سید احمد خاں کی تصانیف کا اثر ہو رہا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ نہ رہا۔ سر سید نے ان علمائے دین پر بے رحمی سے حملہ کیا تھا جو ان کی نظر میں قرون وسطی کے طرز فکر و طرز زندگی کے دلدادہ تھے۔ یہاں مولانا سر سید سے متفق تھے۔ لیکن برطانوی اقتدار سے وفاداری سر سید کی تعلیمات اور علیگڈھ تحریک کا ایک اہم جزء تھی اور مولانا کا سیاسی غلامی کی حکمت عملی سے بغاوت کرنا بھی لازمی تھا۔ اس کا نتیجہ (مولانا بیان فرماتے ہیں) یہ ہوا کہ

کچھ عرصہ کے لئے الحاد و بے یقینی نے ان کی باطنی زندگی کو مضطرب کردیا۔ الحاد کا لفظ جو مولانا نے استعمال کیا ہے شاید ذرا سخت ہے، لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان پر اضطراب و بے چینی کی ایک حالت ضرور گزری ہے جو گو تھوڑی ہی مدت رہی تاہم اس سے ان کے تمام قدیم خیالات و تصورات متزلزل ہوگئے اور انہوں نے وہ ترقی پسند پہلو اختیار کرلیا جو ان کے وقت آخر تک ان کا ایک نمایاں وصف تھا۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے (جو صحافت کا کافی تجربہ رکھتے تھے) تین خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اپنا اردو ہفتہ وار اخبار الہلال نکالا، جو آخر میں چل کر پچیس ہزار کی تعداد میں شائع ہونے لگا۔ انہوں نے اسلام میں جامد تقلید کو نا پسند کیا اور سر سید کی سیاسی محکومی والے نظریہ پر اعتراض کیا۔ ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مجتہدانہ خیالات پیش کرنے کی بھی کوشش کی جس کی کسی قدر تفصیل ہمیں ان کی تفسیر ترجمان القرآن میں ملتی ہے۔

جو شخص اس طرح اپنی راہ کا تعین کرلیتا ہے اس کو ان ابتلاؤں سے بھی گزرنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے جو اس راہ کے لوازم ہیں۔ اور مولانا اس کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۳ء ہی میں الہلال میں لکھا تھا کہ ”ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جب کہ انسانوں کے لئے زندگی کی خواہش معصیت ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہوتا ... یہ وقت آتا ہے اور انقلاب امم کے ایک قدرتی قانون کے تحت گزر جاتا ہے اور پھر بربادی و ہلاکت کا ہر وہ بیج جو زمین میں ڈالا گیا تھا نئے موسم کے شروع ہوتے ہی زندگی اور حیات قائم و دائم کا پھل پیدا کرتا ہے۔[1]“ نیز ”قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے۔[2]“۔

(۱) آثار ابوالکلام آزاد از قاضی عبد الغفار ص ۱٤ (۲) آثار ابوالکلام ص ۱۵.

جب الہلال کی ضمانت ضبط کرلی گئی تو انہوں نے البلاغ شائع کرنا شروع کیا ۔ لیکن بنگال کی حکومت نے انہیں سنہ ۱۹۱۶ء میں شہر بدر کردیا اور بمبئی اور بہار کی حکومتوں کے سوا دوسری ساری حکومتوں نے انہیں اپنی حدود میں داخل ہونے سے منع کردیا تھا ۔ وہ رانچی میں مقیم ہوگئے جہاں انہیں حکومت نے بہت جلد نظر بند کردیا ۔ اپنی زندگی کے اس دور میں انہوں نے دو مشہور کتابیں لکھی ہیں : تذکرہ اور ترجمان القرآن کی پہلی جلد ۔

مقلدین اہل سنت مولانا پر دو اعتراض کرتے ہیں ۔ پہلا یہ کہ وہ غیر مقلد ہیں ، کیوں کہ انہوں نے اسلامی فکر کے ان مسلمہ اشکال کو قبول نہیں کیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے رسم و رواج کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں ۔ اس الزام کو مولانا نے بارہا تسلیم کیا ہے ۔ تذکرہ کے صفحات پر اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ : ”جس حال میں رہے نقص اور ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید اور روش عام سے پرہیز ۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی ، اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے اپنا نقش قدم چھوڑا .... توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں ، ہدایت اور تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں ۔ سب سے زیادہ آسان اور پر امن راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی صحبت حاصل ہوجائے ، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اس بارے میں میری درماندگی و بیکسی کسی متعارف وسیلۂ ہدایت و ارشاد کی رہین منت نہیں ... اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی نہ خاندان کی ، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی ۔ جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہ عشق سے پایا ہے ... ۔ ۱“ کسی اور جگہ فرماتے ہیں : ” انسان کی

(۱) منقول از اسرار ابوالکلام آزاد ص ۲۰۲ تا ۲۰۴ .

دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑبند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کردیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ، ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے اس کے لئے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اس کو چھونے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اس قدر سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا [۱]"۔

مولانا پر دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ مسلمان ہونے کے باوجود تمام مذاہب کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ اعتراض صحیح ہے لیکن بعض دفعہ اس میں بغض کی آمیزش نظر آتی ہے۔ قرآن حکیم ایک بات بہت صاف کہتا ہے، وہ یہ کہ خدا نے ہر قوم کی ہدایت کے لئے رسول بھیجے ہیں؛ کیوں کہ وہ کہتا ہے کہ:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا: اور ہم سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔ (بنی اسرائیل، رکوع ۲)

خدا کی ایک بنیادی صفت اس کی ربوبیت ہے، جس کی توجیہ مولانا نے اس طرح کی ہے: تخلیق + تحفظ + ترقی + ہدایت، اپنی زندگی کے اس دور میں مولانا علمائے دین سے سخت ناراض تھے اس لئے کہ ان کی رائے میں ان علماء نے قرآن کی تفسیر یونانی فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں کی تھی جس کی وجہ سے بے شمار غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ مولانا کا کہنا تھا کہ قرآن کو اسی طرح سمجھنا چاہئے جس طرح پیغمبر اسلام نے اور ان کے صحابہ نے سمجھا تھا۔ وہ خود کو تمام پیش رو انبیاء

---

(۱) منقول از اسرار ابو الکلام آزاد ص ۲۷۳ تا ۲۷۴۔

کے صحیح وارث خیال کرتے تھے۔ قرآن کا بیان ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ (البقرۃ، رکوع ۴۰)

لیکن ان تمام معاملات میں خود مولانا اپنے خیالات کے بہترین مفسر ہیں لهذا ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

الهلال میں ایک مستفسر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے لکھا تھا:

"مذہب اور پیروان مذہب کا امتیاز ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں، ایک چیز نہیں ہے۔ مذہب کے بارے میں ہماری دوتہائی مایوسیاں اسی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ ہم بسا اوقات ان دونوں کا عددی اختلاف بھول جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی تعلیمی صداقت بھی ایسی نہیں جس کے پیروؤں کے فہم وعمل کو حجت قرار دے کر ہم حقیقت کی طرف قدم بڑھا سکتے ہوں ... سچائی کی راہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن کے لئے بظاہر دو ہی طریقے ہو سکتے تھے: یا تو وہ تمام پیروان مذاہب کی تصدیق کرے یا سب کی تکذیب کرے سب کی تصدیق کی نہیں جاسکتی تھی، کیوں کہ ہر ایک کا دعوی دوسرے سے متضاد تھا۔ اسی طرح سب کی تکذیب بھی صداقت کے خلاف تھی کیوں کہ اس صورت میں دنیا کا مذہبی صداقت سے خالی ہونا لازم آتا تھا اور انسان کی روحانی تربیت کی تمام بنیادیں منہدم ہو جاتی تھیں۔ پس اس نے دونوں طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی اختیار نہیں کیا۔ ایک تیسری راہ اختیار کی۔ اس نے کہا کہ دنیا کے تمام مذاہب حق ہیں لیکن دنیا کے پیروان مذاہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے،

(۱) منقول از اسرار ابو الکلام آزاد ص ۲۷۳ تا ۲۷۴ ۔

بھی دعووں کی لڑائی اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے، پیروان مذہب کے فہم و عمل میں ہے، مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروان مذہب کا یہ انحراف دور ہو جائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے... یہی مذاہب عالم کا "مشترک حق" دنیا کی عالم گیر روحانی صداقت ہے!"

الہلال میں ایک دوسرے مستفسر کے جواب میں مولانا نے لکھا تھا:

"قرآن کریم کے مطالعہ و تدبر میں آپ کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ اس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک کہ اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہ ہو جائیں گے... مختصراً یوں سمجھئے کہ صدر اول کے بعد سے قرآن کریم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہو گئیں۔ ایک قرآنی ہے اور دوسری غیر قرآنی... غیر قرآنی طریقہ سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے۔ یہ علوم وضعیہ کی اشاعت، ایرانی، رومی، ہندی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقوام کے اختلاط کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن کے مطالب اسی شکل و نوعیت میں دیکھے جیسی شکل و نوعیت کی فکری حالت ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ قرآن کے الفاظ، تراکیب، اسلوب بیان، دلائل و براہین، مواعظ و حکم سب نے ایک دوسرے ہی طریقہ کی نوعیت اختیار کر لی۔ قرآن کی تعلیم و بیان کی تمام تر بنیاد فطرت اور فطرت کی سادگی پر تھی، علوم و فنون کی تمام تر بنیاد وضعیت اور وضعیت کے تعلق اور کاوش پر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہماک بڑھتا گیا فطرت کے ذوق و فہم کی استعداد

(۱) منقول از آثار ابوالکلام آزاد ص ۱۵۷ تا ۱۵۸۔

کم ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب لوگوں کے دماغ اس درجہ وضعیت اور وضعی طریق بحث کے عادی ہوگئے کہ کسی اہم اور عظیم بات کو اس کی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے ... مقدمات کے طریقہ کا تمام تر دار و مدار وضعی علوم کے فطری مسلمات پر ہوتا ہے اور یہ مسلمات نہ تو ہر حال میں حقیقی ہیں، نہ ہر زمانہ کی علمی استعداد یکساں طور پر ان کا اعتراف کر سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کل تک جو بات مسلم طور پر مانی جاتی تھی آج اتنی کمزور ہو جائے کہ لوگ اس کی ہنسی اڑائیں۔ ایمان کی بنیاد ایسی متغیر اور متلون بنیاد پر نہیں ہو سکتی۱"

اس بحث کے سلسلہ میں ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"افسوس قرآن کہاں لے جانا چاہتا تھا اور دنیا نے اسے سر پر رکھ کر کدھر کا رخ کیا۔ ہمارے مفسرین و متکلمین ارسطو کی منطق اور یونانیوں کی دانش فروشیوں میں ایسے گم ہوگئے کہ انہیں دوسری راہوں کی خبر ہی نہ رہی ۲"

فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت بنگال کو مخاطب فرماتے ہوئے مولانا نے فرمایا تھا کہ:

"دنیا کے تمام تر نزاعات اور اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں، یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشۂ عمل میں حقیقت اور مسمی کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن بھیس مختلف ہوگئے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معنی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے، اور گو سب طلب گار اور پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم دیگر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے: شہد،

---

(۱) آثار ابو الکلام آزاد ص ۱۵۶ تا ۱۶۰ (۲) آثار ابو الکلام ص ۱۶۰ تا ۱۶۱۔

دوسرا کہتا ھے: عسل- مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ھی ھے ... مذاہب کے اختلاف سے لےکر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلاف تک ھر جگہ یہی علت کام کر رھی ھے- اگر کبھی ھو سکے کہ ظواھر و اسماء کے تمام پردے اٹھادئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ھوکر سامنے آجائے تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ھوجائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ھی ھے اگرچہ بھیس مختلف ھیں، اور سب کا مقصود ایک ھی ھے اگرچہ نام بہت ھیں''

کسی اور جگہ فرماتے ھیں: ''ایک مذھب تو موروثی مذھب ھے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے رھے ھیں مانتے رھئے- ایک جغرافی مذھب ھے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاھراہ عام بن گئی، سب اس پر چلتے رھے ھیں اور آپ بھی چلتے رھئے- ایک مردم شماری کا مذھب ھے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذھب کا بھی ھوتا ھے، اس میں اسلام، درج کرادیجئے- ایک رسمی مذھب ھے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ھے، اسے نہ چھیڑئے اور اسی میں رھتے رھئے- لیکن ان تمام مذھبوں کے علاوہ مذھب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ھے- تعریف و امتیاز کے لئے اسے حقیقی مذھب کے نام سے پکارنا پڑتا ھے اور اسی کی راہ گم ھوجاتی ھے:

ھیں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجاست!

اس مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بے نقاب ھوجاتی ھے کہ علم و مذھب کی جتنی نزاع ھے وہ فی الحقیقت علم و مذھب کی نہیں، مدعیان مذھب کی خام کاریوں، ظاھر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ھے- حقیقی علم اور حقیقی مذھب اگرچہ چلتے ھیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ھیں ایک ھی منزل پر[۱]''

(۱) منقول از آثار ابوالکلام آزاد ص ۲۸۱ •

مذہب اور سائنس کے اختلاف و فرق کو مولانا اس طرح بیان کرتے ہیں:

"فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے ۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنہیں ثابت کرسکتے ہیں اور اسی لئے مان لیتے ہیں ۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنہیں ثابت نہیں کرسکتے مگر مان لیتے ہیں۱ "

اس زمانے میں مولانا کے دو قطعی قضیے تھے: قرآن کو اسی فطری طریقہ سے سمجھنا چاہئے جس طرح کہ پیغمبر اسلام (صلعم) اور صحابہ نے سمجھا تھا، اس غرض کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ قرآن کی وہ ساری تفسیریں جو قرون وسطی کی مصطلحات میں قرآن کی تعبیر کرتی ہیں مسترد کردی جانی چاہئیں ۔ اپنے ترجمان القرآن کے مقدمہ میں جو رانچی کی نظربندی کے زمانہ میں لکھا گیا تھا لیکن سنہ ۱۹۳۱ء ہی میں شائع ہوسکا مولانا فرماتے ہیں:

" قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب، اپنے طریق استدلال، غرض یہ کہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی و صناعی طریقوں کا پابند نہیں اور نہ اسے پابند ہونا چاہئے ۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بےمیل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیاء کرام (علیہم السلام) کے طریق ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کردیتا ہے ۔

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا ۔ تمدن کے وضعی و صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ

(۱) منقول از آثار ابوالکلام آزاد ص ۲۸۲ ۔

نہیں ڈھلا تھا ۔ فطرت کی سیدھی سادھی فکری حالت پر قانع تھا ، یہ صحیح ھے لیکن عربی زبان کی نوعیت و قدامت کے پیش نظر (دیکھو ترجمان القرآن ، جلد دوم ص ۴۸۷) مولانا نے مفسرین کے اس نظریہ کو کہ عربی کو ” زبانوں کی تخلیق اور نشو و نما کا ایک فوری تحول سمجھنا چاھئے “ مسترد کردیا ھے اور اس بات پر زور دیا ھے کہ عربی زبان ایک نہایت طویل تاریخ رکھتی ھے جو ازمنۂ قبل تاریخ سے شروع ھوتی ھے اور صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ھوئی ھے ۔ بنیادی فرق جو متن میں بتلایا گیا ھے یہ ھے کہ یونانی فلسفہ کے مصطلحات اپنے مفہوم کو ترک نہیں کرسکتے اور عربی زبان کے مصطلحات پیغمبر اسلام (صلعم) کی بعثت سے پہلے بھی ان کے اثر سے بالکل منزہ تھے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل و معنی میں جیسا کہ واقع ھوا تھا ، ٹھیک ویسا ھی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ھوئی ۔ صحابۂ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ھی اس کی حقیقت پالیتے تھے ....

جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ھو کہ اس کا مطلب کیا ھے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ھو ۔ قرآن تیئیس برس کے اندر بتدریج نازل ھوا ۔ وہ جس قدر نازل ھوتا تھا ، صحابۂ کرام سنتے تھے ، نمازوں میں دھراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ھوتا تھا خود پیغمبر اسلام (صلعم) سے پوچھ لیتے تھے ۔ ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ھوئے اور خود پیغمبر اسلام (صلعم) نے اس کی شہادت دی ۔ مذھبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں ، بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ھونی چاھئے ۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا ۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری مؤثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کردیں اور سلف کی

صریح تفسیر کے خلاف ہر گوشہ میں قدم اٹھادئے ۔ کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں ، لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے" حالانکہ خود سلف کا اپنی نسبت یہ اعلان تھا کہ "ابرھم قلوبا و اعمقھم علما" نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات الجھتے الجھتے بالکل نا قابل حل بن گئی۔۔۔

تفسیر قرآن کا پہلا دور وہ ہے جب علوم اسلامیہ کی تدوین و کتابت شروع نہیں ہوئی تھی ۔ دوسرا دور تدوین و کتابت سے شروع ہوتا ہے ۔۔۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ابھی دوسرا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یہ جامہ قرآن کے لئے بننا شروع ہو گیا لیکن اس کا منتہی بلوغ فلسفہ و علوم کی ترویج و اشاعت کا آخری زمانہ ہے ۔ یہی زمانہ ہے جب امام فخرالدین رازی (سنہ ۱۱۵۰ تا سنہ ۱۲۱۰ ء) نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس وضعیت سے آراستہ ہو جائے ۔ اگر امام رازی کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقینا بے کار ہو جاتا ۔۔۔

یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی ۔ منطق اور فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں ، عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے ۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفۂ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی ۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کے معانی وہ نہیں ہوسکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پائے ، لیکن اب ان کے وہی مفہوم لئے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں ۔ چنانچہ خلود ، احدیت ، مثلیت ، تفصیل ، حجۃ ، برھان ، تأویل و غیرہ نے وہ معانی پیدا کر لئے جس کا صدر اول میں کسی سامع قرآن کو وھم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا ۔

اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہئیے، چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکایا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں ....

ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم و فنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ پر فخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ علمائے حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے اور کبھی یہ بات گوارا نہ کی کہ اسلام کے عقائد و مسائل ان سے اثر پذیر ہوں۔ لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کی دروازہ سے نہیں آتی، اس کے نفسیاتی مؤثرات کے بے شمار دروازے ہیں اور جب کھل جاتے ہیں تو کسی کے بند کئے نہیں بند ہوسکتے۔ ان کے استیلاء سے عقائد و اعمال محفوظ رکھے جاسکتے ہیں اور علمائے حق نے محفوظ رکھے، لیکن دماغ نہیں محفوظ رکھے جاسکتے تھے اور محفوظ نہیں رہے۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہوگیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہوگئی۔ اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا تھا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کرکے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہوکر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے!

رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ کسی متداول

تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں - بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے! ...

متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو، جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا، جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہوگا لیکن اسے نظر انداز کردیں گے۔ ۱"

یہ رائے گو سخت نظر آتی ہے تاہم اصلا صحیح ہے۔ مسلمانوں کی فکر دینی کم و بیش جامد سی ہوگئی تھی -- البیرونی نے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں مسلمانوں کے علوم کے متعلق وہی خیال ظاہر کیا تھا جو اب مولانا کا ہے اور اس نے کہا تھا کہ اس وقت علمی ترقی ناممکن سی تھی۔

فکر کے اس جمود --- یا جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں، اجتہاد کے دروازہ کے بند ہوجانے -- کے اسباب و وجوہ کی تحقیق کی جانی ضروری ہے - اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفات کے وقت (سنہ ۷۱۴ء) اسلام کے حدود ایک طرف تو ہسپانیہ تک اور دوسری طرف چین کی سرحدوں تک پھیل چکے تھے - اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظم و نسق کے ایک متحدہ نظام کا قیام رعایا کے لئے معاشی اور مادی نقطۂ نظر سے قطعا مفید تھا اور یہی اصل باعث تھا متعدد عظیم الشان حکومتوں کے تسلسل کا --- امویہ، عباسیہ، غزنویہ، سلجوقیہ، خوارزمیہ، تاتاریہ، تیموریہ --- یہاں تک کہ سولھویں صدی میں یورپ اور ایشیا دونوں مقامات میں قومی تحریک کا آغاز ہوا - جب ایک شاہی خاندان کا اس کی اپنی نااہلیت کی وجہ سے زوال ہوا تو رائے عامہ نے اس کی جگہ ایک نئے شاہی خاندان کو مستقل بنیاد پر قائم کرنا چاہا۔

(۱) ترجمان القرآن، دیباچہ ص ۱۰ تا ۱۶ ۔

ایک مرکزی حکومت ھی تجارت کے راستوں کی حفاظت کرسکتی تھی جو تین یا چار ماہ کے سفر کے راستے ھوتے ۔ اکثر ملکوں میں بہت ھی کم تجارتی اشیاء پیدا ھوتی تھیں اور یہ اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے تجارت کے محتاج تھے ۔ اسلام نے اس پورے خطہ کو عربی ، ایک متمدن زبان کی حیثیت سے عطا کی اور شریعت اسلامیہ نے خصوصی قانون کا وہ بہترین نظام دیا جو قرون وسطی میں ممکن تھا ۔ چھوٹے بڑے شہر ، جن کو اسلامی زندگی اور تمدن کے مرکز قرار دیا جاسکتا ھے ، اپنی روزانہ غذا کے لئے سڑکوں کی سلامتی اور حفاظت کے محتاج تھے کیوں کہ ان میں اور غلہ پیدا کرنے والے علاقوں میں کافی فاصلہ ھوتا ۔ قرون وسطی کے بہت سارے قانون دانوں کا یہ خیال تھا کہ '' اسلام کا شکوہ '' شہروں ھی کی حد تک محدود تھا ۔

امیر معاویہ نے دو سیاسی اداروں کی بنا ڈالی ۔۔ موروثی شخصی حکومت اور سرکاری یا ضابطہ پرست حاکمانہ جماعت جس کے افراد کا نصب و عزل بادشاہ کیا کرتا تھا ۔ ایک تیسرا ادارہ بھی اپنے وقت معینہ پر قائم ھوگیا اور وہ حکومت کے پروردہ علماء کی جماعت تھی ۔ ان تینوں اداروں کے باھمی تعلق پر میں نے کسی اور جگہ روشنی ڈالی ھے ۔ ان سے قرآن واقف نہیں ، تاھم آیات قرآنیہ کی تاویل کر کے ان کے وجود کو حق بجانب ثابت کرنا تھا ۔ ان تاویلات نے اسلام کی وسعت کو محدود کردیا ۔ لیکن قرون وسطی کا اھم مسئلہ '' امن و سلامتی کی تلاش '' تھا ۔ عہد حاضر کے بہترین مفکرین اور قائدین انسان کے ذھن اور اس کے مادی ماحول کے ایک خاص ارتقاء کے نتیجہ کے طور پر تمدنی و معاشی امن و امان کی تلاش کرتے ھیں ۔ قرون وسطی کے بسنے والے ھمارے اسلاف نے امن و سلامتی کو ایک غیر متغیر و جامد معاشرہ میں پانے کی کوشش کی ۔ اگر ایک حکمراں شاھی سلسلہ کو ختم کر کے ایک غاصب خود حکمراں بن جاتا ھے اور

ایک نئی حکمراں جماعت بناتا ہے تو چند خاندان تو ضرور تباہ ہو جاتے ہیں لیکن قوم کی معمولی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا ۔ لیکن ”تصورات“ کا یہ رنگ نہیں ہوتا ۔ جب قرآن کے بنیادی اصول اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے والی مختلف قوموں کی روایات اور ان کے مختلف تمدن اور دوسرے بہت سارے دوسرے عناصر میں باہمی تنازع وتخالف سا پیدا ہوا تو ان کے درمیان ایک قسم کی مصالحت کی کوشش کی گئی ۔ یہی مصالحت تقلید کی شاہراہ ہے ۔ مقلدین کا بنیادی اصول یہ تھا کہ فکر اسلامی کے کسی دائرہ میں کوئی نئی چیز داخل ہونے نہ پائے ، کیوں کہ ہر نئی چیز معاشرہ کے وجود کے لئے ایک خطرہ ہوسکتی ہے !

اسی اصول کی بنا پر ، جو شعوری سے زیادہ تحت شعوری طور پر کام کر رہا تھا ، سائنس کو سحر ، کیمیا گری وغیرہ کے ساتھ ممنوع قرار دیا گیا ۔ قرآن کی محض تلاوت پر زور دیا گیا خواہ آپ اس کے معنی سمجھیں یا نہ سمجھیں ۔ قرآن کا مطالعہ اپنے نفس کی ہدایت اور روحانی ترقی کے لئے تو محمود قرار دیا گیا ، لیکن قرآن کی توجیہ یا تفسیر خطرناک سمجھی گئی ۔ تمام مصنفوں کو پابند کیا جاتا تھا کہ وہ کسی ایک خاص مکتب خیال کی پیروی کریں ....

جدت یہ نہیں کہ قرون وسطی کے اس دینیاتی نظام کی مذمت کی جائے ، اس کی قباحتیں تو خود ظاہر ہیں ، جدت تو وہ ہے جو مولانا نے اس کی جگہ خود ایک چیز پیش کرنے کی کوشش کی ۔ مولانا آزاد حقیقت میں ایک ترقی پسند انقلابی مفکر ہیں اور حقیقی آزادی یا حریت پر یقین رکھنے والے انسان ، لیکن انُ کو علماء کے زمرہ میں اس لئے داخل کیا جاتا ہے کہ وہ علم دین رکھتے ہیں اور دوسرے علماء پر فائق ہیں ۔ وہ ایک قوم پرست (نیشنلسٹ) بھی ہیں ، کیوں کہ ان کا یہ ایقان تھا کہ قرآن مذہبی منافرت نہیں سکھلاتا بلکہ شفقت

کی تعلیم دیتا ھے اور افراد انسانیہ کے درمیان، باوجود ان کے مذاھب کے اختلاف کے صحیح اخلاقی تعلقات قائم کرتا ھے ۔ چنانچہ مولانا فرماتے ھیں:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر ونظر کا موضوع رھا ھے ۔اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ھیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ھیں ۔ تفاسیر وکتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ھے، میں کہہ سکتا ھوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزرچکا ھے اور علوم قرآن کے مباحث ومقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذھن نے تغافل اور جستجو نے تساھل کیا ھو ۔

علم و نظر کی راھوں میں آج قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ھیں، لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ھے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ھے اس کے لئے اپنی راھیں آپ نکال لیں ۔ میرے لئے وقت کی جدید راھیں بھی ویسی ھی دیکھی بھالی ھیں جس طرح قدیم راھوں میں گام فرسائی کرتا رھا ھوں

رھا ھوں رند بھی میں اور پارسا بھی میں
میری نظر میں ھیں رندان و پارسا اک ایک!

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اول روز ھی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ھوسکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا

ھیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ھے جس میں شک کے

سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں، اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سر چشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا

راہے کہ خضر داشت ز سر چشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ‌ایم ما!

اس تمام عرصہ کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں، میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے!

سبک ز جائے نگیری، کہ بس گراں گہر ست
متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی!۔ ۱''

ترجمان القرآن کی صرف دو جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں ایک دیباچہ ہے، سورۃ الفاتحہ کی تفسیر ہے اور اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ ۲

---

(۱) ترجمان القرآن، جلد اول ص ۱۹

(۲) سورۃ الفاتحہ صرف سات آیات پر مشتمل ہے۔ مولانا نے ان کی جو تفسیر لکھی ہے وہ مختلف و متنوع عنوانات پر حاوی ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ میرے محترم دوست مولوی سید اشفاق حسین صاحب نے کیا ہے (جنہیں اس کو مولانا سے پڑھنے کا موقع ملا ہے)۔ اس کا نام Spirit of Islam ہے اور ایشیا پبلشنگ ہوز، بمبئی نے سنہ ۱۹۵۸ء میں اس کو شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب نے بھی اس کی تلخیص انگریزی زبان میں کی ہے، اس کا نام Basic Concept of the Qurān ہے۔ مولانا ہی کی خواہش سے یہ کتاب لکھی گئی تھی جس کو انہوں نے پسند بھی فرمایا تھا.

باوجود اس امر کے کہ یہ تفسیر مکمل نہیں تاہم اسلامی ادب میں یہ ایک بے نظیر کتاب سمجھی جاتی ہے، مولانا سلیمان ندوی مرحوم نے ترجمان القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''مسلمانوں نے قرآن پاک کی تفسیریں بہت لکھیں اور شاید ایک بھی نہیں لکھی۔ شاید اس لئے کہتا ہوں کہ سلف کی تفسیریں ناپید ہیں، اس لئے ان پر حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہے۔ بہر حال کتب تفسیر اور علماء کی تفسیری تصنیفات جہاں تک نظر سے گزری ہیں، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم اور خاص ادب و اعجاز کے لحاظ سے ابوالفتح عبدالکریم موصلی (مصنف المثل السائر) اورمتأخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ سے بہتر قرآن کے محقق نگاہ میں نہیں جچے۔

علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی مستقل تفسیریں تو ناپید ہیں، لیکن یوں ان کی ہر تصنیف قرآن پاک کی تفسیر کا ایک ٹکڑا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ ابن تیمیہ کی تفسیر سورۂ اخلاص، معوذتین اور سورۂ نور الگ بھی چھپ گئی ہیں اور حافظ ابن قیم کی اقسام القرآن، مفتاح دار السعادۃ اور ابھی حال میں بدائع الفوائد چھپ گئی ہے۔ ان کتابوں سے ان بزرگوں کی طرز تفسیر کا پتہ بخوبی چلتا ہے۔

بات یہ ہے کہ عموما تفسیریں دو ہی قسم کی لکھی گئی ہیں، یا محض روایتی و نقلی، جیسے ابن جریر طبری، ثعالبی، قرطبی، بغوی، ابن کثیر وغیرہ، یا تمام تر عقلی جیسے تفسیر کبیر، ابومسلم نیشاپوری، راغب اصفہانی، امام رازی نیشاپوری، مدارک، بیضاوی وغیرہ۔ لیکن ایسی تفسیریں جن میں عقل و نقل کی پر احتیاط آمیزش ہو اور جن میں اگر روایتیں ہوں تو وہ بھی روایت و درایت سے پوری، اور عقلیات ہوں تو افلاطون اور ارسطو کی پیروی سے آزاد، اگر لکھی گئی تو علمائے اسلام میں یہ سعادت علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی...

مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ھے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباھی کا راز فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا؛ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفۂ یونان و فرنگ کی ذھنی غلامی کو قرار دیا اور نسخۂ علاج وھی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل و فلسفہ سے سمجھنا چاھئے۔۔۔۔

سورۂ بقرہ سے لے کر انعام تک کی تفسیر نہیں بلکہ تفسیری ترجمہ ھے اور اسی کا نام "ترجمان القرآن" ھے، ۔۔۔۔ یہ تو مشکل ھے کہ ھر شخص دوسرے شخص سے ھر مقام پر اتفاق رائے کرسکے، تاھم بحیثیت مجموعی ترجمہ صحیح، دلنشیں، مؤثر اور باوقار ھے۔ ترجمان القرآن وقت کی اھم چیز ھے، ضرورت ھے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے۔۔۔ ـ۱"

میں نے اس تبصرہ کا اقتباس کچھ تو اس لئے یہاں پیش کیا ھے کہ یہ قدیم رجعت پسند مسلک کے ایک بڑے عالم کا لکھا ھوا ھے جس نے ھندوستان کے مسلمانوں کو ان کے ابتلاء کے وقت چھوڑ دیا تھا، اور کچھ اس لئے بھی کہ اس سے وہ فرق نمایاں طور پر واضح ھوجاتا ھے جو مولانا آزاد میں اور قدیم مسلک ــــ مولانا شبلی کے مسلک ــــ کے بڑے سے بڑے ترقی پسند علماء میں پایا جاتا ھے۔ بنیادی طور پر یہ تبصرہ صحیح بھی نہیں۔ فتنۂ تاتار پر بحث کا یہ مقام نہیں لیکن علاء الدین خوارزم شاہ اور اس کے عمال کو چنگیز خاں کے مقابلہ میں جو شکست ھوئی وہ اس وجہ سے نہیں ھوئی کہ انہوں نے

---

(۱) ابو الکلام آزاد، مرتبہ عبداللہ بٹ سکرٹری آل پنجاب مسلم اسٹوڈنس فیڈریشن لاھور ص ۸۲ تا ۸۵۔

فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کی تھی ۔ علاوہ ازیں تاتاری افواج کی پیش قدمی کو بالآخر مصر کے بربری اور علاء الدین خلجی نے روکا تھا۔ علمائے سوء نے تو چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے آگے سر اطاعت خم کردیا تھا اور اس کے صلہ میں گراں قدر عطیے حاصل کئے تھے ۔ امام ابن تیمیہ اس مسلک یا اس نظریۂ حیات کے بانی سمجھے جاتے ھیں جو بعد میں ''وھابیت'' کہلایا ۔ (کذا قال المصنف!) اس مسلک کی تبلیغ کی وجہ سے انہوں نے مسلم حکمرانوں اور مسلم عوام کالانعام دونوں کے ھاتھوں بڑی اذیتیں برداشت کیں ۔ مولانا آزاد نے اپنے تذکرہ میں ابن تیمیہ کی بڑی تعریف کی ھے لیکن ان کے عقائد کی نہ انہوں نے توضیح کی ھے اور نہ حمایت ۔ اگر سر سید کے مسلک والوں نے علوم جدیدہ کو برطانوی شہنشاھیت کی غلامی کے ساتھ قبول کرکے غلطی کی تھی تو شبلی مسلک کے پیروؤں نے بھی علوم جدیدہ کی کامیابیوں کا دینیاتی ھتیاروں سے مقابلہ کرکے اور سیاسیات سے علحدہ رہ کر اتنی ھی بڑی غلطی کی ۔ مولانا آزاد نے خود ان دو میں سے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا ۔ قرآن کی تفسیر و توجیہ میں انہوں نے فکر یونان کی پیروی پر ضرور اعتراض کیا ، لیکن یونان کے فلسفہ ، سائنس ، فن موسیقی ، تمدن کو انسانی ترقی کی ایک منزل اور نہایت بلند منزل قرار دینے پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ۱ ۔ نیز مولانا اپنی

(۱) دیکھو غبار خاطر ، مکتوب ۱۶ ستمبر سنہ ۴۳ء جہاں مولانا موسیقی سے اپنے ذوق کا اظہار کرتے ھوئے فرماتے ھیں ''میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ھر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ھوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا'' ۔ اسی خط میں انہوں نے اس امر پر افسوس کیا ھے کہ مسلمانوں نے یونانیوں سے بہت کم سیکھا: ''ابو ریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ھندوؤں کے تمام علوم و عقائد پر نظر ڈالی ھے اور ایک باب فی کتبھم فی سائر العلوم پر بھی لکھا ھے ، مگر موسیقی کا اس میں کوئی ذکر نہیں'' ۔ ''خود یونان کے=

عمر کے کسی حصہ میں کبھی یورپی علوم کو، ریاضیات سے لے کر اثریات یا علمِ آثار قدیمہ تک، کامل طور پر قبول کرنے پر معترض نہیں ہوئے کیوں کہ ان سب کا تعلق کلی انسانی اقدار سے ھے - جس غیر معمولی قوت اور ترقی پسند جذبہ کے ساتھ انہوں نے ھندوستان کی وزارت تعلیم و سائنسی تحقیقات کی رہنمائی فرمائی وہ خود اس واقعہ کا ایک کامل ثبوت ھے - میں یہ سمجھنے سے بالکل معذور ہوں کہ مولانا

= فنون ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ھی تغافل برتا - یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انہیں بہت کم خبر تھی - ھومر اور سوفوکلیس وغیرہ کے نام انہیں ارسطو کے مقالات اور فلاطون کی جمہوریت سے معلوم ہو گئے تھے، لیکن اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ کر سکے - ابن رشد نے "کامیڈی" اور "ٹریجڈی" کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ھے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ھے کہ یونانی ڈرامہ کی حقیقت سے اس کا دماغ کس درجہ ناآشنا تھا - وہ کامیڈی کو مدح، اور ٹریجڈی کو ھجو سے تعبیر کرتا ھے، یہ بات بھی صاف نہیں کہ یونانی فن بلاغت سے ائمہ بلاغت عرب کہاں تک متأثر ہوئے تھے - بظاہر انہوں نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا - ارسطو کے مقالات اور شاعری پر اس کا رسالہ دونوں عربی میں منتقل ہو گئے تھے اور ابن رشد نے اپنی شروح میں انہیں بھی شامل کیا تھا - لیکن عرب ائمہ فن نہ تو اس کی روح سمجھ سکے اور نہ بلاغت عربی کی سرگرانیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے - ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ھے وہ تمامتر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ھے اور عربی دماغ اس سے آشنا نہ تھا" (ص ۳۱٦ تا ۳۱۷) یہ کہنا غیر ضروری ھے کہ عرب فن تعمیر اور نقاشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں یونانیوں کے کارناموں سے بالکل ناواقف رھے - یہاں جو قابل غور نکتہ ھے وہ یہ ھے کہ عربوں نے یونانی تہذیب کا جو مطالعہ کیا اس پر اعتراض کرنے کی بجائے مولانا اپنے تأسف کا اظہار کر رھے ھیں کہ انہوں نے اس تہذیب کے چند =

ابن تیمیه سے یا قرون وسطی کے کسی مصنف سے کیا استفادہ کرسکتے ہیں ۔ مولانا کی کتاب ترجمان القرآن گو اپنے اخلاقی و روحانی عقائد کو قرآن کریم سے اخذ کرتی ہے تاہم اس کی جولان گاہ یہ جدید دنیا ہے جس میں برق پارے ذروی مراکز کے اطراف گھوم رہے ہیں اور جس میں ڈارون کے نظریہ انتخاب فطری کو تسلیم کرلیا جاتا ہے ۔ مولانا تاریخ عالم اور مذاہب متقابلہ کے عالم ہیں اور یہ دونوں مضامین سے قرون وسطی کے علماء ، مشرق اور مغرب ، دونوں مقامات پر ناواقف ہیں ۔

سورۂ فاتحہ تمام قرآن کا خلاصہ ہے ۔ سات آیتوں کی اس ابتدائی سورت پر مولانا نے جو تفسیر لکھی ہے اس میں قرآن حکیم کے سارے بنیادی اصول بیان کردئے گئے ہیں ۔ یہ ایک بے نظیر تصنیف ہے لیکن چوں کہ اس کی اچھی تلخیص ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب اور مولوی اشفاق حسین صاحب نے انگریزی زبان میں کردی ہے اس لئے میں یہاں صرف چند اہم نکات کا ذکر کروں گا ۔

" وحدت ادیان " کے متعلق مولانا کے خیال کی اس طرح توضیح کی جاسکتی ہے :

۱ ۔ وجود باری کا عقیدہ تمام مذاہب میں موجود ہے ۔ یہ بنی نوع انسان کا مشترک ورثہ ہے ۔ خدا کی عبادت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے ۔ تمام مذاہب اسی صداقت کی تعلیم دیتے آئے ہیں ۔

۲ ۔ مذہبی فرقوں کے باہمی اختلافات صرف تین چیزوں میں نظر آتے ہیں : (الف) صفات الہیہ پر مختلف پیرایوں میں اصرار (ب) عبادت کے طریقوں کا فرق اور (ج) شریعتوں کا اختلاف ۔

ان اختلافات کا باعث کچھ تو زمان و مکان کا اختلاف ہے اور کچھ ذہن انسانی کے مراتب کا ارتقا ہے ۔ وجود باری تعالی کے متعلق کسی کو کوئی نئی بات کہنی نہیں ہے ۔ اس بارے میں انبیاء کے پیغام وہی ایک ہیں ۔ خدا کی ذات بحث عقل انسانی کی پہنچ سے ماوراء ہے ۔

= گوشوں ہی کے مطالعہ پر اکتفا کیا !

مولانا نے سر آلیور لاج کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کیا ھے:
"ذرہ کا وہ مرکزہ جو برق کی مثبت باروں سے بنا ھے اس کے اطراف برقیوں کی حرکت سے لے کر آفتاب کے اطراف سیاروں کی گردش تک، ھر چیز ایک قانون مقدر کی طرف اشارہ کر رھی ھے" لیکن یہ قانون مقدر مولانا کی نگاہ میں مادی علل و معلولات کا محض ایک سلسلہ نہیں بلکہ ایک کائناتی یا اخلاقی قانون ھے - یا قرآن کے الفاظ میں فطرۃ اللہ ھے، مقصد الہیہ کا قانون - خدا دنیا کی ھدایت کر رھا ھے - اصل خلیہ اور زندہ مخلوقات کے ظہور سے پہلے اعلی و بلند تر درجوں کی طرف ارتقاء کا تقاضہ پایا جاتا ھے - ۱ "لیکن جب حیات کا پہلی مرتبہ ظہور ھوتا ھے تو ھم اس عمل کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ھیں - ھدایت الہیہ جس کے لئے قرآنی الفاظ ھدی اور وحی ھیں ادنی مخلوقات کی بھی وجدان کی صورت میں رھبری کر رھی ھے - یہ تجربہ سے سیکھ کر اس مکسوبہ علم کو اپنی اولاد تک پہنچانے کی قابلیت کا نام ھے - اعلی حیوانات میں ھدایت الہیہ حواس اور عقل کے ذریعہ رھبری کرتی ھے - ۲، انسانوں کو جنہیں قانون اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مکلف کیا گیا ھے،

---

(۱) غبار خاطر، مکتوب ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

(۲) یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ھے کہ مولانا نے یہاں ھدایت سے وہ وسیع معنی مراد لئے ھیں جو قرآن میں استعمال ھوے ھیں لیکن جن کو بعض مفسرین نے نظر انداز کر دیا ھے - مثلاً قرآن ایک مشہور آیت میں کہتا ھے کہ خدا نے شہد کی مکھی کو وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں پر اپنا مکان بنائے - اسی قبیل کی دوسری آیتیں بھی مولانا نے نقل کی ھیں (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۷۹)

ربنا الذی اعطی کل شیء خلقه ثم ھدی (۲۰، ۵۰) =	ھمارا پروردگار جس نے ھر چیز کو اس کی بناوٹ دی اور پھر اس پر راہ عمل کھول دی -

انبیاء و مرسلین کے ذریعہ ہدایت کی جاتی ہے ۔ مولانا ، ڈارون کا نظریہ تنازع للبقاء اور بقائے اصلح (جس کو وہ بقائے انفع سے تعبیر کرتے ہیں)

= الذی خلقنی فہو یہدین (۲۶، ۸۰) — جس پروردگار نے مجھے پیدا کیا ، وہی میری ہدایت کرے گا ۔

و الذی قدر فہدی (۸۷، ۲) — وہ پروردگار جس نے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر راہ عمل کھول دی ۔

صاف ظاہر ہے کہ انبیاء کو جو وحی کی گئی وہ اس ہدایت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالی نے اپنی دوسری مخلوقات کو ان کے وجدان ، حواس اور عقل وغیرہ کے ذریعہ رہنمائی فرمائی ۔

پھر مولانا اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں مشرکین قریش کو خطاب کیا گیا ہے :

قل هل من شرکائکم من یہدی الی الحق ، قل اللہ یہدی للحق افمن یہدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یہدی الا ان یہدی فما لکم کیف تحکمون (۱۰، ۳۵) — ان سے پوچھو " کیا تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو حق کی راہ دکھاتا ہے پھر جو حق کی راہ دکھائے وہ اس کا حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہیں پاتا جب تک اس کو راہ نہ دکھائی جائے ! تم کیسے فیصلے کر رہے ہو !

اور مولانا فرماتے ہیں : " یہ مقام قرآن کے مہمات دلائل میں سے ہے اور ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے ۔ چوں کہ اس آیت میں ہدایت ، اور حق ، کے الفاظ آئے ہیں ، اس لئے مفسرین نے خیال کیا کہ ہدایت سے مقصود ہدایت وحی ہے اور حق سے مقصود دین حق ۔ فارسی اور اردو کے تمام مترجموں نے بھی انہی کی پیروی کی ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے استدلال کی ساری حقیقت مفقود ہو گئی ۔ اس طرح کے تمام مقامات دیکھ کر سخت =

بھی مانتے ھیں لیکن اس کے لئے ھدایت الہیہ کا ھونا ضروری سمجھتے ھیں ۔ کیوں کہ ھدایت الہیہ کے مفروضہ کے بغیر انواع حیوانی کا ارتقا سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ مولانا فرماتے ھیں کہ قانون انتخاب فطرت کا اطلاق انسانی معاشرہ پر بھی ویسا ھی ھوتا ھے جیسا کہ انواع حیوانی پر ۔ جس طرح فطرت نفع بخش انواع کو باقی رکھتی ھے اور غیر نافع انواع کو ھلاک کردیتی ھے اسی طرح وھی معاشرے باقی رکھے جاتے ھیں جن کا تحفظ نوع انسانی کے لئے نفع بخش ھوتا ھے ۔ غیر نافع محو کردئے جاتے ھیں ۔ خدائے تعالی اس کو اپنی رحمت قرار دیتا ھے ، اگر ایسا نہ ھوتا تو بنی نوع انسان میں ظلم و فساد کو دفع کرنے کی کوئی صورت نہ ھوتی ۔

جیسا کہ سب ھی جانتے ھیں کہ قرآن کی تعلیمات تاریخ انسانی کا ایک وسیع تصور پیش کرتی ھیں ، اس کا خلاصہ مولانا کی زبان میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ھے : " قرآن کہتا ھے کہ ابتداء میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے ، ان میں نہ تو کسی طرح

= حیرانی ھوتی ھے کہ متأخرین کا معیار نظر و مطالعہ کیوں اس درجہ پست ھو گیا تھا کہ قرآن کے صاف وصریح مطالب سے بھی آشنا نہ ھوسکے ۔ علاوہ بریں یہ ظاھر ھے کہ یہاں خطاب مشرکوں سے ھے جو سرے سے وحی و دین کے منکر تھے اور مقام استدلال کا ھے ۔ پھر اگر ھدایت سے مقصود ھدایت وحی و دین ھو تو اس میں ان کے لئے دلیل کی بات کیا ھوئی ؟ جب وہ وحی و دین کی ھدایت مانتے ھی نہیں تو پھر اس ھدایت سے ان پر دلیل کیونکر لائی جاسکتی ھے ! ... اصل یہ ھے کہ ان بزرگوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت ھی گوارا نہ کی کہ قرآن میں ھدایت کا لفظ کن کن معنوں میں استعمال ھوا ھے اور اس کے مختلف مراتب و اشکال کیا کیا ھیں ! ... بہر حال یہاں ھدایت سے مقصود ھدایت وحی نہیں بلکہ وجدان حواس و عقل کی ھدایت ھے اور حق سے مقصود دین حق نہیں ھے بلکہ لغوی حق ھے یعنی سچا راستہ درست راستہ " (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۱۷۹)

کا باھمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت۔ سب کی زندگی ایک ھی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یگانگت پر قانع تھے۔ پھر ایسا ھوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ھوگئیے، اور اختلافات نے تفرقہ وانقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کرلی۔ ھر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ھر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ھوئی تو ضروری ھوا کہ نوع انسانی کی ھدایت اور عدل وصداقت کے قیام کے لئے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ھو، چنانچہ یہ روشنی نمودار ھوئی اور خدا کے رسولوں کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ قائم ھو گیا۔ وہ ان تمام رھنماؤں کو جن کے ذریعہ اس ھدایت کا سلسلہ قائم ھوا ''رسول'' کے نام سے تعبیر کرتا ھے، کیوں کہ وہ خدا کی سچائی کا پیغام پہنچانے والے تھے اور رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ھیں۔ ۱''

مولانا فرماتے ھیں کہ ''جب ھم انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کو پیش نظر رکھ کر خدا کے متعلق انسان کے تصورات کا جائزہ لیتے ھیں توھیں ان تصورات میں ایک عقلی ارتقا نظر آتا ھے۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ جیسے جیسے انسان کے مادی تعقلات میں ترقی ھوئی ھے ویسے

---

(۱) ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۱۸۱: قرآن نے جابجا یہ بات واضح کردی ھے کہ ھدایت وحی کا ظہور جمعیت بشری کا عالمگیر واقعہ ھے اور کوئی قوم نہیں جس میں اللہ کے کسی رسول کا ظہور نہ ھوا ھو۔ ترجمان القرآن کی جلد دوم ص ۲۱۰ پر مولانا اس موضوع پر تفصیل سے بحث کرتے ھیں اور قرآن کی ان آیات کا حوالہ دیتے ھیں: ''ولکل أمة رسول فاذا جاء رسولھم قضی بینھم بالقسط وھم لایظلمون'' (سورہ یونس آیت ۴۷)؛ ''ولقد بعثنا فی کل أمة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت'' (۱۶، ۳۶) ''الم یأتکم نبؤالذین من قبلکم قوم نوح و عاد و ثمود والذین من بعدھم لایعلمھم الا اللہ'' (۱۴، ۹) اور قرآن یہ بھی کہتا ھے =

ویسے خدا کے متعلق اس کے تصورات میں بھی ارتقا ہوا ہے اور یہ ارتقا ادنی سے اعلی کی طرف ہوا ہے۔ ہمارے لئے اس عمل ارتقا کی ابتدائی کڑیوں کا پتہ لگانا مشکل ہے کیوں کہ جوں جوں ہم پیچھے کی طرف ہٹتے جاتے ہیں تاریخ کی روشنی مدھم ہوتی جاتی ہے اور انبیاء کی وحی میں اس کی تفصیلات نہیں ملتیں"

=" ولقد ارسلنا رسلا من قبلك منهم من قصصنا عليك و منهم من لم نقصص عليك" (۴۰، ۷۸)

اور اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول مبعوث کئے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے۔ صرف ان ہی رسولوں کا قرآن نے ذکر کیا ہے جن کا تعلق سامی جماعتوں سے تھا۔

رہنمائے تعلیم

از

جے - سی - گھوش

مولانا آزاد حکومت ہند کے وزیر تعلیمات جنوری سنہ ۱۹۴۷ء سے اپنی زندگی کے آخری دن، ۲۲/فبروری سنہ ۱۹۵۸ء، تک رہے۔ وہ مرتے وقت تک کام کرتے رہے۔ جن مسائل نے ان کے ذہن کو زندگی کے آخری لمحہ تک مشغول رکھا تھا وہ قومی وحدت اور تعلیم کے مسائل تھے، وہ تعلیم جس سے قومی فلاح حاصل ہو، جس سے متوازن ذہن پیدا ہوں اور جس سے ہندوستانیوں میں باہمی اتحاد و اتفاق قائم ہو۔

مولانا نے سیاسی اور تعلیمی مسائل کے بارے میں جس بصیرت سے کام لیا اور ان کے حل میں جو عملی اور دانشمندانہ قدم اٹھائے اس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ جیسا کہ ہمارے وزیر اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا: ''وہ ایک نورانی فراست اور قوی عقل کے انسان تھے''

ہم اس زمانہ سے جس میں مولانا نے ملک کی تعلیمی حالت کو سنوارا اس قدر قریب ہیں کہ ہمارے لئے یہ اچھی طرح سمجھنا مشکل ہے کہ تعلیمی اور قومی تعمیر جدید کے دائرہ میں مولانا کی کامیابیوں کی تاریخی اہمیت کیا ہے۔ یہ گیارہ سال ہندوستان کی تاریخ میں اور خصوصاً اس ملک کی تعلیمی ارتقا کی تاریخ میں نہایت اہم رہے ہیں۔ جامعاتی تعلیمی ماموریہ کا تقرر سنہ ۱۹۴۸ء اور اس کی روئداد سنہ ۱۹۴۹ء؛ ثانوی تعلیمی ماموریہ سنہ ۱۹۵۲ء کا تقرر اور اس کی روئداد سنہ ۱۹۵۳ء؛ فنی تعلیم کی کل ہند مجلس کی تنظیم جدید، جس کی ابتداء ۳۰/ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء میں ہوئی اور آج جس شکل میں وہ ہے؛ سائنسی تحقیقات کے معملوں کا جو سلسلہ اس دور میں قائم ہوا؛ کھڑک پور کے انسٹیٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی (اعلی فنی ادارہ) کا قیام؛ انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس (کل ہند ادارۂ سائنس) کا تیزی سے ترقی کرنا؛ کافی سرمایہ کے ساتھ

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (جامعی عطیات کے ماموریه) کا قیام ---

یہ ھیں اس دور کے چند درخشاں کارنامے!

یہ کہنا کسی طرح مبالغہ آمیز نہیں خیال کیا جاسکتا کہ ان دس برسوں میں فنی تعلیم کی توسیع کے لئے جو حیرت انگیز کوششیں کی گئیں انہیں مولانا کی بصیرت اور ان کی زبردست شخصیت نے وحدت مقصد عطا کیا - اپنی موت سے صرف دو ھفتے پہلے --- ٦/ فبروری سنہ ١٩٥٨ء - انہوں نے مرکزی مشاورتی مجلس تعلیمات کے ایک جلسہ کو مخاطب کیا اور اپنی اس آخری تقریر میں فرمایا:

"جب میں نے سنہ ١٩٤٧ء وزارت تعلیمات کا جائزہ لیا تو فورا یہ محسوس کیا کہ ھمارے تعلیمی مسائل کا کوئی حل مرکز اور صوبوں کے کامل اشتراک عمل کے بغیر حاصل ھو نہیں سکتا - اس میں شک نہیں کہ تعلیم ایک صوبائی موضوع ھے لیکن یہ میری سوچی سمجھی رائے تھی کہ یہ امتیاز تو اس وقت قائم کیا جانا چاھئے جب ھمارے تعلیمی منصوبے مکمل ھولیں - اس وقت تک مرکزی حکومت کو علی الاعلان یہ تسلیم کرلینا چاھئے کہ گو تعلیم ایک صوبائی موضوع ھے تاھم اگر زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل کرنی ھے تو اس کا صوبہ واری حکومتوں کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ھے -"

مولانا نے اپنی تمام تقریروں، نیز ان ھدایتوں میں جو وزارت تعلیم کے نام جاری کی گئیں، اس ضرورت پر زور دیا کہ اس سلسلہ میں سب مل کر منظم طریقے سے کام کریں - راہ کی مشکلات بہت زیادہ تھیں: مالیہ کا فقدان، موزوں اشخاص، ساز و سامان اور عمارتوں کی قلت، لیکن مولانا کے غیر متزلزل ارادہ نے ان ساری مشکلوں پر قابو پالیا - اپنی ٦/ فبروری سنہ ١٩٥٨ء والی آخری تقریر میں وہ فرماتے ھیں:

"ان تمام مشکلات کے باوجود اس سلسلہ میں جو ترقی ھوئی ھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ھے کہ جب میں نے جائزہ

لیا تھا تو تعلیم کے لئے مرکزی موازنہ میں صرف دو کرور کی رقم مہیا کی گئی تھی اور آج یہ تیس کرور سے بھی کہیں زیادہ ھے - مالی تعین ھی میں اضافہ نہیں ھوا ، بلکہ ھر قسم کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ھوا ھے" مرکزی مشاورتی مجلس تعلیمات کے چودھویں جلسے میں جو نئی دھلی میں ۱۳ اور ۱۵/ جنوری سنہ ۱۹۴۸ء کو ھوا (اور یہ اسی سال ھوا جب مولانا نے وزارت تعلیمات کا قلمدان حاصل کیا) انہوں نے فرمایا تھا :

" تاریخ کے لحاظ سے یہ چودھواں اجلاس ھے کیوں کہ اس سے پہلے تیرہ جلسے ھوچکے ھیں - لیکن صحت کا اگر زیادہ خیال رکھا جائے تو میری رائے میں اس اجلاس کو مجلس کا افتتاحی اجلاس کہنا چاھئے ، کیوں کہ گزشتہ تیرہ اجلاس اس مملکت ھند میں ھوئے تھے جس کا ۱۵/ اگسٹ سنہ ۱۹۴۷ء کو خاتمہ ھوگیا اور اس کے ساتھ تاریخ ھند کا ایک طویل باب بھی ختم ھوچکا - آج ھم ایک نئے ھندوستان میں جمع ھوئے ھیں جس کی تاریخ تو ابھی بنی ھے !"

اسی جلسے میں انہوں نے وزیر اعظم سے خواھش کی کہ مجلس کے اجلاس کا افتتاح کریں - اس جلسے میں تعلیمی ضروریات پر ایک وسیع نظر ڈالتے ھوئے وزیر اعظم نے فرمایا :

" مجلس کا دوسرا کام یہ ھے کہ حکومت کو مشورہ دے کہ (مثلا) سائنٹفک میان پور کیٹی کی سفارشات پر کس طرح عمل کیا جائے - صحیح منصوبہ بندی کے واسطے یہ ضروری تھا کہ حکومت یہ جان لے کہ ملک میں اھل ھنر کی تعداد کتنی ھے اور وہ لوگوں کو اھم خدمات کی انجام دھی کے لئے کس طرح تربیت دے سکتی ھے - ھندوستان میں اھل ھنر کا فقدان نہیں لیکن ان کی خدمات سے مناسب طور پر کام نہیں لیا جارھا ھے - بہت سے کام نا تمام حالت میں ھیں کیوں کہ ھم سمجھتے ھیں کہ ان کی تکمیل کے لئے مناسب آدمی نہیں ملتے اور

واقعہ یہ ہے کہ ملک میں بہت سے ایسے قابل لوگ موجود ہیں جن کی خدمات سے استفادہ نہیں کیا جارہا ہے''

وزیر اعظم نے یہ بھی فرمایا کہ:

''ہماری تعلیمی نظام کی صورت گری ہماری آنے والی معاشری و معاشی زندگی سے جدا یا علحدہ نہیں ہونی چاہئے۔ ہماری زندگی اور عمل کے مختلف پہلوؤں میں ارتباط پیدا کیا جانا چاہئے۔ کسی بھی نظام تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے متوازن ذہن پیدا کئے جائیں جو گمراہ نہ ہوسکیں۔ قوم کی تعمیر کے متعلق غور و فکر کرنے سے پہلے ہمیں ذہنی اعتبار سے قوی ہونا چاہئے۔''

وزیر اعظم کا نشان دادہ یہ بلند مقصد، اور مولانا آزاد کی وہ بصیرت یا مدبرانہ نظر جو بلند مقاصد کی تکمیل ممکنہ عجات سے کرنا جانتی تھی، دونوں نے مل کر ان گیارہ سال میں وہ کام کیا جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی دور میں نہ ہوسکا تھا۔ قوم کو اپنی مقدر کا ابھی تازہ شعور ہوا تھا اور مولانا اپنی قوم کے بہترین نباض تھے۔ ہر سال فنی تعلیم کی کل ہند مجلس میں، مرکزی مشاورتی مجلس تعلیمات میں، دولت عامہ کے وزراء تعلیم کی کانفرنسوں میں، اس ہندوستانی قومی کمیشن کے جلسوں میں جو مجلس اقوام متحدہ سے اشتراک عمل کے لئے مقرر کیا گیا ہے، نیز اپنی ان افتتاحی تقریروں میں جو مختلف اداروں کی تاسیس کے وقت مولانا آزاد کیا کرتے تھے، انہوں نے نہایت وقار و متانت، حسن و لطافت کے ساتھ اپنے سننے والوں کے ذہن نشین کیا کہ جو چیزیں پہلے کی جانی چاہئیں ان میں تیزی پیدا کرنے کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے اور ان میں اس امر کا شعور پیدا کیا کہ تعلیم ہی منصوبہ بندی کی کامیابی کی اساس ہے اور فنی تعلیم کو ہر سطح پر رائج کئے بغیر ملک میں صنعتی ترقی ہوسکتی ہے اور نہ اس کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

مرکزی مشاورتی مجلس تعلیمات کے ایک اجلاس میں سنہ ۱۹۵۰ء میں مولانا نے جو کچھ کہا اس سے کام کا وہ خاکہ سمجھ میں آجاتا ھے جو ان کے ذھن میں موجود تھا :

"فنی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے جو لائحہ عمل ھمارے پیش نظر تھا وہ چار اعلی حرفیاتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کی تقویت تھی۔ مالیہ نے اجازت نہیں دی کہ ھم چاروں کا ایک ساتھ قیام عمل میں لائیں، لیکن ھم نے سوچا کہ کام کی ابتدا تو کی جانی ضروری ھے۔ اس لئے بغیر تمام ضروری عمارتوں کی تعمیر کا انتظار کئے کلکتہ سے قریب مشرقی اعلی حرفیاتی ادارہ قائم کیا گیا۔ ابھی کام ھورھا ھے اور مجھے امید ھے کہ آئندہ تعلیمی سال میں ھم اساتذہ و طلباء کے پہلے گروہ کو اس ادارہ میں کام کرتا پائیں گے۔ ساتھ ساتھ ھمارا مقصد یہ بھی ھے کہ موجودہ اداروں کی حالت کو بہتر بنائیں۔ اور ان کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔"

۱۹/ اکٹوبر سنہ ۱۹۴۵ء کو حکومت ھند نے سارجنٹ رپورٹ کی سفارشات کو اصولاً قبول کرلیا کہ فنی تعلیم کی ایک قومی مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ فنی تعلیم کے لئے سہولتیں پیدا کی جاسکیں اور اس سلسلہ کی تمام سرگرمیوں میں ارتباط و انضباط قائم ھو۔ حکومت کی ۳۰/ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء والی تجویز کے مطابق فنی تعلیم کی کل ھند مجلس محض ایک مشاورتی مجلس کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ آنجہانی این۔ آر۔ سرکار اس کے پہلے میر مجلس تھے۔ اس کے دستور میں سنہ ۱۹۵۳ء میں ترمیم کی گئی اور مختلف مفادات کی نمائندگی حاصل کرنے کی خاطر اس کی رکنیت میں توسیع عمل میں آئی۔ مرممہ دستور کی رو سے وزیر تعلیم اس کا بحیثیت عہدہ میر مجلس ھوتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اس مجلس کو پہلی دفعہ ۸/ فبروری سنہ ۱۹۵۳ء میں مخاطب کیا۔ انہوں نے فرمایا :

"وزیر تعلیم کی حیثیت سے مجھے فطری طور پر مجلس کے کاموں سے دلچسپی تھی اور مجھے خوشی ہے کہ اس سے میرا تعلق آئندہ اور بھی زیادہ قریبی ہوگا۔ اس موقع پر مجلس کی تاریخ کے بعض امتیازی کارنامے میرے ذہن میں آتے ہیں۔ آپ واقف ہیں کہ اس مجلس ہی کی تجویز پر حکومت ہند نے ملک کے مختلف حصوں میں انڈر گرایجویٹ اداروں کو قوی اور مضبوط بنانے کا فیصلہ کیا اور انہیں تقریبا ڈیڑھ کرور کی رقم عطیوں کے طور پر دی۔ اسی مجلس کی سفارش پر حکومت نے سرکار کمیٹی کی اس تجویز کو منظور کیا کہ ملک میں حرفیات کے چار اعلی ادارے قائم کئے جائیں۔ صنعتی تربیت کے مختلف منصوبوں کو رو بعمل لا کر صنعتوں اور تعلیمی اداروں کے درمیان قریبی تعلقات پیدا کرنے کی بھی مجلس ذمہ دار ہے۔"

فنی تعلیم کے ارتقا میں مولانا کو کتنی دلچسپی تھی وہ بھی اسی تقریر کے اس اقتباس سے ظاہر ہوگا:

"ایک نہایت اہم سوال جو اب مجلس کی توجہ کا محتاج ہے وہ ایک تفصیلی خاکہ کی تیاری ہے جس کی بنا پر اس سات ارکان والی کمیٹی کی سفارشات کو رو بعمل لایا جاسکے جو اب پنچ سالہ منصوبہ میں شریک کی جاچکی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کمیٹی نے کام کے عام خاص طریقوں کی نشان دہی کر دی ہے لیکن یہ اب آپ کا کام ہے کہ ان طریقوں کا تعین کریں جو ان کو ایک مادی شکل عطا کریں۔ حرفیات کی تعلیم کی سہولتیں طیلسان ہونے کے بعد ناکافی ہیں، گو کھڑک پور اور بنگلور کے دو ادارے ہماری ضروریات کی کسی حد تک تکمیل کرتے ہیں تاہم ہمیں طلباء کی ایک کثیر تعداد کو ملک سے باہر اس تعلیم کے حصول کے لئے بھیجنا پڑتا ہے۔ ملک میں ان سہولتوں کو فراہم کرنا ہمارے توسیع کے نظام العمل میں دوسری سب چیزوں پر ترجیح کے قابل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ان اداروں کو

مستحکم کرنا، جو ھمارے مقاصد کی تکمیل کرسکتے ھیں، نہایت ضروری ھے۔''

مولانا ھمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ حکومت کے مختلف وسائل مقصد کے حصول میں مرتبط طریقہ پر استعمال کئے جائیں۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے مختلف موقعوں پر کہی ھے لیکن زیادہ وضاحت کے ساتھ فنی تعلیم کی کل ھند مجلس کے نویں اجلاس میں کہی جو ۳۰/ اکٹوبر سنہ ۱۹۵۴ء میں منعقد ھوا تھا۔ انہوں نے کہا:

''کچھ عرصہ سے مجھے یہ عام میلان نظر آرھا ھے، اور خصوصا حکومت کے شعبوں میں یہ نمایاں ھے، کہ اپنے عملے کی تربیت کے لئے جداگانہ ادارے قائم کئے جائیں۔ عذر یہ کیا جاتا ھے کہ تربیت کے ان مراکز کے قیام سے کارکردگی زیادہ بڑھ جاتی ھے اور اگر دوسرے موجود مراکز میں تربیت کا انتظام کیا جائے تو یہ بات حاصل نہیں ھوتی۔ میری رائے میں اس بارے میں مزید غور وفکر کی ضرورت ھے اور میں مجلس سے خواھش کروں گا کہ وہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے کہ مختلف تنظیموں کی خاص ضروریات موجودہ اداروں ھی سے پوری ھوجائیں۔ اگر اس کے لئے خاص اسباق، ماھر عملے یا زائد سازوسامان کی ضرورت ھو تو ھمیں ان کا انتظام کرنا چاھئے۔ مجھے یقین ھے کہ اس انتظام سے خود ان تنظیموں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور موجودہ اداروں کو بھی۔ اس سے ان اداروں کا معیار بہتر ھوگا اور انہیں صنعت و حرفت اور دوسرے فنی شعبوں کی ضروریات کا احساس ھوگا۔ مزید فائدہ یہ ھوگا کہ اس طریقہ سے کام زیادہ کفایت کے ساتھ ھوسکے گا۔ تربیت کے جو لائحہ عمل بنائے جاتے ھیں ان کے لئے یہ چیز کچھ کم اھمیت نہیں رکھتی۔ قلیل المدت علم و آموختہ تازہ کرنے والے قلیل المدت اسباق ان ضروریات کو رفع کرنے کے لئے مفید ثابت ھوں گے اور مجھے یقین ھے کہ اس مسئلہ کی طرف مجلس اپنی توجہ ضرور مبذول کرے گی۔''

سنہ ۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں حکومت بنگال نے مشرقی اعلی حرفیاتی ادارے کی تعمیر کے لئے، هگلی (کھڑک پور) میں کچھ زمین پیش کی جس کو وزارت تعلیمات نے قبول کرلیا۔ اس زمین کا رقبہ بارہ سو ایکڑ تھا، اس میں ایک تعلقداری کی عمارت اور بہت ساری اقامت گاهیں تھیں جنھیں تیس سال قبل بنایا گیا تھا اور بعد میں انہیں سیاسی قیدیوں کے حوالات کے طور پر استعمال کیا جارھا تھا۔ آزادی کے حصول کے بعد اس بدنام محبس کو بند کردیا گیا۔ اس ویرانے میں ایک من چلا انجینیر جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں آکر بس گیا، کچھ ماہ بعد خود ناظم اور چھ اساتذہ اس سے آملے۔ وهاں روشنی صرف ایک چراغ کی تھی جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا، اور قانون شکنوں کے خوف سے رات کے وقت کوئی پابند قانون انسان باھر نکلنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ ھم نے محسوس کیا کہ جس قدر جلد اس ادارہ کی یہاں تعمیر ھوجائے گی اسی قدر جلد وہ ظلمت و خطر بھی کافور ھوجائیں گے جو اس ساری فضا پر مسلط تھے۔ تین سو طلباء کے لئے ایک اقامت گاہ کی تعمیر فوراً شروع کردی گئی۔ تعلقداری کی عمارت کے اطراف جو بلند دیواریں تھیں انہیں منہدم کردیا گیا اور خود عمارت کو درس کے کمروں اور دیوان خانوں میں تبدیل کرنے کے لئے از سر نو درست کردیا گیا۔ جست کی قلعی والے لوھے کے چھپر، جو جنگ سے بچے ھوئے ذخیروں سے ملے تھے، اس مقام پر ڈال دئے گئے تاکہ کارخانوں اور معملوں کے کام آئیں۔ حکومت بنگال، جنوب مشرقی ریلوے کے ارباب اقتدار اور محکمۂ رسد و صرف کے ناظم سب شکریہ کے مستحق ھیں کہ ان کی توجہ و تعاون عمل سے کام بڑی تیزی سے ھوا، اور مجلس منتظمین نے فیصلہ کرلیا کہ مولانا کی اجازت حاصل کر کے اگست سنہ ۱۹۵۱ء سے سال اول کی جماعتوں کا آغاز کردیں۔ جب میں سنہ ۱۹۵۱ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا سے ملا تو انہوں نے خیال کیا کہ ھم بڑے خطرے

میں پڑ رہے ہیں لیکن واقف کاروں کا اگر یہی مشورہ ہے اور وہ تمام مشکلات سے واقف ہونے کے باوجود خطرہ میں پڑنے تیار ہیں تو انہیں مولانا کی پوری تائید حاصل رہے گی۔

دو سو طالب علم جنہیں تین ہزار درخواست گزاروں میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ منتخب کیا گیا تھا اگست ۱۹۵۱ء میں ھگلی میں آکر مقیم ہوگئے۔ وہ ہندوستان کے تمام حصوں سے آئے تھے اور ملک کے بہترین نوجوان تھے، وہ اس مہم کے خطروں اور مسرتوں، دونوں میں عملے کے کارکنوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ یہاں ایک اجتماعی زندگی بسر ہونے لگی جس میں سہولتوں کے فقدان یا تعلیم کے جدید ترین سازوسامان کے فقدان کی بنا پر شکایتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے بہت سارے قابل منتظمین دیکھے ہیں لیکن بہت کم ایسے نظر آئے جو مشکلات اور موانع کو غیر اہم قرار دیتے ہوں کیونکہ یہ بالآخر انسان کی ان تھک قوت اور تعاون عمل کے جذبہ سے رفع ہوسکتے ہیں۔ مولانا میں ان صفات کا ہرگز فقدان نہیں تھا اور مجھے اس واقعہ کو ضبط تحریر میں لانے سے کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا کہ اگر مولانا کی پرجوش و سرگرم تائید نہ ہوتی تو کھڑک پور کے ادارہ کا افتتاح جولائی ۱۹۵۱ء میں کبھی نہ ہوسکتا۔

چنانچہ ادارہ حرفیات، کھڑک پور کا افتتاحی خطبہ پڑھتے وقت ۱۸/ اگست ۱۹۵۱ء میں مولانا نے جذبۂ افتخار کے ساتھ فرمایا:

''وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلی فنی تعلیم کے حصول کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلی تعلیم کے حصول کے لئے جو ملک سے باہر جاتی تھی خود ملک میں یہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی

بلند ہو جائے گی کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلی سائنسی اور فنی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔''

جس شخص کے خواب اس نوعیت کے ہوں وہ بے شک ایسا شخص ہے جو تعلیمی ارتقاء کی نئی راہیں نکال سکتا ہے۔ کھڑک پور کا ادارہ بے سروسامانی کی حالت میں شروع ہوا، اور کم سے کم وقت میں وہ اٹھارہ سو طلباء کو انڈر گرایجویٹ درجہ میں اور چھ سو طیلسانین کو اعلی تعلیم اور تحقیقات کے کام کے لئے داخل کر سکتا تھا۔ اس ادارہ کے متعلق مولانا کا خواب پورا ہو کر رہا۔ بہت جلد یعنی ۳/مارچ سنہ ۱۹۵۲ء کو وزیر اعظم نے اس ادارہ کی بڑی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ کامیاب طلباء کا پہلا جتھا جولائی سنہ ۱۹۵۵ء میں نکلا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ادارہ سے نکلتے ہی ہر طالب علم کی جیب میں تین تین ملازمتیں ہوتی تھیں۔

تقسیم اسناد کا پہلا خطبہ وزیر اعظم نے اپریل سنہ ۱۹۵۶ء میں دیا، اور اسی موقع پر انہوں نے ادارہ کی خاص عمارت کا با قاعدہ طور پر افتتاح بھی کیا۔ ادارہ کی زندگی کے ابتدائی مراحل میں کارخانوں اور معملوں کو وہ مشنری یا سامان مہیا کرنا پڑا تھا جو رسد و صرف کے گوداموں میں بچ گیا تھا۔ ان کو رفتہ رفتہ نئی مشنری اور نئے ساز وسامان سے بدل دیا گیا جو یا تو بازار سے خرید لئے گئے یا کسی فنی امداد کے پروگرام کے توسط سے حاصل کئے گئے جیسے کولمبو منصوبہ، ٹی سی یم، یونسکو وغیرہ۔

آج اس مکمل اقامتی ادارہ نے اپنے اطراف ایک چھوٹا سا گاؤں پیدا کر لیا ہے اور یہ وہ جگہ تھی جو چند سال قبل صحرا سے زیادہ بہتر نہ تھی۔ عملہ اور طلباء کے لئے اقامت گاہوں کی تعمیر کا لائحہ عمل ادارے کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ نہ دے سکا اس وقت رہنے کے چھ بڑے ہال ہیں جن کے نام یہ رکھے گئے ہیں: پٹیل ہال، نہرو ہال،

آزاد ھال ، بدھان رائے ھال ، راجندرا پرشاد ھال اور رادھا کرشنا ھال ۔ ھر ھال میں تین سو طلباء رہ سکتے ھیں اور بدھان رائے ھال ایسا ھے جہاں صرف سو ایسے طلباء ٹھیر سکتے ھیں جو تحقیقاتی کام کر رھے ھیں ۔ ادارہ کے اطراف جو قصبہ آباد ھوگیا ھے اس کے لئے یہ سہولتیں فراھم کی گئی ھیں کہ پانچ ہزار کی آبادی کے لئے ایک ڈاک گھر ، ایک بنک ، انجمن امداد باھمی کے گودام ، پولیس چوکیاں ، ایک کثیر المقاصد مدرسہ ، ایک کنڈر گارٹن مدرسہ ، اور ایک گلشن اطفال ، ایک جسمانی ورزش کا میدان اور ایک ورزش گاہ موجود ھیں ۔ ایک شناگاہ بھی زیر تعمیر ھے ۔ ایک چوک بازار اور دوسرے بلدی خدمات کا انتظام زیر غور ھے اور بہت جلد ان کا بھی انتظام کردیا جائے گا ۔ بشرطیکہ وھی رفتار کار باقی رھے جو اس ادارے کی ابتدا سے رھی ھے ۔ حیرت کی کوئی بات نہیں اگر مولانا نے اس ادارہ کے وجود پر فخر محسوس کیا ھو جب پارلیمنٹ نے انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی ، کھڑک پور ، سنہ ۱۹۵۶ء کا قانون وضع کیا جس کو یکم / اپریل سنہ ۱۹۵۷ء میں رو بعمل لایا گیا ، اور جس کی رو سے اس کو قومی اھمیت کا ایک ادارہ قرار دیا گیا اور اس کو مجاز گردانا گیا کہ وہ ڈگری ، ڈپلوما اور دوسرے علمی اعزازات عطا کرے ۔ اس قانون کی رو سے مجلس نگران ، مجلس علمی ، مجلس مالیہ ، اور دوسری قانونی جماعتیں اس ادارے کے انتظام کی ذمہ دار رھیں گی اور صدر جمہوریہ ھند اس کا وزیٹر رھے گا ۔ اس نے ادارے کو خود اختیاری ادارہ قرار دیا ھے ۔ مجلس نگران کو ادارے کے تمام علمی ، انتظامی اورمالی معاملات پر پورا اختیار دے دیا گیا ھے ۔ ڈاکٹر بی ۔ سی ۔ رائے مغربی بنگال کے وزیر اعلی اس خود مختار ادارے کے پہلے میر مجلس ھیں ۔

اس قومی اھمیت رکھنے والے ادارہ میں تعلیمی نصاب کی ترتیب میں بھی جدت سے کام لیا گیا ھے ۔ مولانا نے محسوس کیا کہ قدیم طرز کی انجینیری کی تعلیم ، جس میں حرفیات (محدود معنی میں) پر خاص طور پر

زور دیا جاتا رہا ہے، آج کل کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔ خصوصا جدید ہندوستان کو ایسے انجینیروں کی ضرورت ہے جن میں قومی خدمت کا بھی جذبہ ہو، وہ محض فن داں ہی نہ ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کی تیاری اور علمی زندگی کی تنظیم کے وقت کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ بنیادی سائنسی و حرفیاتی تعلیم کے ساتھ علوم ادبیہ کی وسیع مشرب تعلیم بھی دی جائے۔ ادارہ میں انڈر گراجویٹ اور بعد کے درجہ ہی کے نصاب کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ اعلی معیار کا تحقیقاتی کام بھی ہوتا ہے۔ ادارہ کے کام کا ایک خاص پہلو جس کو ہندوستان کے تمام منتظمین کاروبار اور انجینیروں نے پسند کیا ہے یہ ہے کہ یہاں کاروباری بندوبست، صنعتی انتظام، کثیر تعداد میں کسی چیز کو پیدا کرنے کے جدید طریقوں پر قلیل مدت نصاب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ادارے میں صفار خانے، تعمیر، نجاری وغیرہ کے تین سالہ کار آموزی کے نصاب کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک ادارے میں ہر قسم کی تعلیم دی جاتی ہے، دست کار اور وائرمن کی سندوں سے لے کر فنون، سائنس اور حرفیات میں پی ایچ ڈی اور ڈی یس سی کی اعلی ڈگریوں تک۔ جب اسی نوعیت کے دوسرے ادارے عالم وجود میں آجائیں گے یعنی بمبئی میں مغربی، کانپور میں شمالی، اور مدراس میں جنوبی ادارہ، تو پھر مولانا کے خواب کی تعبیر مکمل ہو جائے گی۔

انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس، بنگلور کی ترقی بھی کچھ کم اہم نہیں قرار دی جاسکتی جو ما بعد جنگ دور میں حرفیات کی اعلی تعلیم و تحقیق کا ایک مرکز ہے۔ یہاں ایروناٹیکل انجینیرنگ (ہوا بازی سے متعلق)، انٹرنل کمبسشن انجینیرنگ (اندرونی احتراق سے متعلق) مٹلارجی (خام دھات کو صاف کرنے کا فن) اور کیمکل انجینیرنگ (کیمیائی انجینیری) پر ابتداء میں توجہ کی گئی۔ بعد میں ہائی ولٹیج انجینیرنگ اور پاور انجینیرنگ کے

شعبے قائم کئے گئے جس کے صدر پروفیسر تھیاکر تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برقی انجینیرنگ کے طیلسانین کو برقی قوت کی تولید و ترسیل کی نہایت اعلی تعلیم دی جائے۔ ان تمام سہولتوں کی فراھمی کے لئے دو کرور کے خرچ کا انتظام قطعا ناممکن ثابت ھوتا اگر مولانا اس ادارہ میں مسلسل دلچسپی نہ لیتے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کی ابتداء میں حکومت ھند نے سائنٹفک میان پور کمیٹی کا تقرر کیا اور ڈاکٹر یس یس بھٹناگر کو اس کا صدر مقرر کیا تاکہ یہ اندازہ کرے کہ سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۷ء تک ملک کے لئے کتنے فنی عملے کی ضرورت ھے اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ کمیٹی نے ایک پانچ سالہ منصوبہ کی سفارش کرتے ھوئے چند اور تجویزیں پیش کیں جن میں سے بعض یہ ھیں:

(۱) سائنس اور حرفیات کے بعض شعبوں میں جن پر اب تک کام نہیں ھوا مخصوص نصاب کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام۔

(۲) موجودہ اداروں میں اگر گنجایش ھو تو تعلیم و تحقیقات کے کاموں میں توسیع۔

(۳) بعض موجودہ پالی ٹکنکس (کثیر الفنی اداروں) میں اعلی تعلیم کا انتظام۔

(٤) بعض موجودہ اداروں میں مختلف نصاب کی تعلیم پانے والے طلباء کے داخلوں میں اضافہ۔

(٥) فنی عملے کے نگران کاروں کی تربیت، صنعت و حرفت کے ساتھ۔

(٦) چند منتخب اداروں میں منطقہ واری اساس پر پروڈکشن انجینیرنگ، ڈزائن انجینیرنگ کی تعلیم کے لئے سہولتوں کا فراھم کرنا۔

(۷) ادارے کی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد وظیفے دے کر عملی تعلیم کے حصول کا انتظام۔

ان سفارشات کو رو بعمل لایا گیا اور فنی تعلیم کی سہولتوں

میں کافی اضافہ ہوا جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہوگا:

(١) انجینیرنگ کی تعلیم:

(١) ڈگری

	سنہ ١٩٤٧ء	سنہ ١٩٥٠ء	سنہ ١٩٥٥ء
تعداد اداروں کی	٢٨	٣٧	٤٣
داخلہ	٢٥٢٠	٣٣٣٧	٥٠٠٠
کامیاب طلباء	٩٥٠	١٧٠٠	٣٠٠٠

(٢) ڈپلوما

تعداد اداروں کی	٤١	٦١	٨٣
داخلہ	٣١٥٠	٥٣٥٠	٨ ٠٠
کامیاب طلباء	١١٥٠	٢١٤٦	٣٤٧٢

(٢) حرفیات

(١) ڈگری

تعداد اداروں کی	١٦	٢٤	٢٥
داخلہ	٤٢٠	٧٨٢	١٠٥٠
کامیاب طلباء	٣٢٠	٤٩٨	٧٠٠

(٢) ڈپلوما

تعداد اداروں کی	٢٠	٣١	٣٦
داخلہ	٥٢٠	٥٥٣	٧٠٠
کامیاب طلباء	٢٩٠	٣٣٢	٤٢٨

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ (سنہ ١٩٥٦ء تا ١٩٦١ء) میں ریاستی منصوبوں (اسٹیٹ پلانس) اور مرکزی وزارت تعلیمات کے منصوبہ میں فنی تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی منظورہ تجاویز کے لئے ٥٧ کرور ٣٧ لاکھ کی رقم محفوظ کی گئی ھے انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی، کھڑک پور، دھلی پالی ٹکنک اور انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس، بنگلور کی ترقی کے علاوہ منصوبہ میں جس کی وقتا فوقتا نظر ثانی ہوتی رہی ھے یہ بھی

داخل ھے کہ ۱۹ انجینیرنگ کالج ، ۷۱ پالی ٹکنکس اور ۶۰ چھوٹے فنی مدرسے کھولے جائیں ۔ مغربی اعلی حرفیاتی ادارہ سنہ ۱۹۵۸ء-۱۹۵۹ء کے دوران بمبئی میں قائم ھورھا ھے ، اور مدراس اور کانپور میں بھی اسی قسم کے اداروں کے قیام کے سلسلہ میں ابتدائی کام شروع کردیا گیا ھے ۔ منتخبہ مراکز میں انجینیرنگ اور حرفیات پر اعلی تحقیقاتی کام کا انتظام بھی کیا جارھا ھے ۔

ابتداء میں منصوبہ یہ تھا کہ فنی اداروں میں ڈگری اور ڈپلوما کے نصاب میں داخلے سنہ ۱۹۵۵ - ۱۹۵۶ء میں ۶۰۵۰ اور ۸۷۰۰ سے سنہ ۱۹۶۰ - ۶۱ء میں ۸۰۶۰ اور ۱۱۳۰۰ تک بڑھا دئے جائیں ۔ کمیشن منصوبہ بندی کی ذیلی کمیٹی انجینیرنگ پرسونیل کمیٹی کی سفارش پر سنہ ۱۹۶۰ - ۶۱ء میں ڈگری کورس کے داخلے ۸۰۶۰ سے ۹۴۸۰ تک اور ڈپلوما کورس کے داخلے ۱۱۳۰۰ سے ۱۵۳۲۰ تک بڑھا دئے گئے ۔ توقع کی جارھی ھے کہ اگر توسیع کی موجودہ رفتار قائم رھے تو دوسرے منصوبہ کے اختتام تک یہ اعداد بالآخر تقریبا ۱۲۰۰۰ اور ۲۰۰۰۰ ھو جائیں گے ۔

جنوری سنہ ۱۹۴۷ء سے جنوری سنہ ۱۹۵۸ء تک انجینیرنگ کالجوں اور پالی ٹکنکس میں طلباء کی تعداد دو چند ھوگئی ۔ مولانا نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ملک کی معاشی ترقی کی رفتار میں اگر کسی قسم کا تغیر ھونا ھے تو پھر فنی تعلیم میں توسیع کا ھونا ضروری ھے ۔ ھماری آئندہ ضرورتوں کے لئے ھمیں کتنے فن دانوں کی حاجت ھوگی ، یہ ھماری مستقل دلچسپی کا مسئلہ ھے ۔ ھماری صنعتوں ، ھماری جامعات اور فنی اداروں میں مناسب سمجھوتہ کی ضرورت ھے اور مدارس کے نظریہ میں اور دست کار کے عمل میں مناسب ارتباط قائم ھونا چاھئے ۔

دوسرے ممالک میں تربیت کے جو نظام ھیں مثلا سینڈوچ کورس ، جزء وقتی کارآموزی کی تربیت ، صنعتوں کے متعلق تربیت ، ان کے بھی

شروع کرنے کا ارادہ ہے اور مجھے امید ہے کہ تربیت کے ان نظامات میں کامیابی اسی صورت میں قطعا حاصل ہوگی جب خانگی صنعتیں اور حکومت کے ادارے اور تعلیمی ادارے اشتراک عمل کریں۔ مولانا اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ امید ہے کہ ان کی بصیرت نافذہ جس نے گزشتہ گیارہ سالوں میں فنی تعلیم کو اتنی وسعت دی آئندہ بھی اس دائرہ میں ہمارے لئے تخلیقی تحریک اور روحانی فیض کا باعث ہوگی۔

ایک غیر مکمل شاہ کار

از

سید عبد اللطیف

علوم اسلامیہ کے میدان میں اپنی آزمائشوں اور کامیابیوں پر ایک نظر بازپسیں ڈالتے ہوئے اور خصوصاً اپنے شاہ کار ترجمان القرآن کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں....

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالہ کیا تھا میں نے اول روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشہ میں بھی روک نہ ہوسکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا... میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پئے ہیں

اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء کے آزمائے ہیں ۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسرں کی طرح نہ تہیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاھراہ عام پر نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس تمام عرصہ کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلادیا ھے :

سبک زجاۓ نگیری کہ بس گران گہر ست

متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی ۔ ۱ "

یہ ھے مختصرا مولانا آزاد کا خیال علوم اسلامیہ کے دائرہ میں اپنے ذھن کے نشو و نما و ترقی کے متعلق ! یہ عبارت اس دیباچہ کا اقتباس ھے جو انہوں نے اپنی کتاب ترجمان القرآن جلد اول کے لئے میرٹھ کے قید خانہ میں سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھی تھی اور اسی سال یہ کتاب شائع بھی ہوگئی ۔ میں اس کو مولانا کا آخری کارنامہ قرار دیتا ہوں ، کیوں کہ اس کے بعد انہیں ملک کی آزادی کے حصول کے لئے ایک طویل عرصہ تک شدید سیاسی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑا اور اس طرح انہیں حالات نے موقع نہیں دیا کہ وہ علوم اسلامیہ میں کوئی خاص اہمیت یا جدت و ندرت کا کام کرسکیں ۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ترجمان القرآن کے شائع ھوجانے کے بعد ان کا قلب اسلامی زندگی کے مسائل پر یا علوم اسلامیہ پر تفکر و تدبر نہیں کرتا رہا ۔ یہ واقعہ ھے کہ انہوں نے اپنی شدید سیاسی مصروفیتوں میں سے کچھ وقت نکال کر ترجمان القرآن کی نظر ثانی کی اور اس کے مقدمہ میں احمد نگر کے محبس ھی میں بیٹھ کر اضافے کئے ۔ ان کی زندگی کے آخری تین سالوں میں ان کی چند مشہور تصانیف کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے سلسلہ میں ان سے گفتگو کرنے ان کے مکان ، نئی دھلی، میں اکثر دفعہ ٹھیرنے کا اتفاق ھوا تو میں نے اس زمانہ میں بھی محسوس کیا کہ ان کا ذھن ان مسائل پر غور کرنے ھمیشہ آمادہ رہتا جو غور

(۱) ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۸، ۱۹ ۔

و فکر کے طالب ہوتے ۔ تاہم میری رائے میں اسلام کی بہترین قلمی خدمت جو مولانا کرسکتے تھے اس کا سلسلہ بد قسمتی سے سنہ ۱۹۳۰ء میں ختم ہوگیا جب ان کی ترجمان القرآن پہلی مرتبہ شائع ہو گئی ۔

لیکن اسلام کا وہ کونسا پہلو تھا جس پر مولانا نے سنہ ۱۹۳۰ء کے قبل اپنی رائے کا اظہار نہ کیا ہو! شاید مشکل ھی سے کوئی ایسا پہلو نکل سکے ۔ اسلامی موضوعات پر انہوں نے جو مضامین اپنے اخبار لسان الصدق ، الہلال ، اور البلاغ میں لکھے اور پھر ان کے خطبے اور رسالے ۔ ان سب کی ایک بہت طویل فہرست ہوتی ھے ! ان تحریروں کا باعث اسلامی دنیا اور اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی و معاشری انقلابات رہے ھیں ۔ گو یہ سب تحریریں اسلام کے بعض بنیادی پہلوؤں کی نہایت اھم توضیحات ثابت ہوئی ھیں جن کی تائید قرآن کریم یا سنت نبوی سے ہوتی ھے تاھم ایسا معلوم ہوتا ھے کہ ان تمام تحریرات کو کسی خاص لائحہ عمل سے مربوط نہیں کیا گیا ۔ یہ فکر اسلامی کے دائرہ کی چند دلکش تجلیات ھیں! ان سے اندازہ ہوسکتا ھے کہ مولانا کا ذہن کتنی بلندیوں تک پرواز کرسکتا ھے ۔ لیکن اگر کوئی ان کے ذہن سے کاملا و شاملا واقف ہونا چاھتا ھے اور ان کے علم و فضل کی وسعتوں کا اندازہ کرنا چاھتا ھے تو پھر اس کو لازما ترجمان القرآن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ان کا شاہ کار ھے ، جس میں انہوں نے قرآن کے ہر مسئلہ سے بحث کی ھے ۔ اس کتاب کو انہیں اپنی عملی سیاسی زندگی کی الجھنوں میں وقت نکال کر تیار کرنا پڑا کیونکہ اسلامی علوم کے ہر مرکز سے اس کا شدید مطالبہ کیا جارھا تھا ۔ اس کتاب میں ان کی تخلیقی و ابداعی قابلیت کے انوار کچھ اس طرح جمع ہوگئے اور ایک دوسرے میں اس طرح متداخل ہوگئے ھیں کہ پڑھنے والے کی ذہن کی ساری فضا جگمگا اٹھتی ھے!

مولانا آزاد نے علوم اسلامیہ کی جو خدمت کی ھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ھمیں یہ دیکھنا ھوگا کہ ان کے ذھن نے شیر خوارگی اور لڑکپن کے زمانے کے کیا اثرات قبول کئے۔ اس طریقہ کا وجہ جواز اس واقعہ سے فراھم ھوتا ھے (اور اس کی شہادت ان کی تمام تحریرات سے ملتی ھے) کہ جو رجحانات ان میں اوائل عمر میں پیدا ھوئے وھی ان کی تمام علمی زندگی میں قائم و باقی رھے۔ زندگی کے تجربات اور اسلام کے علاوہ دوسرے فرقہ کے مصنفین کی کتابوں سے معلومات کا بتدریج حصول انہیں اپنے خیالات کو وسیع کرنے میں ضرور مدد دیتا ھے۔ لیکن جو رجحانات قائم ھوچکے تھے وہ غیر متغیر طور پر باقی رھے۔

تذکرہ سے جس کی اشاعت سنہ ۱۹۱۹ء میں ھوئی، اور دوسری کتابوں میں جو حوالے ملتے ھیں ان سے وہ سارا مواد آسانی کے ساتھ فراھم ھوسکتا ھے جس سے ھمیں معلوم ھوجاتا ھے کہ عنفوان شباب میں مولانا کے ذھن کی تشکیل کیسے ھوئی۔ مولانا آزاد مکہ میں پیدا ھوئے، ان کی والدہ کا تعلق عرب کے مشہور علماء کے خاندان سے تھا اور ان کے والد بھی ایسے ھی عالی نسب تھے، مولانا کے ذھن نے زمانۂ طفولیت ھی سے اپنے نانا اور والد کے زیر پرورش اسلامی علوم کے رنگ میں رنگا جاکر نشوونما پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ دس سال کی عمر میں، جب ان کے والد ماجد ھندوستان واپس ھوئے، مولانا دین و شریعت کی تقریبا ھر معروف کتاب کو ایک نظر دیکھ چکے تھے۔ کلکتہ کے مدارس میں جہاں ان کو باضابطہ شریک کیا گیا مطالعہ کا یہ عمل اور زیادہ تیز ھوگیا تھا لیکن اس تیزی کا ردعمل بھی ھوا۔ ان مدارس میں اس لڑکے کو کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اس نے مکہ میں غیر رسمی طور پر نہیں حاصل کرلی تھی۔ اتنی قلیل مدت میں اس قدر علم غیر منضبط طور پر حاصل کرلینے کی وجہ سے ان کے ذھن میں بہت ساری چیزوں کے متعلق انتشار اور شک پیدا ھوگیا۔ مولانا نے

خود اس کی طرف اشارہ کیا ھے اور یہ عبارت میں نے اپنے اس مقالہ کے شروع میں نقل بھی کی ھے۔

اس عرصہ میں ایک چیز ان پر برابر واضح ھو رھی تھی، اور وہ یہ تھی کہ تاریخ اسلام کے دوران میں ذاتی یا مادی مفاد کی خاطر بعض عالموں نے قرآن کو اپنا حقیقی مفہوم ادا کرنے کی آزادی نہیں دی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک کہ قرآن کو قرون وسطی کی قید سے رھائی نہ دلائی جائے اور پیغمبر اسلام (صلعم) اور ان کے صحابہ کے زمانہ کی طرح سے اس کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے آج کا مسلمان، ساری دنیا میں، زمانہ کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے گا اور نہ کوئی ترقی کر سکے گا!

کلکتہ کے مدارس میں جب وہ تعلیم پا رھے تھے اس خیال کی ان کے ذھن میں صورت گری ھو رھی تھی اور اسی زمانہ میں انہیں مغربی ایشیا کے ممالک کے سفر کا موقع ملا۔ جب وہ قاھرہ پہنچے تو اس زمانہ کو جامعہ ازھر کے ''ایام العز'' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہیں سے سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے خیالات (اسلام میں حریت پسندی اور یورپی تسلط سے اسلامی ممالک کی نجات کے متعلق) باھر کی دنیا میں پھیل چکے تھے اور اپنا اثر پیدا کر رھے تھے۔ جب مغربی ایشیا کے ممالک کے سفر کے بعد مولانا آزاد اپنے ملک واپس ھوئے تو جو تصور ان کے ذھن پر غالب تھا وہ مسلمانوں کی فکر دینی کو قدیم ظلمت پسندی سے آزاد کرنا اور اپنے ملک میں برطانوی شہنشاھیت کے خلاف جد وجہد کرنا تھا۔ جنگ بلقان اور تری پولی میں اطالوی حملے نے ھندوستان کے مسلمانوں کو ان ممالک کے مصیبت زدہ بھائیوں کے لئے مالی اور طبی امداد کا سامان فراھم کرنے پر آمادہ کیا اور اسی موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا نے ھندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف جد وجہد کی مہم کو اور زیادہ تیز کر دیا۔

اس طرح اتحاد اسلامی کا میلان، جو ان کے قلب میں قاہرہ کی فضا میں پیدا ہوا تھا، ہندوستان میں آکر اس نے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کی شکل اختیار کی اور انہوں نے الہلال کی اشاعت کا انتظام کلکتہ سے کیا جو ایک ہفتہ وار اردو رسالہ تھا۔ یہ سنہ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے۔ رسالہ کی دلکش و عالمانہ طرز ادا اور ہر مسئلہ کے حل میں اس کے بے باکانہ انداز فکر نے ہندوستان کے تمام اردو داں طبقے کو بہت جلد اپنا گرویدہ کرلیا اور برطانوی حکومت کو خوف زدہ کردیا۔

الہلال کے پیش نظر دو خاص مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن سے تحقیق و اجتہاد کی مخالفت یا ظلمت پسندی کو رفع کرنا، دوسرے یہ کہ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کرنا۔ اس وقت علیگڈھ مسلمانوں کا ایک قوی مرکز تھا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک کے مذہبی پہلو سے مولانا آزاد متأثر ضرور تھے۔ لیکن اس تحریک کے سیاسی پہلو کے متعلق مولانا نے محسوس کیا کہ اس میں اور اسی تحریک کے مذہبی پہلو میں کوئی توافق نہیں۔ ان کا یہ احساس تھا کہ فکر دینی میں حریت، سیاسیات میں محکومی و انقیاد کی اجازت نہیں دیتی۔ علیگڈھ کے سیاسی نصب العین کا مادی تمثل سنہ ۱۹۱۲ء میں کل ہند مسلم لیگ کی شکل میں ظاہر ہوچکا تھا جس کا کام ملک میں برطانوی حکومت کی عنایت و رعایت کے حصول کی کوشش کرنا تھا۔ وہ ہندوستانی قومی کانگرس (انڈین نیشنل کانگرس) کے طریقوں کی مخالف تھی جس کا مقصد برطانوی راج کی پناہ یا سرپرستی میں قوم (یعنی تعلیم یافتہ افراد) کے لئے حقوق کا مطالبہ کرنا تھا۔ جواں سال مولانا کے خیال میں ان دونوں جماعتوں کا طریق کار غلط تھا۔ عنایت و رعایت کا حصول ہو یا حقوق کا مطالبہ ان کا حاصل ایک ہی ہے — ہندوستان میں برطانوی راج کا دوام۔ انہوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ کا

کا نفس تعلق ھی ملک کے لئے اور اسلام کے لئے مضر چیز ھے ۔ اس لئے انھوں نے خیال کیا کہ جب تک ملک برطانوی حکومت سے نجات حاصل نہیں کرلیتا اس وقت تک ھندوستان میں نہ اسلامی زندگی کی اصلاح کی جاسکتی ھے اور نہ مسلمانوں کے ذھن کو قرون وسطی کی قید سے رھائی دلائی جاسکتی ھے !

یہی وہ تصور تھا جس نے ۱۹۱۲ء میں مولانا کے قلب کا کامل احاطہ کرلیا تھا اور یہ واقعہ ھے گاندھی جی کے ھندوستان کے سیاسی میدان میں قدم رکھنے سے کئی سال قبل کا! ان کے ھفتہ واری رسالہ الہلال نے ھندوستان کے مسلمانوں کے آگے مذھب و سیاسیات کا ایک نیا زاویۂ نگاہ پیش کیا ۔ جب پہلی عالمی جنگ شروع ھوئی اور ترکی برطانیہ کا مخالف ھو گیا تو پھر الہلال کی قوت اور زیادہ بڑھ گئی اور وہ برطانوی شہنشاھیت پر ھر سمت سے کاری ضربیں لگانے لگا ۔ مولانا کا طریق کار یہ تھا کہ مسلمانوں کے دین و مذھب کی ایک نئی توجیہ پیش کرکے ان میں ایک نیا شعور پیدا کیا جائے اور اس طرح انھیں ان تمام انقلابی قوتوں کے ساتھ کام کرنے آمادہ اور تیار کردیا جائے جو آزادی کے حصول کے لئے سرگرم عمل تھیں ۔

فطری طور پر برطانوی حکومت نے الہلال کو طرح طرح سے دق کرنا شروع کیا ۔ ان اذیتوں کی پرواہ کئے بغیر اس نے اپنا کام پوری قوت سے جاری رکھا ، ملک میں ایک نئی فضا پیدا کردی ، اور انڈین نیشنل کانگرس کو تازہ تخلیقی قوت عطا کی ! اس زمانہ میں مولانا آزاد کی ادبی تخلیقات کسی خاص نظام کی پابند نہ تھیں ۔ ھر مقالہ یا مضمون اقتضائے وقت کے لحاظ سے لکھا جاتا تھا اور اس میں وہ ساری چیزیں ھوتی تھیں جو عوام کے فوری فائدے کی ھوتیں ۔ لیکن جو مضمون بھی لکھا جاتا ان دو مقاصد کو پیش نظر رکھا جاتا : برطانوی شہنشاھیت کے خلاف جد و جہد اور مسلمانوں میں قرون وسطی کے رنگ یا طرز کے

خلاف مجاهدہ ۔

مولانا آزاد نے فکر اسلامی کے دائرہ میں جو خدمت کی ھے اس کی مختلف شکلیں ھیں اور یہ تمام اھم مسائل پر حاوی ھیں، خواہ ان مسائل کا تعلق عقائد سے ہو یا فلسفہ سے یا قانون سے جن پر مسلمانوں کی تاریخ کے دوران میں علمائے اسلام نے غور و خوض کیا ھے ۔ لیکن چوں کہ یہ متفرق مضامین تھے اور ان کا کسی خاص نقشے سے تعلق نہ تھا، ان سے خواھش کی گئی کہ وہ ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی ایک کامل تفسیر بھی لکھیں ۔

اس خواھش کی تکمیل کی غرض سے مولانا آزاد نے تین کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا جو ان کی رائے میں ایک دوسرے سے خاص تعلق رکھتی تھیں ۔ ایک میں تو قرآن اپنا آپ مفسر ہوگا بغیر کسی دوسرے مفسر کی احتیاج کے ۔ یہ متوسط قابلیت رکھنے والوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہوگی اور اس کا نام ترجمان القرآن ہوگا ۔ دوسری کتاب کا عنوان تفسیر البیان ہوگا، یہ ان طلباء کے لئے ہوگی جنھیں قرآن حکیم کی تفصیلات سے دلچسپی ھے ۔ تیسری کتاب کا نام مقدمۃ التفسیر ہوگا، اس میں قرآن کریم کے مقاصد اور اصول سے بحث کی جائے گی جو اھل علم و نظر کے کام آئے گی ۔

لیکن یہ تین کتابیں علحدہ علحدہ شائع نہ کی جاسکیں ۔ مولانا کی قومی زندگی کے حالات نے اس کی اجازت نہ دی ۔ دشوار اور شاق حالات کی ایک طویل مدت میں جو کچھ ان تین مختلف عنوانات کے تحت لکھا گیا تھا وہ ترجمان القرآن کے نام سے سنہ ١٩٣٠ء میں شائع کر دیا گیا، حالانکہ یہ عنوان ان تین کتابوں میں سے صرف ایک کا تھا لیکن اپنے تضمن کے لحاظ سے جامع تھا اور دوسری کتابوں کی خصوصی چیزوں کا اس میں ذکر آسکتا تھا ۔ چوں کہ اس کتاب میں اکثر وہ چیزیں آجاتی ھیں جو مولانا نے اپنے بے شمار مقالوں، رسالوں اور مختصر تحریروں میں

لکھی ھیں اور فکر دینی پر ان کی شاہ کار سمجھی جاتی ھے لہذا اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر کرنا مناسب ھے۔

ترجمان القرآن کی اشاعت کی تاریخ میری رائے میں مولانا آزاد کی زندگی کا ایک نہایت اھم باب ھے۔ کیوں کہ یہ ان کی سیاسی زندگی کا نہایت تکلیف دہ زمانہ ھے۔ یہ تقریبا پندرہ سال کی مدت پر حاوی ھے اور ان ابتلاؤں کا زمانہ ھے جن سے ایک محب وطن عالم کو ھو گزرنا پڑتا ھے جب وہ ایک ھی وقت میں دو کام کرنا چاھتا ھے جن میں سے ایک کام تو خانقاہ کا سکون چاھتا ھے اور دوسرا میدان جنگ کے شدائد اور شب بیداریاں۔ یہ قصہ مولانا کی زبان میں اس قدر پر اثر ھے کہ میں نے خیال کیا کہ اس ''کتاب التذکرہ'' میں اس کو محفوظ کر دیا جائے تو مناسب ھوگا۔ یہ ان کی جلیل القدر تصنیف کے نقش اول کے مقدمہ سے ماخوذ ھے۔ مولانا لکھتے ھیں کہ:

''سنہ ۱۹۱۶ء میں جب البلاغ کے صفحات پر ترجمان القرآن اور تفسیر البیان کا اعلان کیا گیا تو میرے وھم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک ایسے کام کا اعلان کر رھا ھوں جو پندرہ برس تک التواء و انتظار کی حالت میں معلق رھے گا اور جو ملک کے شوق و انتظار کے لئے ایک نا قابل برداشت بوجھ اور میرے ارادوں کی نا تمامیوں کے لئے ایک درد انگیز مثال ثابت ھوگا۔ لیکن واقعات کی رفتار نے بہت جلد بتلا دیا کہ صورت حال ایسی ھی تھی۔

ابھی اس اعلان پر بہ مشکل چند مہینے گزرے ھوں گے کہ ۳/ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ''ڈیفنس آرڈیننس'' کے ماتحت مجھے حدود بنگال سے باھر چلے جانے کا حکم دیا اور دفعۃ البلاغ اور البلاغ پریس کے ساتھ تصنیف و طباعت کا تمام کارخانہ درھم برھم ھوگیا۔

چوں کہ اس سے پہلے اسی آرڈیننس کے ماتحت دھلی، پنجاب، یوپی اور مدراس کی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں میرا داخلہ روک

چکی تھیں ، اس لئے اب صرف بہار اور بمبئی ھی کے دو صوبے رہ گئے تھے جہاں میں جاسکتا تھا - میں نے رانچی منتخب کیا - میرا خیال تھا کہ کلکتہ سے قریب رہ کر شاید تصنیف و طباعت کا کام جاری رکھ سکوں -

سنہ ۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بہ یک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں: ترجمہ ، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر - میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کردیں گی: عام تعلیم کے لئے ترجمہ ، مطالعہ کے لئے تفسیر ، اھل علم و نظر کے لئے مقدمہ -

البلاغ میں جب ترجمہ اور تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا ، تفسیر سورۂ آل عمران تک مکمل ھوچکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا - اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پائے میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کردیا - میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ھو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا - نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ھو جائے گی - ھر سات دن کی مشغولیت میں نے یوں تقسیم کردی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا ، دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں -

۳/ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء کو جب میں کلکتہ سے روانہ ھوا تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت شروع ھورھی تھی - اب میں نے کوشش کی کہ میری عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر اور ترجمہ کا کام ھوتا رہے - چنانچہ جون سنہ ۱۹۱۶ء میں پریس کے دوبارہ اجرا کا انتظام ھوگیا اور میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ھوگیا تاکہ پریس کے حوالے کردوں -

لیکن ۸/جولائی سنہ ۱۹۱۶ء کو یکایک حکومت ھند نے میری نظر بندی

کے احکام جاری کردئے اور اس طرح اس امید کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ نظر بندی کے بعد کوئی موقع باقی نہیں رہا کہ باہر کی دنیا سے کسی طرح کا علاقہ رکھ سکوں۔

اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا، یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ نظر بندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا، اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کردے سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس صورت حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہوگیا، اس گوشہ میں بھی مجھے محرومی ہی سے دو چار ہونا تھا۔

نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کئے گئے ہیں، تو میری قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور جس قدر کاغذات ملے تھے افسران تفتیش نے اپنے قبضہ میں کرلئے تھے، ان ہی میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا لیکن جب معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابل اعتراض اور حکومت کے مفید مقصد نہیں تو دو ہفتے کے بعد واپس دیدئے گئے تھے۔

لیکن جب تفتیش کے نتیجہ سے حکومت ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دیدینے میں جلدی کی اور بہت ممکن ہے کہ پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانے میں حکومت ہند کے محکمۂ تفتیش کا افسر اعلی سر چارلس کلیولینڈ تھا اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں اسے میری

مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی - وہ پہلے کلکتہ آیا اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا اور پھر رانچی آیا اور از سرنو میرے مکان کی تلاشی لی گئی - تلاشی کے بعد کہا گیا کہ جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لئے گئے تھے اب حکومت ہند کے معائنے کے لئے بھیجے جائیں گے، چنانچہ تمام کاغذات حتی کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں - ان میں نہ صرف ترجمہ و تفسیر کا مسودہ تھا بلکہ بعض دوسری مصنفات کے بھی مکمل و نامکمل مسودات تھے -

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۂ نساء تک پہنچ چکا تھا، لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضہ میں نہ تھا، تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمے کی ترتیب جاری رکھی اور سنہ ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کردیا - اب اگر ابتدا کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا -

میں نے کاغذات کی واپسی کے لئے خط و کتابت کی، لیکن جواب ملا کہ نہ تو سردست واپس دئے جاسکتے ہیں نہ یہی بتلایا جاسکتا ہے کہ کب تک واپس کئے جائیں گے - چوں کہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی امید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت حال پیش آئے، اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ از سرنو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کرلی جائے - یہ کام آسان نہ تھا - ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے - تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سرنو مکمل کر لیا:

"گفتہ" گر شد ز کفم شکر کہ "ناگفتہ" بجاست

از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام!

اس خیال سے کہ مسودہ بہتر حالت میں مرتب ہو جائے اور اگر کسی دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے تو تصحیح میں آسانی ہو

میں نے اردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اسے ٹائپ کرانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ڈسمبر سنہ ۱۹۱۹ء میں نصف سے زیادہ حصہ ٹائپ ہو چکا تھا۔

۲۷ ڈسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مجھے رہا کر دیا اور اب طباعت و اشاعت کی تمام رکاوٹیں راہ سے دور ہو گئیں۔ لیکن یہ وقت وہ تھا کہ ملک میں ایک عام سیاسی حرکت کا مواد تیار ہو رہا تھا اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، الہلال کی سیاسی دعوت کی صدائے بازگشت ہر گوشہ سے بلند ہونے لگی تھی۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ وقت کے تقاضہ سے تغافل کرتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رہا ہوتے ہی تحریک 'لا تعاون' کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا، اور عرصہ تک اس کی مہلت ہی نہیں ملی کہ کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا سکتا۔

لیکن سنہ ۱۹۲۱ء میں جب ملک کے ہر گوشہ سے ترجمان القرآن کے لئے تقاضہ شروع ہوا تو مجھے اس کی اشاعت کے لئے آمادہ ہو جانا پڑا۔ چوں کہ ٹائپ کی چھپائی اس کے لئے موزوں نہیں سمجھی گئی تھی، اس لئے کتابت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے متن کی کتابت کرائی گئی، پھر ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء میں متن کی کتابت ختم ہو چکی تھی ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی۔ لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی میرے خلاف تھا!

سنہ ۱۹۲۱ء کے اواخر میں تحریک لا تعاون کی سرگرمیاں منتہائے عروج تک پہنچ گئی تھیں اور اب ناگزیر تھا کہ حکومت بھی اپنے تمام وسائل کام میں لائے۔ ۲۰ نومبر کو سب سے پہلے حکومت بنگال نے قدم اٹھایا اور ان تمام مجالس کو خلاف قانون قرار دیا جو تحریک کی سرگرمیوں میں مشغول تھیں۔ اس اقدام نے کانگرس کو عدم متابعت قانون کے اجراء کا موقع دے دیا اور ۱۰ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو بعض دیگر رفقائے بنگال کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اس مرتبہ میری گرفتاری پریس کے انتظامات میں خلل نہیں

ڈال سکتی تھی ، کیوں کہ کتاب مکمل موجود تھی ، اور میں نے اس کا پورا انتظام کرلیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں بھی کام بدستور جاری رہے ، لیکن گرفتاری کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ اس افسانہ کی آخری المناکی ھے ۔ اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رک گئی بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے افسردہ ہوگئے ۔

گرفتاری کے بعد جب حکومت نے محسوس کیا کہ میرے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے کافی مواد موجود نہیں ھے تو اسے مواد کی جستجو ہوئی اور اس لئے تیسری مرتبہ میرے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی ۔ تلاشی کے لئے جو لوگ آئے تھے ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اردو یا عربی و فارسی کی استعداد رکھتا ہو ۔ جو چیز بھی ان زبانوں میں لکھی ہوئی ملی ، انہوں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات حکومت کے خلاف ضرور ہوگی ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلمی مسودات کا تمام ذخیرہ اٹھا لے گئے حتی کہ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں بھی توڑ مروڑ کر مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں ۔

سوء اتفاق سے اس وقت کسی شخص نے مطالبہ نہیں کیا کہ کاغذات مرتب کر لئے جائیں اور حسب قاعدہ ان پر گواہوں کے دستخط ہوجائیں ، نیز ان کی رسید تفصیل کے ساتھ مرتب کر کے دی جائے ۔ افسران تفتیش اپنے ساتھ چھپا ہوا فارم لائے تھے ، صرف یہ لکھ کر کہ متفرق قلمی کاغذات لئے گئے ، چھپا ہوا فارم دے دیا اور روانہ ہوگئے ۔

پندرہ ماہ کے بعد جب میں رہا ہوا تو حکومت سے کاغذات کا مطالبہ کیا ۔ ایک عرصہ کی خط و کتابت کے بعد کاغذات ملے مگر اس حالت میں ملے کہ تمام ذخیرہ برباد ہوچکا تھا ۔

افسران تفتیش نے جب ان کاغذات پر قبضہ کیا ھے تو یہ قلمی

مسودات کے مختلف مجموعے تھے اور الگ الگ پٹھوں کی دفتیوں میں ترتیب دئے ہوئے تھے، ان میں مختلف مکمل و غیر مکمل تصنیفات کے علاوہ بڑا ذخیرہ یادداشتوں کا تھا۔ لیکن جب واپس ملے تو محض اوراق پریشان کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہوچکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔

یہ میرے صبر و شکیب کے لئے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی، لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں، یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جام حوادث نے میرے لبوں سے لگایا، لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا، البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے!

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا کہ دونوں کو بہ یک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متاع فکر کے انبار لگاتا رہا دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

زاں شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام
در نشیب شکن زلف پریشاں رفتم

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سر نو محنت کی جائے، لیکن اس حادثہ کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہوگئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثہ کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ فوراً مندمل ہو جائے۔

طبیعت کی بڑی رکاوٹ جو رہ رہ کر سامنے آتی تھی، یہ تصور تھا کہ ایک تصنیف کی ہوئی چیز دوبارہ تصنیف کی جائے ـ واقعہ یہ ھے کہ ایک اھل قلم کے لئے اس سے زیادہ مشکل کوئی کام نہیں ـ وہ ہزاروں صفحے نئے بآسانی لکھ دے گا، لیکن ایک ضائع شدہ صفحہ کے دوبارہ لکھنے میں اپنی طبیعت کو یک قلم درماندہ پائے گا، فکر و طبیعت کی جو گرم جوشی پچھلی محنتوں کی بربادی کے تصور سے بجھ جاتی ھے، بہت دشوار ھوتا ھے کہ اسے دوبارہ پیدا کیا جائے ـ اس حالت کا اندازہ صرف وھی لوگ کرسکتے ھیں جو ایسی بد قسمتیوں سے دو چار ھوئے ھوں ـ میں نے ٹامس کارلائل کے حالات میں جب پڑھا تھا کہ اس نے انقلاب فرانس پر اپنی مشہور کتاب دوبارہ تصنیف کی اور اھل فن نے اسے قوت تصنیف کا ایک غیر معمولی مظاھرہ سمجھا، تو میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس میں غیر معمولی بات کیا ھے ـ لیکن اس حادثہ کے بعد مجھے معلوم ھو گیا کہ یہ نہ صرف غیر معمولی ھے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ھے اور فی الحقیقت کارلائل کی مصنفانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر کوئی اور ثبوت نہیں ھو سکتا ـ

کئی سال گزر گئے مگر میں اپنے آپ کو اس کام کے لئے آمادہ نہ کرسکا:

دلے سر گشتۂ دارم کہ در صحرا ست پنداری

بارھا ایسا ھوا کہ ترجمہ و تفسیر کے بچے کچھے اوراق نکالے، لیکن جوں ھی برباد شدہ کاغذات پر نظر پڑی طبیعت کا انقباض تازہ ھو گیا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑا ـ

لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لئے وقت کا سب سے زیادہ ضروری کام ھے، ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصہ تک طبیعت غافل رھتی ـ جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا اس کام کی ضرورت کا احساس میرے لئے نا قابل برداشت ھوتا جاتا تھا ـ

میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا تو شاید عرصہ تک اس کام کی انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو۔

سنہ ۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتۂ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں، دل کے جوشش بے اختیار سے خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا تو ابتداء میں چند دنوں تک طبیعت رکی رکی رہی، لیکن جوں ہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہو گئیں اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس شورش کدۂ ہستی میں افسردگی و خمار آلودگی کا کبھی گزر ہی نہیں ہوا تھا:

به بد مستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
هنوز از بادۂ دو شینه ام پیمانه بو دارد

اتنا ہی نہیں بلکہ کہنا چاہئے، شورش تازہ کی سرمستیاں، مجالس دوشیں کی کیفیتوں سے بھی کہیں تند تر ہو گئیں:

چه مستی ست، نه دانم که رو به ما آورد
که بود ساقی و ایں باده از کجا آورد

سبحان اللہ! عالم روح و قلب کے تصرفات کا بھی کچھ عجیب حال ہے، یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دور نہیں ہوا، یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کھلی کہ قلم روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا:

شوریست نوا ریزی تار نفسم
پیدا نهٔ اے جنبش مضراب کجائی؟

بہر حال کام شروع ہو گیا اور اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لئے بھی ضروری تھی سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا، پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق

نہ تھے، صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی، سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں، تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گیا۔

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں

شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم"

یہ ہے ترجمان القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت کی درد بھری داستان!

اس کے بعد دوسری جلد شائع ہوئی جس میں قرآن کریم کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اور تفسیر دونوں موجود ہیں۔ ان دونوں جلدوں کی نظر ثانی مولانا نے قلعہ احمدنگر کے محبس میں کی اور ان کی سنہ ۱۹۴۵ء میں دوبارہ اشاعت ہوئی۔ لیکن اس سلسلہ کی تیسری اور آخری جلد مولانا کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کا مواد تیار نہ تھا؛ مواد بالکل تیار تھا جیسا کہ اوپر مولانا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ وزیر تعلیم ہونے کی وجہ سے مولانا کے فرائض منصبی کی مشغولیتیں کچھ اس قدر زیادہ رہیں کہ وہ اپنے مسودات کو دوبارہ پڑھ کر پریس کے لئے تیار نہ کر سکے۔ چند ماہ قبل ان کے معتمد خاص پروفیسر محمد اجمل خاں نے، جو خود اس کی اشاعت سے ناامید ہو چکے تھے، مجھ سے خواہش کی میں مولانا سے دریافت کروں کہ کیا اس کا مسودہ اشاعت کے لئے ڈھونڈھ نکالا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک دن میں نے معتمد صاحب کی موجودگی میں مولانا سے عرض کی کہ اگر خود انہیں اتنی فرصت نہیں کہ اس جلد کی کتابت و طباعت کی تفصیلات کی نگرانی فرمائیں تو یہ کام میرے سپرد کیا جا سکتا ہے تاکہ میں معتمد صاحب کے ساتھ مل کر اس کو پریس کے لئے تیار کروں اور صرف اسی صورت میں آپ کی ہدایت یا مشورہ حاصل کروں جہاں اس کی قطعی ضرورت نظر آئے۔ مولانا نے میری تجویز سے اتفاق فرمایا، لیکن دو دن بعد مجھ سے فرمایا کہ "میں نے مسودہ کی تلاش کی۔ وہ یہاں نہیں ہے (یعنی ۴/ کنگ ایڈورڈ روڈ،

نئی دھلی) ۔ میرا خیال ھے کہ وہ ان صندوقوں میں سے کسی ایک صندوق میں پڑا ھوگا جو قلعہ احمد نگر کے محبس سے لائے گئے تھے ۔ یہ صندوق کلکتہ میں ھیں ۔'' ۲۲ فبروری سنہ ۱۹۵۸ ء کے المناك واقعہ کی وجہ سے احکام قضا کا تو یہ منشا تھا کہ خود مولانا تو اس مسودہ کی تلاش نہ کریں ، یہ کام اب دوسروں کا ھے ! یہ کام علمی مجلسوں کا ھے مثلا ساھتیہ اکاڈمی کا ، جس نے مولانا کی مصنفات کو موزوں شکل میں شائع کرنے کی خواھش کا اظہار بھی کیا ھے کہ وہ اس مسودہ کو ڈھونڈھ نکالے ، نشان دھی تو خود مولانا نے کر دی ھے ۔ اگر یہ مل جائے اور اس کو شائع کر دیا جائے تو قرآن کی خدمت جو مولانا نے کی ھے اس کی تکمیل ھو جائے گی ۔

افسوس اس بات کا ھے کہ مولانا نے قرآن پر جتنا کام کیا ھے وہ اس تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باھر ھے جو اردو زبان سے واقف نہیں ۔ اگر ابتدا ھی سے ۔ الہلال کی اشاعت کے ابتدائی ایام ھی سے ۔۔ اس امر کی کوشش کی جاتی کہ قرآن کی تفسیر کا جتنا کام مولانا نے کیا ھے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کردیا جائے ، جس کو اکثر ممالك کا روشن خیال طبقہ سمجھتا ھے اور نیز عربی ، فارسی اور ترکی زبانوں میں اس کے ترجمے کردئے جاتے جو مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی زبانیں ھیں اور اسی طرح ھندوستان کی ممتاز زبانوں میں بھی یہ کام ھو جاتا تو ممکن تھا کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ھو جاتا اور اس کے نتیجہ کے طور پر دنیا بھر کے مسلمان دوسرے مذاھب کے پیروؤں سے زیادہ قریب ھو جاتے ، کیوں کہ یہی مقصد ان کی تمام تحریرات کا تھا !!"

تاھم اس سمت میں اب بھی ابتدا کی جاسکتی ھے ۔ اپنی تمام کتابوں میں مولانا آزاد سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو سب سے زیادہ اھم سمجھتے تھے جس میں انھوں نے قرآن حکیم کے اساسی تصورات کی

وضاحت کی ھے جو اس سورۃ کی سات مختصر آیتوں میں اجمالا موجود ھیں - جہاں تک مجھے معلوم ھے تین سال قبل انہیں یہ خیال آیا کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ھو جانا ضروری ھے - انہوں نے ڈاکٹر سید محمود سے کہا کہ وہ مجھ سے دریافت کریں کہ کیا میں اس کام کے لئے آمادہ ھوں - اس معاملہ میں مولانا کی خواھش میرے لئے گویا حکم تھی - خدا کے فضل سے کام انجام کو پہنچا، اور مولانا نے دینیاتی اصطلاحات کے ترجمہ کے سلسلہ میں جو مشورے دئے ان کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا - لیکن اس کی اشاعت سے پہلے مولانا نے خیال کیا کہ اس کی ایک تلخیص شائع کردی جائے جس کا عنوان ”قرآن کے اساسی تصورات“ رکھا جائے - اس تلخیص کو مولانا نے خود ملاحظہ فرمایا اور پریس کو روانہ کرنے کی ھدایت فرمائی، چنانچہ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کے پہلے ھفتہ میں اس کو مدراس کے ڈیوسی سن پریس بھیج دیا گیا - یہ مئی کے اختتام تک شائع ھو جائے گی، اس کے بعد سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ترجمہ طباعت کے لئے دے دیا جائے گا - خیال یہ تھا کہ اس کے بعد سارے ترجمان القرآن کا انگریزی میں بالأقساط ترجمہ شائع کیا جائے - اب یہ کام ھو بھی سکے گا یا نہیں میں کچھ بتلا نہیں سکتا - ”قرآن کے اساسی تصورات“ اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ترجمہ دونوں اپنے ٹھیک وقت پر شائع ھو جائیں گے - لیکن غم اس بات کا ھے کہ یہ اس وقت شائع ھوں گے جب وہ ھم میں نہ ھوں گے!

ان کے آخری وقت کا نظارہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ھے! شاید اس کا دیکھنا میرے لئے مقدر تھا - میں جب حیدرآباد سے نئی دھلی کو روانہ ھوا تو میرے پیش نظر انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس کے سالانہ اجلاس کی شرکت تھی جو ۱۴ اور ۱۵ فبروری سنہ ۱۹۵۸ء کو ھونے والا تھا - میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ میں دھلی مولانا کی تجہیز و تکفین کے لئے جارھا ھوں - ھمیشہ کی طرح اس دفعہ

بھی میں ان ھی کے مکان میں ٹھیرا اور ۱۶ فبروری کو دھلی سے رخصت ہونے والا تھا ۔ میں نے ریل میں اپنی جگہ بھی محفوظ کرالی تھی اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہاں کچھ عرصہ اور ٹھیر جاتا ۔ لیکن سولھویں کی صبح کو مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی روانگی ملتوی کردوں اور کچھ دن اور ٹھیر جاؤں ۔ میں ٹھیر گیا ، لیکن محض اس لئے کہ اس غم میں شریک رھوں جو سبھوں پر نازل ہونے والا تھا ۔ انہوں نے مجھسے ٹھیر جانے کے لئے کیوں کہا؟ کیا آنے والے واقعہ کی انہیں خبر ہو گئی تھی ؟

میرے قلب میں ابھی ان کا غم تازہ ھے ، اور میرے لئے موزوں الفاظ میں یہ بتلانا ممکن نہیں کہ میری نگاہ میں ان کی بحیثیت عالم اور بحیثیت انسان کتنی قدر تھی ۔ یہ جو کچھ بھی میں نے لکھا ھے بڑی مشکل سے لکھا ھے ۔ مجھے ان کی کتابوں سے ان کے قلب و روح کے مشاهدہ کا موقع ملا ھے ۔ یہ بھی میری خوش نصیبی ھے کہ ان کی عمر کی آخری منزل میں کبھی کبھی کچھ وقت سکون کے ساتھ ان کی صحبت میں بسر کرسکا اور ان کی شرافت نفس سے محظوظ ہوا ۔ دعا ھے کہ ان کی روح کو سکینت تامہ نصیب ہو! وہ بھی ان برگزیدہ افراد میں سے تھے جو اپنی زندگی کی ابتلاء سے گزر کر جب واپس ہوتے ھیں تو انہیں ندا آتی ھے :

یا ایتها النفس المطمئنة *	اے اطمینان والی روح ! تو اپنے پروردگار کی
ارجعی الی ربك راضیة	طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش
مرضیة * فادخلی فی	اور وہ تجھ سے خوش ، پھر تو میرے بندوں
عبادی* و ادخلی جنتی*	میں شامل ہوجا اور میری جنت میں
(پ ۳۰ ع ۱۴)	داخل ہوجا ۔

«تذکرہ» اشارات و کنایات میں

از

محمد مجیب

'تذکرہ' کے اختتام پر مولانا آزاد فرماتے ہیں: "ان اوراق پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا۔ اب وہ مصر ہیں کہ خود اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصلی مقصد یہی تھا" 'تذکرہ' کو مسلمانوں کی دینی فکر کے ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ محض ایک مقالہ ہی نہیں؛ وہ ایک رمز ہے، ایک شخصیت ہے۔ وہ آگ ہے، جذبہ کی آگ، ایک ملہم من اللہ داعی کا قال، ایک قلب عظیم کا حزن عظیم، ایک المیہ کا محزون نغمہ اور فتح کا ایک فرحت زا زمزمہ! وہ ایک خود نوشت سوانح ہے جو ایک تصور میں منقلب ہوگئی ہے، پھر یہ تصور "استخوان و ریشہ" میں صورت پذیر ہوگیا ہے!

لیکن 'تذکرہ' ایک حیرت انگیز کتاب بھی ہے۔ اس کے ناشر مرزا فضل الدین کی جو تمنا تھی اس کے مطابق تو نہیں۔ ان کا پیش لفظ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بظاہر اس قسم کے مشاہیر پرست نظر آتے ہیں جن سے تمام مشاہیر بھی مایوس ہوجاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ وہ مولانا سے پہلی دفعہ سنہ ۱۹۰۲ء میں واقف ہوئے جب مولانا ابھی طالب علم تھے اور بعد میں ان کی ترقی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ جب مولانا نے الہلال شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کو دم بھر میں مسخر کرلیا، تو مرزا فضل الدین نے خیال کیا کہ اس قوی شخصیت کے شیدائیوں کو کچھ اس کا حال بھی جاننا چاہئیے۔ لیکن مولانا نے ان کی اس خواہش کو کہ وہ اپنی ایک سوانح حیات تحریر فرما دیں پہلے تو مذاق میں ٹال دیا اور پھر صاف صاف انکار کردیا اور کہا کہ "کتنی

بزرگ اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح وحالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو چھوڑ کر میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک تمسخر انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن شکر ہے کہ مرزا صاحب لطیف الطبع واقع نہیں ہوئے تھے، انہوں نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا اور اپنی سخت کوششوں کے بعد مولانا سے وعدہ لے ہی لیا۔ جون ۱۹۱۶ء سے اکتوبر ۱۹۱۶ء تک ہر ہفتہ مولانا کچھ صفحے لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کے دیکھنے سے مرزا صاحب نے خیال کیا کہ مولانا سب سے پہلے اپنے خاندانی حالات مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ "لیکن جوں جوں سلسلہ آگے بڑھتا گیا نئی نئی بحثیں نکلتی گئیں اور ہر بحث کو وہ اپنی عادت کے مطابق تفصیل سے لکھنے لگے اس پر" مرزا صاحب کو "خوف ہوا کہ کہیں اس ضمن میں اصلی مقصد نہ رہ جائے" چنانچہ انہوں نے بار بار اختصار کے لئے اصرار کیا۔ لیکن مولانا نے لکھا کہ "میری طبیعت میں رکاوٹ پیدا نہ کرو، جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں جمع کرتے جاؤ۔ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا" لیکن مرزا نے اپنی کوششیں ختم نہیں کردیں۔ وہ رانچی گئے جہاں مولانا کو نظر بند کیا گیا تھا، اور ان کے حالات زندگی کے متعلق پندرہ سوالات قلم بند کرلئے اور ان کی خدمت میں بھیج کر اصرار کیا کہ وہ ان کا تفصیلی جواب دیں۔ لیکن مولانا نے اپنی ذات کو شاعرانہ رمزیت کے منقش پردہ میں مستور کردیا اور روحانیت میں کچھ ایسے مستغرق ہوگئے کہ ان کی مادی زندگی محض ایک خیال بن کر رہ گئی۔ مرزا فضل الدین نے محسوس کیا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ لیکن ہم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک کوئی تذکرہ اسی طرح نہ لکھا جائے جیسا کہ خود مولانا نے لکھا ہے وہ کس قدر گمراہ کن ہوسکتا ہے۔

تذکرہ دو جلدوں میں شائع ہونے والا تھا۔ باوجود

مرزا فضل الدین کی قطع و برید کے اور باوجود طویل حواشی نظر انداز کردئیے جانے کے وہ دو جلدوں سے کم نہیں ہوسکتا تھا ۔ لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ دوسری جلد کی اشاعت کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی تو انہوں نے خود نوشت سوانح کا تذکرہ کی پہلی جلد کے آخر میں اضافہ کردیا ۔ تذکرہ سے زیادہ شائد ہی کوئی کتاب ناشر کے توقع کے خلاف ہوسکتی ھے اور بہت ہی کم ایسا ہوا ھے کہ ایک مصنف اپنے تخیل اور قلم کو آزاد چھوڑ کر اور دلیل و حجت کی ترتیب و تسلسل کے خیال سے فارغ ہوکر بھی کسی ناشر کے جال میں گرفتار ہوا ہو!

مولانا نہ اپنے متن کی نظر ثانی کرسکے، نہ حوالوں کی جانچ کرسکے اور نہ پروف ھی پڑھ سکے ۔ انہیں اس وقت اطلاع ملی جب کتاب کا دو ثلث سے زیادہ حصہ چھپ چکا تھا ۔ انہوں نے اتنا ضرور کہا کہ ”لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ھیں، اپنی پریشان خاطری اور پراگندگی طبع کی بھی ایک یادگار رھے تو بہتر ھے، ع

بگزارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند“

اسی بے روک آمد کی وجہ سے ”تذکرہ“ افراد کا اس قدر مؤثر بیان اور اخلاق و مذھبی مسائل کا اس قدر پر جوش مذاکرہ بن گیا ھے ۔ اسی وجہ سے وہ مولانا آزاد کی شخصیت کی کسی صحیح سے صحیح لکھی ہوئی سوانح حیات سے زیادہ صحت کے ساتھ عکاسی کرتا ھے ۔ تذکرہ خارجی رنگ کی کوئی تحریر نہیں ۔ وہ صداقت کی حمایت ھے جس کے لئے عمیق علم، الفاظ پر کامل قدرت اور ایک عظیم قوت و اثر والی انشاء سے کام لیا گیا ھے ۔ مولانا آزاد بھی واقف ھیں کہ اس میں بعض جگہ کچھ غلو و اغراق پایا جاتا ھے ۔ لیکن ان کے خیال میں یہ ناگزیر ھے، اور اس سے ان کا مقصد خیالات کو قوت کے ساتھ ظاہر کرنا ھے ۔ انہیں

اس امر کا بھی شعور ہے کہ اس غلو و اغراق میں ایک ایسا حسن موجود ہے جو قارئین کو فریفتہ و مفتون کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

سوال تو کچھ عجیب سا ہے لیکن ہمیں اس کو اٹھانا ہی پڑتا ہے کہ آخر 'تذکرہ' شروع کہاں سے ہوتا ہے؟ کیا ابتدا ہی سے جہاں مولانا نے اپنے خاندان کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور اپنی دلیل اس بات پر ختم کی ہے کہ ع

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

یا یہ آخر سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ اپنی سوانح حیات بیان کرتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ تذکرہ اس وقت تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا جب تک کہ ہم اس کا مطالعہ آخر سے شروع نہ کریں جہاں مصنف نے اپنا ذکر کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی ذہنی کیفیت سمجھ میں آتی ہے بلکہ ان کی انشاء بھی، کیوں کہ ان کی فصاحت و بلاغت، ان کی رمزیت، اردو زبان پر ان کا کامل اقتدار محض ادبی کمالات ہی نہیں بلکہ اس روحانی قوت کا نتیجہ اور اس تجلی کا ثمرہ ہیں جن کا تعلق محض اس دنیا سے نہیں۔ تذکرہ ایک قوی مذہبی حال یا کیفیت کا ثمرہ ہے اور اسی حال کے زیر اثر اس کا مطالعہ بھی کیا جانا چاہئے۔

"یہ غریب الدیار عہد و ناآشنائے عصر، بے گانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم باحمد و مدعو بأبی الکلام ہے، سنہ ۱۸۸۸ء مطابق ذو الحجۃ سنہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتوا فانتبھوا

شورے شد از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ، غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعہ

ذیل سے هجری سال کا استخراج هوتا ہے:

"جوان بخت و جوان طالع، جوان باد"

سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی، نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہنوردی اور منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا، اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور اور نشان منزل گم۔ کیسۂ زاد خالی اور سر و سامان کار ناپید۔ وقت جاچکا اور ہر آن و ہر لمحہ کاروان مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے پھر بھی وہ دولت وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی؟ اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جاچکا:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

ساری فیروز بختی و جوان طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے: "یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ" اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے، اور جوان بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے "لکل امریٔ منہم یومئذ شأن یغنیہ"، اگر وہاں روح و ریحان و جنت نعیم اور فوز عظیم کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی تو پھر بخت ارجمند ہے اور طالع طالع بلند۔ لیکن اگر "وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترھقہا قترۃ" اور "لا بشری یومئذ للمجرمین" کی رسوائی و مایوسی ملی، تو پھر اس حرمان نصیبی کے لئے کبھی امید ہے

نہ اس ماتم حسرت کے لئے کبھی خاتمہ ۔ بخت اسکندری اور تخت جمشیدی بھی ہاتھ آئے تو لے کر کیا کیجئے؟

گر بدانم کہ وصال تو بدیں دست دھد
دل و دیں را ھمہ در بازم و توفیر کنم"

ان خیالات میں استغراق کے باوجود ہمیں صدمہ ہوتا ہے کہ مولانا واقعات اور تاریخوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں:

"آبائی وطن دھلی مرحوم ہے:

سلام علی نجد، و من حل بالنجد!

مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ، و دار الھجرۃ سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گزاران عشق و کعبۂ نیاز مندان شوق، علی صاحبہا الصلاۃ و التحیۃ:

دارم دلے گرداں، کہ من قبلہ نما می خوانمش
رو سوئے ابرویش کند، ھر چند می گردانمش

اور وطن حقیقی کی نسبت کیا کہئے کہ بحکم "کن فی الدنیا کأنك غریب" ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافران ہستی ایك ھی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایك ھی مستقر و موطن درپیش البتہ کسی کے لئے "ساءت مستقرا و مقاما" میں داخل اور کسی خوش نصیب کے لئے "حسنت مستقرا و مقاما"...

مولد و منشأ طفولیت "وادی غیر ذی زرع" عند بیت اللہ المحرم ہے، یعنی مکہ معظمہ زادھا اللہ شرفا و کرامۃ، محلہ قدوہ، متصل باب السلام...

اس وقت کہ سنہ ۱۳۳۰ھ قریب الاختتام ہے، قافلہ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تك پہنچ چکا

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعبا؟
فقلت ھل قبل الثلاثین ملعبا؟

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے

اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں:

کس نمی گویدم از منزل آخر خبرے
صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش ست!

جتنی زندگی گزر چکی گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز اور فکر گم گشتہ حیران اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگزشت و روئداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیوں کر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتا ہے، طوفان نے درخت گرادئے، سیلاب نے عمارتیں بہادیں، عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کئے، خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری پوری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید و نصف ماتم یاس!

عاشق نہ شدی، محنت الفت نہ کشیدی
کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید؟

پہلے مجسم امید تھا، اب سرتاپا حسرت ہوں:

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام، اس کو خواب نہیں!

اس پر بھی اگر داستان سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگزشت سن لیجئے۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانہ و راز نہیں جس کے لئے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے، صرف ایک نالۂ گرم اور آہ سرد میں پوری حکایت ختم ہے:

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت
خاقانی را دگر شب آمد!

ایک صبح امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی:

همچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت!

ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کرسکا.

بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا
چراغ جلتا نہیں کہیں کا!

یا امید و حسرت کے دو دن، ایک ہوس تعمیر میں بسر ہوا، ایک ماتم تخریب میں! ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا تو راکھ کا ڈھیر تھا جس پر خوب جی بھر کے آنسو بہائے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں هم آغوش است
زمانہ جام بدست وجنازہ بر دوش است

ابو طالب کلیم (وفات سنہ ۱۶۵۲ء) نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی:

بد نامی حیات دو روزے نہ بود بیش
آنہم کلیم با تو چہ گویم چساں گزشت
یك روز صرف بستن دل شد باین و آں
روزے دگر بکندن دل زین و آں گزشت

اور در اصل اس شعبدہ گاہ هستی کی بڑی سی بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے: "لم یلبثوا الا عشیة او ضحٰها" اور "قالوا لبثنا یوما او بعض یوم"....عہد طفلی ایک خواب عیش تھا:

حیف صد حیف کہ ما زود خبر دار شدیم!

آنکھیں کھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواهشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستان هستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنے طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبح قریب کے لئے نہ تو سوز و تپش

کی دوپہر ہے نہ نا امیدی و نا کامی کی شام - یہ سارا شہرستان امید اور نگار خانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کامجوئیوں کے لئے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ہے - جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی - معلوم نہیں اپنی گنبد غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی یا نو گرفتاران طلسم شباب کی ہوش ربائیوں کے لئے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے:

شہر یست پر زخوباں ، وز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عام ست گرمی کنید کارے!

غفلت و مدھوشی نے افسون پھونکا، سرمستی اور سرگرانی نے جام بھرے، جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزل مقصود سمجھا - ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی لیکن پھر اس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا، راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا:

ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہاست!

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آباد الفت و پرستش نظر آیا جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا، ہر مندر جبین نیاز کا طالب، ہر مورتی دلفروشی و جان سپاری کے لئے وبال ہوش، ہر جلوہ برق تمکین و اختیار، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار

الفراق اے صبر و تمکیں، الوداع اے عقل و دیں

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا، جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا، ایک قید ہو تو ذکر کیجئے، ایک زنجیر ہو تو اس کی کڑیاں گنیئے - دل ایک تھا مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے، نظر ایک تھی مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا، ہر کشش نے اپنا تیر چلایا، ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی، ہر فسوں ساز نے اپنا فسون محبت پھونکا - ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف

اپنے ہی دام الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراک اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا :

واے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند!

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہوجاتی، وہ برابر بڑھتی ہی گئی :

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پائے

کار از دوا گزشتہ و افسوں نہ کردہ کس!

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا تو سربلندی و سرفرازی کے لئے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامال کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑگئی تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی، کبھی باد صبا کی روش پسند آئی تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی، آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آب رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی، اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آگئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے، لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشت غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی :

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ سدا

در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے :

ھاں ! بانگ بلند ست ایں ، پوشیدہ نمی گویم

.... ساری ھلاکت اس میں ھے کہ ھنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفس لوامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی اور پہنچتی ھے تو خود ھمارے ھی ھاتھ سرشاری و بدقسمتی کے نقاروں پر اس زور سے پڑ رھے ھیں کہ ان کے شور و غل میں یہ سر گوشی ملامت کب کام دے سکتی ھے؟ ....

لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینوں سے بڑھکر یہ حقیقت ھے کہ:

کار ساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا کچھ عجیب حال ھے:

کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد

ھر چند راہ ایک ھی ھے لیکن کرشمے بے شمار ھیں اور گو ھوش سب کھوتے ھیں مگر ایک ھی جلوہ سے نہیں۔

اے ترا با ھر دلے رازے دگر
ھر گدا را بر درت نازے دگر !

کوئی پکارتا ھے اور دروازہ نہیں کھلتا ، کوئی بھاگتا ھے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ھیں۔ قانون طلب و سعی سے انکار نہیں، لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاھے تو اس کا ھاتھ پکڑنے والا کون ھے؟ ....

ناگہاں جاذبۂ توفیق الہی پردۂ عشق مجاز میں نمودار ھوا اور ھوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاھراہ عشق و محبت تک پہنچادیا۔ آگ لگتی ھے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ھیں ، سیلاب آتا ھے تو بتدریج پھیلتا ھے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ھوئی ، چمکی ، اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا:

می گزشتم ز غم آسودہ کہ ناگہ ز کیں
عالم آشوب نگاھے سر راھم بگرفت

اصل میں منزلیں تین ھی ھیں : ھوس ، عشق ، حقیقت

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم ، پختہ شدم ، سوختم !

اور یہاں عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ھے ، نہ کہ علی الاطلاق ، کیوں کہ اس اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ھے عشق ھی ھے - تمام کائنات ھستی میں بجز اس کے ھے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ھے تو یہی ھے ، زمین کا مدار اور محور قائم ھے تو اسی کے دم سے - دنیا میں جس قدر ظاھر ھے یہی ھے ، جس قدر باطن ھے اس کے سوا کچھ نہیں - یہ دوسری بات ھے کہ تمھاری نگاہ وحدت ناآشنا نے ایک ھی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کردیا ھو - کتنے ھی پردے ھیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمال حقیقت یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ھیں ، ورنہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ھر کجا می نگری ، انجمنے ساختہ اند !

بلا شبہ یہ بھی لغزش تھی - لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر گرادے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ھے - اگر لغزش و مستی ھی رھنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ھزار استقامتیں اس پر قربان ھوں لاکھوں ھوشیاریاں اس پر سے نچھاور :

گر طمع خواھد ز من سلطان دیں
خاک بر فرق عنایت بعد ازیں !

اصل یہ ھے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ھے اور قرب ایک منزل ھے جس تک پہنچنے کی راہ بعد ھی میں سے ھو کر نکلی ھے - یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کے لئے سب سے کٹنا - اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ھے کہ وہ تمام دروازے بند کر دئے جائیں

جو پہلے کھول لئے گئے تھے:

در قبول نظر عشق ہزاران شرط است

اول از عافیت رفتہ ندامت باشد

..... اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ما سوی اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں ـ اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کوئی ایسا طاقت ور ہاتھ آمادہ عقدہ کشائی ہو کہ گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے ـ ایک کے بعد ایک ساری زنجیریں کھلتی جائیں ـ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا ایک ہی بھر پور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے ـ نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کی انتظاری ـ ایک سوکھی لکڑی کے جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے ـ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لئے بجلی کی ایک ہی نظر شعلہ بار کافی ہوتی ہے:

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی؟

از یک نگاہ کشت، جوابے دگر نہ داد!

..... عشق مجازی اور عشق حقیقی میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے: ایک کے لئے سب کا چھوڑنا! یہی وجہ ہے کہ اس سفر کی سب سے اقرب منزل مجاز ہی سے ہو کر نکلی ہے:

بادہ گر خام بود، پختہ کند شیشۂ ما!

...... ہوس اور عشق پر کیا موقوف ہے، کوئی درمیانی منزل ہو، اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو پھر وہی منزل بت ہے اور رہرو اس کا پرستار ـ تسبیح آرائی اور دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو ـ من شغلك عن اللہ فھو صنمك ـ کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا خوش کام ہوئے اور چل نکلے

اور نامرادی نہیں ھے مگر اٹکنے اور رہ جانے میں :

یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راھم دور شد !

... چنانچہ الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا ۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کرکے دیکھ ڈالے ۔ کوئی گوشہ کوئی مقام باقی نہ چھوڑا ...

اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ھیں ، لیکن ھر رھرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ھے : یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش یا شمع کی خاموشی و سوزش :

وللناس فی ما یعشقون مذاھب !

... اور معلوم ھے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ھے مگر تنور کی طرح اندر ھی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ھونا مشکل ھے :

عریاں تنی خوش ست ، ولے زیب دیگر ست

دامان چاک و گریباں دریدہ را !

... اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ و زاری کی ھو تو کی ھو ۔ یہاں ایک ایک گھڑی ، ایک ایک لمحہ ایسا گزر چکا ھے کہ سیکڑوں آھیں اندر ھی اندر پھنکی ھیں ، ھزاروں شورشیں سینہ کے اندر ھی اندر جلی ھیں ۔ آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی ، تو دل کے گوشے ھی میں طوفان اٹھاتے رھے :

انداز جنوں کونسا ھم میں نہیں مجنوں

پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے !

اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاھر ناکامی و مایوسی پر ھوا ، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی ۔ اس ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی ...

وھی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام

لنڈھائے تھے، اپنے ہر جلوے سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی اور سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب اس کا کونہ کونہ، چپہ چپہ ھوشیاری و بینش کا مرقع تھا، بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاک پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں، آسمانوں کو بارھا اترنا پڑا کہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی ھی مرتبہ اچھالنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہوجائے، سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، سب نے نقاب اتار دئے، سارے پردے چھلنی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں . . .

حالات ابتدا سے جیسے اور جتنے رھے سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے جن تک بتدریج رسائی میسر آئی۔ قطع نظر اس معاملۂ خاص کے، عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ھے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ھوں . . . جو کچھ پایا ھے صرف بارگاہ عشق سے پایا ھے، جتنی رھنمائیاں ملیں صرف اسی مرشد فیض و ھادی طریق سے ملیں، . .

علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اس کے دست کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وھی معلم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وھی رھبر تھا، قرآن کے بھید اسی نے بتلائے، سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی، دل اس نے بخشا۔ کونسی مشکل تھی جو اس سے حل نہ ھوئی؟ کونسا الجھاؤ تھا جو اس کی ایک سلجھی ھوئی نظر سے سلجھ نہ گیا؟ کونسی بیماری تھی جس کی دوا اس کے دارالشفاء سے نہ مل سکی۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

.... ھاں یہ ضرور ھے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے زھد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ھو تو ھم کو بھی اپنی اس رندی و ھوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں، جس کو عین اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنون شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ھوتا ھے) دونوں ھاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایك قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ھے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی، لیکن ھم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ھی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ھی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ھی زنجیریں توڑنی پڑیں، ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ھی دفتر خود اپنے ھاتھوں جلانے پڑے، جب کہیں جاکر اس کوچہ میں دم لے سکے، جہاں آج اپنے کو پا رھے ھیں:

ھزار دام سے نکلا ھوں ایك جنبش میں
جسے غرور ھو، آئے کرے شکار مجھے!۔۱"

مسلمانوں کی فکر دینی کا یہ کمال ھے کہ اس میں شریعت و طریقت (تصوف) کا ایك خوشگوار امتزاج پایا جاتا ھے، اور احکام الٰہیہ کی محض ظاھری تعمیل کے خلاف 'اشد حبا للہ' کی اھمیت پر زور دے کر ریاء و نفاق کے میلان کو ختم کیا گیا ھے۔ اور بعض مقامات پر نادم و تائب کو خدا کی نظر میں اس پابند شریعت سے افضل قرار دیا گیا ھے جس کا قلب جاذبۂ الٰہیہ سے خالی اور جس کی اطاعت و عبادت محض رسمی ھوتی ھے۔ لیکن دین میں آزادی و بے قیدی کی حمایت 'تذکرہ' کا مقصود نہیں۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد نے یہاں خاص قوت کے ساتھ راسخ الاعتقادی کی انتہائی اھمیت پر زور دیا ھے، ان افراد کی

(۱) تذکرہ، مطبوعہ البلاغ پریس، نقش اول سنہ ۱۹۱۹ ص ۲۸۷ تا ۳۱۰۔

راسخ الاعتقادی پر جنھوں نے زمانہ ساز عالموں ، کچے صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے خلاف صداقت یا کلام اللہ کی حمایت کی ۔ وہ کسی خاص مسلک فکر کے پیرو یا حامی نہیں ، وہ قرآن یا شریعت کی کوئی خاص توجیہ یا تعبیر نہیں پیش کرتے ۔ ان کا تعلق خاطر صرف حق تعالی کے 'فضل' سے نظر آتا ھے اور یہ تعلق اس قدر قوی ھے کہ وہ صحیح قسم کی راسخ الاعتقادی کو حق تعالی ھی کے فضل کا ثمرہ سمجھتے ھیں !

تذکرہ کی ابتدا مولانا آزاد کے خاندان کے ذکر سے ھوتی ھے ۔

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ھوئے ھیں اور تینوں خاندان ھندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ھدایت میں سے ھیں ۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواھش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ھمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انہوں نے قبول کیا ، کبھی رد کر دیا ۔" مولانا آزاد نے ان چیزوں کا تذکرہ صرف یہ ظاھر کرنے کے لئے کیا ھے کہ "خاندان کوئی فخر و شرف کی چیز نہیں" اور " ایک لمحے کے لئے ان کی طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ نسب فروشی کی دکان آراستہ کر کے نقد عزت و شرف کی جستجو کی جائے" ۔ پھر وہ شیخ جمال الدین دھلوی (وفات سنہ ۱۵۸۱ء) کے کچھ حالات لکھتے ھیں جو ان کے مادری سلسلہ کے ایک مورث اعلی تھے ۔ پھر ان کی توجہ اس زمانہ کے مسائل کی طرف منعطف ھوتی ھے جب مولانا جمال الدین زندہ تھے ، (مثلا) عہد اکبری کے واقعات اور اس کا امام اور خلیفہ بن بیٹھنا ۔ یہ زمانہ نہ صرف مباحثے اور مناقشے کا زمانہ تھا بلکہ روح کی سخت بے چینی کا بھی ۔ صوفیاء جو سریان وجود کے قائل تھے ، بھکتی جو تمام انفرادیت کو ختم ھی کرنا چاھتے تھے ، تہذیب کے دلدادہ جنہیں ھر چیز میں اور ھر جگہ عقلی غذا کی تلاش تھی ، اھل سیاست جنہیں مملکت کی خاطر اتفاق و اتحاد کے حصول کی فکر تھی ، عورتیں جو خانگی زندگی میں نئے رسوم و رواج

ایجاد کر کے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں ۔۔ ان سب نے ایک ایسے ماحول کو جنم دیا تھا جس میں یہ نظر آتا تھا کہ اخلاق احکام و قوانین کی پابندی کے بغیر بھی زندگی بسر کی جاسکتی ھے! یہ ایک ایسا زمانہ بھی تھا جس میں ارباب صدق و صفا پر ان علماء دینیات کی جانب سے ان کے مذھبی اساس پر حملے کئے جارھے تھے جن کے نزدیک موجودہ حالات کو برقرار اور باقی رکھنا گویا ان کا حق تھا ۔ تذکرہ کی ابتدا میں مولانا آزاد نے جس مسئلہ سے بحث کی ھے اس حد تک ان حملہ آوروں کے قائد و رھنما دنیا پرست علماء کا گروہ تھا اور حامی صدق و صفا سید محمد جونپوری تھے ۔ سید محمد کی نسبت بیان کیا جاتا تھا کہ مہدی ھونے کے مدعی ھیں اور مسلمانوں کے عقیدہ کی رو سے مہدی کا ظہور آخر زماں میں قیامت کے قریب ھوگا ۔ دنیا پرست علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت میں اور ان کے دینی و اخلاقی اثر کو مٹانے کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کی ۔ سید محمد کے خلاف ان کا کھلا اعتراض تو یہ تھا کہ یہ مہدی آخر الزماں ھونے کے مدعی ھیں اور مولانا آزاد جس بات پر زور دیتے ھیں وہ یہ ھے کہ مخالفت کا اصلی محرک سید محمد کی ”دعوت و تبلیغ حق و احیاء شریعت و قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ تھی نہ کہ محض ان کا دعوی مہدیت ۔ سید موصوف کی جانب ”طرح طرح کے دعاوی و شطحیات منسوب کئے گئے ھیں“ اور اس کا ذکر کرتے ھوئے مولانا آزاد نے کھل کر اس مسئلہ پر بحث کی ھے کہ کس طرح ”بڑے بڑے کاملین و واصلین کا معاملہ دعاوی و شطحیات تک پہنچ گیا تھا“ اور کس طرح اب یہ عام اصول قرار دیا گیا ھے کہ ”کلام السکاری یحمل و یصرف عن الظاهر“ یعنی ان مدھوشان بادۂ وحدت کے کلام کو مصروف عن الظاھر قرار دے کر ان کی تأویل کرلی جاتی ھے ۔ یہاں پر مولانا آزاد کا مسلک واضح ھوجاتا ھے ۔ اھل اللہ کی شناخت حق تعالی کا وہ فضل ھے جو ان کے حال پر ھوتا ھے ۔ سچے مؤمن کا

کام ھے کہ ان کے اقوال سکریہ کو مصروف عن الظاھر قرار دے کر ان کی تأویل کرلے - مولانا آزاد کے لئے چند مزعومہ عقائد پر غرور باطل اور عمل صالح اور ایثار و محبت فی اللہ کو کوئی شیء قرار نہ دینا بہت بڑا فتنہ ھے" اور آج مسلمانوں کی ریڑھ کی ھڈی اس سے گھلی جارھی ھے"، انہوں نے اپنی تمام ادبی قابلیت سے کام لے کر ان ارباب صدق و صفا کی فضیلات کو بیان کیا ھے جنہوں نے سید محمد، شیخ علائی، (وفات سنہ ۱۰۰۰ء) ، شیخ نیازی، مولانا جمال الدین کی طرح اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں اپنی جان و مال کا انفاق کیا ھے، اور علماء سوء کی غیر اخلاقی و مہلک حکمت عملی کی مذمت کی ھے جیسے عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبد النبی -

آخر الذکر دونوں علماء اس جماعت کی نمائندگی کرتے ھیں جس نے قانون شریعت میں حیل، سفسطہ سے کام لیا اور اخلاق صحیحہ کی طرف سے بے رغبتی پیدا کی - مولانا آزاد کو عہد اکبری میں وھی حالت نظر آتی ھے جو اس سے پہلے بھی اھل اللہ کو پیش آئی تھی اور جن کا انہوں نے مقابلہ کیا تھا مثلا امام حسین، حضرت سعید بن مسیب، امام مالک، امام حنبل اور امام ابن تیمیہ - وہ اپنے اس دور میں بھی ریب و الحاد کے فتنہ کو محسوس کرتے ھیں اور ایک ایسے جوش و جذبہ کے ساتھ، جس کا جواب ھمیں اردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتا، کلام اللہ کی ازلی صداقت کو پیش کرتے ھیں - وہ یہ محسوس کرتے ھیں کہ ھندوستان میں وہ صرف اکیلے ھی اس کام کے کرنے والے نہیں بلکہ ان افراد کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ھوا شیخ داود (سنہ ۱۰۷۴ء وفات) شیخ احمد سرھندی اور شاہ ولی اللہ وغیرھم نے بھی اس صداقت کی حمایت کی ھے- جس چیز کی ضرورت ھے وہ فہم صحیح، اپنی پوری زندگی کو اعمال صالحہ کے لئے وقف کردینا، اور شر کے مقابلہ کا قوی داعیہ ھے!

تذکرہ بالکلیہ اسلامی روایات سے بحث کرتا ھے ۔ کیا اس بنا پر یہ تصور کرنا صحیح ہوگا کہ یہ مولانا آزد کی فکر دینی کے ارتقاء کی ایک ابتدائی اور نسبۃ خام شکل ھے جس میں ان کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی کلیت کا صرف ایک ھلکا سا رنگ نظر آتا ھے؟ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں تصانیف کے درمیان پندرہ بیس سال کا وقفہ پڑ گیا ھے، اور یہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف حالات میں لکھی گئی ھیں ۔ یہ سمجھا جاسکتا ھے کہ جس حال یا کیفیت کے زیر اثر تذکرہ لکھا گیا تھا وہ ضرور بدل گئے ہوں گے، اور مولانا آزاد نے صداقت کا جو تصور قائم کیا تھا اس میں قطعا وسعت پیدا ھونی چاھئے کیوں کہ اس تصور میں اعمال صالحہ کے لئے اس وسیع دائرہ کو بھی شامل کرنا پڑے گا جو مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ان پر منکشف ھوا ہوگا ۔ لیکن واقعات کا اشارہ کسی اور جانب ھے ۔ مولانا آزاد میں کوئی تغیر نہیں ھوا تھا ۔ وہ ایک مسلم رھنما سے ھندوستان کے ایک سیاسی رھبر نہیں بن گئے تھے! تذکرہ مولانا کے اس 'حال' کا انکشاف کرتا ھے جس میں وہ صداقت کی حمایت کے جاذبہ سے سرشار تھے اور چاھتے تھے کہ اپنی حمایت میں ان لوگوں کی بڑی سی بڑی تعداد پیدا کرلیں جو ان کی روحانی زبان کو سمجھ سکتی ھے اور جس کو ایک اعلی اخلاقی معیار قائم رکھنے کی تاکید کی جاسکتی ھے ۔ تذکرہ میں ان کا سارا استدلال اس وعدہ کو پیش کرتا ھے جس کا ایفاء ترجمان القرآن میں ھوتا ھے اور وہ وعدہ کلام اللہ کی تفسیر و توجیہ کا وعدہ ھے ۔ تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کی تکمیل وتتمیم کرتے ھیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ کا جذبۂ تبلیغ ایک کلی و عمومی رنگ اختیار کرلیتا ھے ۔

اسلام کی تعبیر جدید

از

آصف اے۔ اے۔ فیضی

گزشتہ دو صدیوں میں اشاعت اسلام کا تاریخی حیثیت سے احتیاط کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں اسلام کی ترقی اور اس کے پیروؤں کی عظیم تعداد معاشی، مذہبی اور قومی قوتوں کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ دنیا میں اس وقت ۳۵۶ ملین مسلمان ہیں۔[۱] اب یہ عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اسلام نے ایک عظیم الشان تہذیب پیدا کی؛ اس کے علماء نے ادب، سائنس، فلسفہ، دینیات، تاریخ و قانون کی بڑی خدمت کی۔ جمالیاتی تعقل کے لحاظ سے مسلمان فن تعمیر میں غایت کمال تک پہنچ گئے تھے اور ان کے حسن کاروں نے نقاشی اور موسیقی پر اپنا گہرا اثر چھوڑا اور پچّی کاری، کوزہ گری، خطاطی، جلد سازی، زر دوزی، جامہ سازی اور طباخی کے فنون کو ترقی دی۔ اب علماء اس کو بھی تسلیم کررہے ہیں، گو کسی قدر تأمل کے ساتھ، کہ اسلام کی اشاعت عربوں کی سیف مسلول کی وجہ سے نہیں بلکہ محمد بن عبداللہ کی تعلیم اور شخصیت کی وجہ سے ہوئی، جن کو ٹائن بی نے بنی نوع انسان کا ایک عظیم الشان محسن قرار دیا ہے۔[۲]

یہ ایک جدید رائے ہے؛ اس سے پہلے یورپ میں محمد (صلعم) کو (معاذ اللہ) ایک معبود باطل، کذاب، تفرقہ انداز، یا نبی کاذب سمجھا جاتا تھا۔[۳] رائے کا یہ تغیر نتیجہ ہے اسلام اور اس کی

---

(۱) دیکھو Louis Massignon کی کتاب Annuaire du Monde Musalman پیارس چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۰ء ص ۴۲۸ (۲) دیکھو اس کی کتاب Civilisation on Trial، مطبوعہ لندن، سنہ ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۶ (۳) دیکھو G.F.Piper کی کتاب Islam and the Nether - Lands مطبوعہ لائڈن، سنہ ۱۹۵۷ء۔

زبانوں کے مطالعه کا اور ادراک صداقت کا جو علم کی غایت ہے۔ تاریخ کی ایک نہایت بدیع و مشہور تہذیب کی توجیه محض اس طرح کردینا که یه نتیجه ہے ایک نبی کاذب کی کوشش کا جس نے قوت کے طریقوں سے کام لیا، ایک نہایت احمقانه توجیه ہے! گاندھی جی کے عروج اور ہندوستان کی آزادی نے صاف طور پر ثابت کردیا که روح انسانی کے مقابله میں تلوار ایک نہایت کمزور آله ہے! بہرحال رفته رفته علماء نے اسلام کو مطالعه کے قابل قرار دے دیا اور اب یه بات اصول موضوعه کے طور پر مان لی گئی ہے که اسلام اور اس کی پیدا کردہ قوتوں کا صحیح فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک که اسلامی دین و شریعت کو اچھی طرح نه سمجھ لیا جائے۔ ۱، انیسویں صدی کے دوران میں یورپ کے مستشرقوں نے اس سلسله میں کافی ترقی کی ہے، لیکن ہم پرتگیزی مستشرق سی۔ اسناوک ہورگرونجے کے زیادہ رہین منت ہیں جس نے اسلامی اصول قانون کے مطالعه کا ایک جدید اسکول قائم کیا۔ اس کا اتباع گولڈ زیہر، ونسنک، برگ سٹراسر اور اب سان تی لانه، می لیٹ، شاخٹ اور تیان کر رہے ہیں۔

اسلام میں قانون دین سے علحدہ چیز نہیں۔ یه دونوں چشمے ایک ہی نہر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں شریعت اور فقه کہا جاتا ہے، اسلام کے دینی قانون کے یه دو اعتبارات ہیں۔ شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اور یه تمام اعمال انسانیه پر حاوی ہے۔ فقه کا دائرہ ذرا محدود ہے اور یه ان افعال سے بحث کرتی ہے جن کو عام طور پر قانونی افعال کہا جاتا ہے۔ شریعت سے ہمارا ذہن ہمیشه وحی کی طرف منتقل ہوتا ہے، اس علم کی طرف جو ہمیں صرف قرآن یا حدیث ہی سے مل سکتا ہے۔ فقه میں قوت استدلال پر زور دیا جاتا ہے اور ان استنباطات کو

(۱) دیکھو G. F. Piper کی کتاب Islam and the Nether - lands P.I8 مطبوعه لائڈن، سنه ۱۹۵۷ء۔

جن کی اساس علم پر قائم ہے پسندیدگی کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ شریعت خدا اور اس کے رسول نے مقرر کی ہے۔ فقہ کی عمارت انسانی سعی و کوشش سے تعمیر ہوتی ہے۔ فقہ میں کوئی فعل جائز ہوتا ہے یا ناجائز، حلال ہوتا ہے یا حرام۔ شریعت میں پسندیدگی و ناپسندیدگی کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ فقہ کا لفظ قانون کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی حیثیت ایک سائنس (علم) کی ہے اور شریعت کا لفظ اس قانون کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کی حیثیت اس سبیل رشاد کی ہے جس کا تعین حق تعالی نے کیا ہے۔ بہرحال اس امر کا کھلا اعتراف ضروری ہے کہ ان دونوں میں واضح طور پر امتیاز نہیں کیا گیا ہے اور خود علماء اسلام نے ان دونوں الفاظ کو مترادفات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں ہو یا فقہ میں افعال انسانیہ کی جانچ کا معیار وہی ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ دستور شریعت کے مطابق عمل کر کے حق تعالی کی رضا حاصل کی جائے۔ ۱

جمہوریت کی رو سے مملکت ایک وحدت ہوتی ہے اور اس کے قوانین کا انطباق ہر ایک پر مساوی طور پر ہوتا ہے۔ قوانین غیر شخصی اور خارجی قاعدے ہیں جن کا اطلاق حکومت اپنے تمام شہریوں پر بغیر کسی استثناء کے کیا کرتی ہے۔ لیکن مذہب یا دین کی بنیاد معلمین حق کا شخصی تجربہ ہوتا ہے، اس کا اثر بھی شخصی، فوری اور وجدانی ہوتا ہے۔ گو اس کے قوانین، ارکان عبادت اور سارے ظواہر کا اطلاق کسی جماعت پر کلی طور پر ہوتا ہے تاہم عقیدہ و ایمان کی باطنی روح تو بالکلیہ شخصی و ذاتی چیز ہوتی ہے۔ کوئی حکومت دینی اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتی، ہاں وہ اپنے قوانین کو نافذ کر سکتی ہے۔ اسی لئے قانون کے مشہور و معروف اقوال و امثال میں یہ بھی داخل ہے کہ قانون کی نگاہ میں تمام مذاہب مساوی ہیں؛ خاص عقیدہ کا سوال ایک خارجی

(۱) دیکھو Fyzee, Outlines of Muhammadan Law. 2nd Edition 1955 P. 21

واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ثبوت یا عدم ثبوت دوسرے واقعہ سے فراہم کیا جاسکتا ہے اور عدالت کسی دینی عقیدہ کی صداقت و عدم صداقت کے تعین پر مجبور نہیں۔ دین اسلام یہ تعلیم تو دے سکتا ہے کہ خدائے واحد اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا جائے لیکن وہ یہ حکم نہیں دے سکتا، اور اس کو دینا بھی نہ چاہئے، کہ میں خدا کا ادراک کس طرح کروں اور وہ ایسی اطاعت کو مجھ پر کس طرح لازم کر سکتا ہے۔ "لازم کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ (۱) کسی شیٔ کے کرنے کا امر کیا جائے (۲) اور عدم تعمیل پر سزا دی جائے۔ جس چیز کا تعلق ایمان یا عقیدہ سے ہو اس کو بھلا کوئی خارجی عامل لازم کیسے کر سکتا ہے؟ استاد مجھے تعلیم دے سکتا ہے، اپنی مثال یا نمونہ سے مجھ میں جوش پیدا کر سکتا ہے، میرے ولولہ کو تیز کر سکتا ہے، لیکن مجھے یقین و ایمان کس طرح عطا کر سکتا ہے؟ لہذا قانون کے وضع کردہ قاعدوں میں جن کا نفاذ مملکت کرتی ہے اور ضمیر کے قاعدوں میں جو انسان کا بالکلیہ اپنا معاملہ ہے صاف فرق نظر آتا ہے!

آج اسلام کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ شریعت قانون اور دین دونوں پر حاوی ہے۔ دین کی اساس روحانی تجربہ ہے؛ قانون کی بنیاد جماعت کے ارادہ پر قائم ہے جس کا اظہار اس کی مجلس مقننہ کے ذریعہ ہوتا ہے یا کسی اور قانون ساز اقتدار کے ذریعہ۔ اپنے باطن کے لحاظ سے دین عدیم التغیر ہے، ---- خدا سے محبت خدا ہی کے لئے، ساری دنیا کے صوفی اور صاحب حال یہی کہتے آئے ہیں! اگر اسی ثنویت (ظاہر و باطن) کا نام شریعت ہے تو پھر اس کی ایک قوت دوسری کے خلاف عمل کرتی ہے۔ عرفان حق ایک سر مکنون ہے اور انسان ہمیشہ اس کی تلاش میں رہا ہے۔ اس تلاش میں سب اہل ایمان (ان کا اپنا خاص دین کچھ ہو) مساوی ہیں۔ لیکن قوانین ہر ملک میں ایک نہیں ہو سکتے، وقتاً فوقتاً وہ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ وہ جماعت کے تغیر پذیر

حالات کے مطابق ہوتے ہیں - چنانچہ عربوں کے قوانین کا اطلاق اسکیمو (شمالی امریکہ کے قدیم نسل کے افراد) پر نہیں کیا جا سکتا ، اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے قوانین اترپردیش جیسی شاداب وادی کے رہنے والوں پر عائد نہیں کئے جاسکتے - قوانین زمان و مکان کی کٹھالی میں دھاتوں کے مانند ہیں ، وہ ان ہی دھاتوں کی طرح پگھل جاتے ہیں ، مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں ، پھر پگھلتے ہیں اور پھر نئی شکلوں میں نمایاں ہوتے ہیں - ارتقاء کا یہ عمل انسانی جمعیتوں کے ساتھ چلتا ہے - مردہ اور بے جان شیء کے سوا کوئی چیز جامد اور ساکن نہیں - قوانین بھی کبھی جامد و ساکن نہیں ہوسکتے - ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان باقی دنیا کی طرح بدل رہا ہے - فطرت پر ہمیں جو اقتدار حاصل ہے وہ ان تغیرات سے متأثر ہوتا ہے ، زندگی کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر اور انسان کے معاشری حالات کو بہتر بنانے کی خواہش ، ان سب پر ان تغیرات کا اثر ضرور ہوتا ہے ہماری مجلس مقننہ سے قوانین کی نہریں نکلتی ہیں اور معاشرہ میں ہمارے اعمال و افعال کو منضبط کرنے کی کوشش کرتی ہیں -

لیکن انسان کا ذہن اور اس کا ضمیر آزاد ہے - کائنات کی انتہائی چیزوں کے متعلق وہ جو بھی عقیدہ رکھنا چاہے اس کی اس کو اجازت ملنی چاہئے ، اس کے عقیدہ اور تخیل کو زنجیروں سے باندھا نہیں جاسکتا - اس طرح اسلام میں ایک تنازع نظر آتا ہے - اول تو شریعت کے قدیم تصورات میں اور جدید دیوانی قانون میں تنازع ہے مثلاً بیمہ یا ان قرضوں کو لو جو حکومت حاصل کرتی ہے - شریعت بیمہ کو اور سود کے لین دین کو ممنوع قرار دیتی ہے ، اس کے برخلاف جدید مملکتیں نہ صرف ان کی اجازت دیتی ہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں -

دوسرے یہ کہ قدیم قانون کی سختی کو دور کرنے کے لئے ایک

نئے نظام کے اصول کو اسلام کے قدیم قانون میں ضم کردیا جاتا ھے ، یا پھر نئے قوانین شریعت کی جگہ لے لیتے ھیں ۔ پہلی صورت کی مثال ہندوستان میں مسلمانوں کا قانون عطیات ھے ، یہاں انگریزی نصفت کے اصول فقہ میں ضم کردئیے گئے ھیں ۔ دوسری صورت کی مثال ھندوستان میں شہادت کا قانون ھے جو اسلامی قانون شہادت کی جگہ پوری طرح لے چکا ھے ۔ مسلم ممالک میں ھر جگہ یہ عمل جاری ھے ۔۔ یعنی قانون (دنیوی قانون) شریعت کے قوانین کو ھضم کررھا ھے اور ان کی جگہ لے رھا ھے ۔ شمالی آفریقہ میں فرانسیسی اصول قانون ، وسطی ایشیا میں سوویٹ قوانین ، ھندوستان میں رواجی قانون (کامن لا) ، انڈونیشیا میں ولندیزی قانون نہ صرف شریعت کے قوانین بلکہ خود انصاف کے معنی کو کافی متأثر کررھے ھیں ۔

ھم نے دیکھا کہ شریعت قانون بھی ھے اور دین بھی ۔ قانون اپنی ماھیت کے لحاظ سے ایک تغیر پذیر شیء ھے ۔ اس کے برخلاف اصل دین عدیم التغیر ھے یا کم ازکم خدا پر ایمان تو ایک عدیم التغیر تصور ھے ، ایک دائمی مقصود ھے ۔ اب اگر ایک ایسی دو مختلف قوتوں کو یکجا جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو تنازع یا کش مکش کا پیدا ھونا ضروری ھے ۔ اسی تنازع پر اس مقالہ میں خاص طور پر غور کیاجا رھا ھے ۔ میں نے جو حل پیش کیا ھے وہ یہ ھے (۱) دین اور قانون کی بیسویں صدی کے فلسفہ کے حدود میں تعریف کی جائے (۲) اسلام میں دین اور قانون میں فرق و امتیاز قائم کیا جائے اور (۳) اس اساس پر اسلام کی تعبیر و توجیہ کی جائے اور دین اسلام کے ایک نئے معنی پیدا کئے جائیں ! اگر اس تحلیل و تجزیہ سے دین اسلام کا کوئی ایسا عنصر جو بعض کے نزدیک اصل دین ھے فنا ھوجائے تو ھمیں صبر کرنا پڑے گا ۔ اور اگر اس سے ایمان و عقیدہ کا بطن البطون باقی رہ جائے اور اس میں قوت و توانائی پیدا ھو تو پھر ھمارا یہ عمل جراحی گو تکلیف دہ ضرور ھے تاھم یہ ایک مفلوج جسم میں ،

جو ایک حیات بخش تصور کے فقدان کی وجہ سے خشک ہوا جارہا ہے، تازہ قوت و صحت پیدا کر دے گا!

تعبیر جدید کی ضرورت: جب ہم مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ پر غور کرتے ہیں تو عام طور پر ہمیں راسخ الاعتقاد اور غیر راسخ الاعتقاد یا آزاد خیال افراد میں فرق و تمیز کرنی پڑتی ہے - یہ کوئی اصولی اصطفاف تو نہیں، اور ہمیں یہ سمجھنا بھی نہیں چاہئے کہ ضمیر کے معاملات میں کوئی منطقی اصطفاف کیا بھی جاسکتا ہے - یقین، لا ادریت اور کفر کے متعدد درجے ہوتے ہیں - ایمان و یقین کی ماہیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اصطفاف کا ریاضیاتی یا محض صوری طریقہ ہمیں یہاں خطا میں مبتلا کرسکتا ہے - لہذا یہ ایک عام اصطفاف ہے: (۱) راسخ الاعتقاد اور (۲) غیر راسخ الاعتقاد - راسخ الاعتقاد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے مقررہ ارکان پر ایمان رکھتے ہوں یا نہ ہوں، ان پر عمل کرتے ہوں یا نہ ہوں بہر حال اس بات کا تو یقین رکھتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی وہ دین جس کی تعمیر ائمہ أطہار نے کی ہے وہی دین و مذہب ہے اور ہمارے اس زمانہ میں مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور اس سے بنیادی انحراف ان کی تباہی کا باعث ہوسکتا ہے -

اس جماعت کے خیالات کی زیادہ تفصیل پیش کرنی ممکن نہیں اور شاید ٹھیک بھی نہیں - مثلا بعض تو ارکان اسلام، جیسے نماز روزہ اور حج پر خلوص دل سے یقین رکھتے ہیں اور ان پر بڑی حد تک عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں - اگر وہ بعض احکام کی پابندی نہ کرسکیں تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے لئے ان احکام کا اتباع قطعا بہتر ہو گا - بعض ایسے ہیں کہ ان احکام کی پابندی میں تو کامل ہوتے ہیں لیکن کردار کے لحاظ سے اتنے کامل نہیں - بعض کردار یا سیرت کے لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں لیکن پابندی احکام کے لحاظ سے غافل نظر آتے ہیں - بعض کا خدا پر

ایمان بڑا مضبوط ہوتا ہے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ بعض کا یہ حال ہے کہ وہ بغیر کسی مقصد کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، ضمیر کی سرزنش انہیں محسوس نہیں ہوتی، لیکن بچوں کا سا ایمان ان کا ہوتا ضرور ہے۔ یہ سب، اور دوسرے بھی جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا، لیکن جو اسلام کی مسلمہ و مروجہ شکل اور عقیدہ پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ ان کی سیرت اور عمل کچھ ہو اور خواہ وہ سارے ہی عقیدہ کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں، راسخ الاعتقاد کہلاتے ہیں۔

وہ جو غیر راسخ الاعتقاد ہیں بالکل مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کے مقررہ ارکان پر ایمان نہیں رکھتے اور دین کے اس اساس ہی کو نہیں مانتے جس کی تعیین ائمہ اطہار نے کی ہے۔ ایمان کی تعریف یوں کی گئی ہے:

(۱) اقرار باللسان (۲) تصدیق بالقلب اور (۳) عمل بالارکان۔۱

لیکن غیر راسخ الاعتقاد لوگ اقرار باللسان کے علاوہ کسی چیز کو تمام کی تمام نہیں مانتے۔ اخلاص کے ساتھ ایمان کی شہادت اسلام کا واحد معیار ہے۔ ایمان خود بعض تفصیلات کے اعتبار سے غلط ہوسکتا ہے؛ اسلام کے تمام ارکان و شعائر کو اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ نہیں مانا جاسکتا ہے۔ یہی عدم متابعت شریعت ہے۔ اگر تم عقیدۃ مان لو لیکن اس پر عمل نہ کرو تو پھر بھی تمہیں راسخ الاعتقاد ہی سمجھا جائے گا۔ لیکن خدا اور اس کے رسول پر ایمان کے علاوہ تم کسی بھی عقیدہ یا اصول کو تسلیم نہ کرو تو تم پر ''عدم متابعت'' کا الزام آئے گا۔

ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کا تعلق اس جماعت سے ہے۔ بعض تو ائمہ کے اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتے؛ بعض نماز ہی کو ضروری نہیں سمجھتے، بعض کا یہ خیال ہے کہ کام

(۱) کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ایمان کی اس طرح تعریف کی ہے۔ دیکھو قاضی نعمان کی کتاب 'دعائم الاسلام' ۱، ۳ (قاہرہ سنہ ۱۹۵۱ء)

خود نماز ہے؛ بعض گول مول الفاظ میں دین ہی کے خلاف گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اصل جانچ تو یہ ہے: کیا تم یہ مانتے ہو یا نہیں مانتے کہ اسلام جس کی تعبیر ائمۂ مقتدر نے کی ہے بنی نوع انسان کے لئے بحیثیت مجموعی مفید اور درست ہے؟

میرا جواب عجز و احترام کے ساتھ یہ ہے کہ نہیں! اور اسی لئے میں متبع شریعت نہیں ہوں۔ لیکن میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں 'غیر مؤمن' بھی نہیں۔ غیر مؤمن وہ ہے جو دین کی صحت ہی کا انکار کرتا ہے یا کم از کم اس کے کسی بنیادی عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ جو شخص تابع شریعت نہیں وہ دین کی بعض صورتوں یا عقیدوں کا انکار کرسکتا ہے یا ان پر اعتراض کرسکتا ہے لیکن در اصل وہ بھی دیندار ہوتا ہے۔ تاریخی شہادت اس امر کی گواہ ہے کہ ایسے بہت سے افراد اکثر اپنے ایمان میں پختہ ہوتے ہیں اور ان کا متبع شریعت نہ ہونا دین پر اعتقاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے! میں نہیں مانتا کہ دین کی موجودہ شکل جس بنیاد پر قائم ہے وہ آج کل کی دنیا کے لئے مفید یا درست ہے، اور میں اپنے دین کی جدید تعریف کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ کسی نئے فرقہ کی بنا ڈالنا نہیں اور نہ ہی میں معلم ہونے کا مدعی ہوں۔ لیکن مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ اسلام، جیسا کہ میں نے سمجھا ہے، اس بیسویں صدی میں روح انسانی کا بڑی حد تک تجلیہ کرسکتا ہے۔ لیکن میں کسی حال میں اسلام کی وہ تعریف قبول نہیں کرسکتا جو عام مقبولیت رکھنے والے سنی ائمہ نے کی ہے یا شیعی مذاہب میں سے کسی مذہب نے کی ہے۔ میں ان صفحات میں اسلام کی اس تعبیر جدید کے اصول کو مختصر طور پر پیش کروں گا اور میں خلوص دل سے امید کرتا ہوں کہ اسلام کے ماننے والوں میں عقلیت بتدریج ترقی کرے گی!

(۲) تعبیر جدید کے اصول

تاریخی پس منظر : اسلام کا پیغام دنیا کو چودہ صدی قبل پہنچا۔ کیا وہ تعبیر جدید کا محتاج ہے؟ کیا اس کی مخاطب ساری دنیا نہیں، بغیر زمان کی کسی قید کے؟ ان دونوں سوال کے جواب ہیں : ہاں! کسی پیغام میں اگر صداقت ہوتی ہے تو وہ ایک معنی میں سرمدی ہوتا ہے، اور اسی مقدمہ کی بنا پر جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات، ما بعد الطبعیات اور دینیات کے مطابق اس کی جدید تعبیر بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کا تعلق دنیا کی فلسفیانہ فکر سے بتلانا پڑتا ہے اور اس فکر کی شعاع مستنیر کی روشنی میں اس کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

انسان کی تاریخ میں ابھی صرف دس ہزار سال گزرے ہیں کہ وہ یہ تصور کرنے لگا ہے کہ بعض آلہہ کے ہاتھ اس کی قسمت کی باگ ہے۔ آسمان کے ستاروں میں، جنگل کے جانوروں میں، ہوا کے پرندوں میں اور حشرات الارض میں ان فوق الفطرت ہستیوں کا ظہور ہوا ہے جو نفع و ضرر کی قوت رکھتی ہیں، اور ساری دنیا مں انسان نے ان کی عبادت کی ہے، اور قربانیوں، راگوں اور بھجنوں اور مذہبی اعمال و اشغال سے اور ناچ گا کر ان کے ضرر کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقریبا پانچ ہزار سال بعد، یعنی آج سے پانچ ہزار سال قبل عراق یا اس کے قرب و جوار میں اور ہندوستان میں انسان تاریخ میں پہلی دفعہ یہ سمجھنے اور ماننے لگا کہ عبادت کے حقیقی مستحق یہ ہزاروں آلہہ نہیں بلکہ ایک فوق الکل ہستی، برھمن، مطلق، خالق، رام یا رحیم ہے، کسی نام سے تم اس کو پکارو! روح کی ایک مسلسل ابتلاء کے بعد یہ عظیم الشان یافت انسان کو نصیب ہوئی اور تاریخ انسانی میں یہ سب سے عظیم یافت ہے! یہ صفر کی دریافت سے، آگ کی دریافت سے، لوہے، یا قانون اضافیت کی دریافت سے بھی زیادہ عظیم الشان ہے۔ یہ ایک بے مثل تعقل ہے، اس میں ایک غامضانہ اور قاہرانہ قوت موجود ہے، یہ ٹوٹے ہوئے

دلوں کو حیات نو بخشتا ھے ، یہ زندگی میں معنی پیدا کرتا ھے ، یہ انسان کو وہ چیز دکھلاتا ھے جس کو وہ خود دیکھ نہیں سکتا ، یہ سائنس اور اس کے تغیر پذیر احوال سے بے نیاز ھے ، یہ ایک سرمدی تعقل ھے ، تغیر ، تیفر و نقص سے منزہ و مبرأ ۔ یہ پیغام انسان کو اکثر کسی حساس روح ھی کے توسط سے پہنچا ھے ، اور ایسے ھی برگزیدہ افراد میں سے ایک حضرت محمد مصطفی صلعم بھی ھیں ۔ قرآن مجید ان کی تلاش حق کی تاریخ کو اور ان کے قلبی کرب اور آخری کشف کو پیش کرتا ھے اور یہ کتاب مبین اس صداقت کے باطنی ادراک سے مملو ھے جو انسان کے عرفان حق کی گویا ایک تاریخ ھے !

اذا الشمس کورت ۞ جب آفتاب بے نور ھو جائے گا اور جب ستارے
و اذا النجوم انکدرت ۞ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گر پڑیں گے اور جب پہاڑ
و اذا الجبال سیرت ۞ چلائے جائیں گے ، اور جب دس مہینے کی گابھن
و اذا العشار عطلت ۞ اونٹنیاں چھٹی پھریں گی ، اور جب وحشی جانور
و اذا الوحوش حشرت ۞ سب جمع ھو جائیں گے ، اور جب دریا بھڑکائے
و اذا البحار سجرت ۞ جائیں گے اور جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے
و اذا النفوس زوجت ۞ کئے جائیں گے ، اور جب زندہ گاڑی ھوئی
و اذا الموءدة سئلت ۞ لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ میں
بأی ذنب قتلت ۞ قتل کی گئی تھی اور جب نامۂ اعمال کھول دئے
و إذا الصحف نشرت ۞ جائیں گے اور جب آسمان کھل جائے گا اور جب
و إذا السماء کشطت ۞ دوزخ دھکائی جائے گی اور جب جنت نزدیک
و إذا الجحیم سعرت ۞ کردی جائے گی ، ھر شخص ان اعمال کو جان لے گا
و اذا الجنة ازلفت ۞ جو لے کر آیا ھے ، تو میں قسم کھاتا ھوں ان ستاروں
علمت نفس ما احضرت ۞ کی جو پیچھے کو ھٹنے لگتے ھیں چلتے رھتے ھیں ،
فلا اقسم بالخنس ۞ جا چھپتے ھیں اور قسم ھے رات کی جب وہ جانے لگے

الجوار الـــکـنس ٭ اور قسم ھے صبح کی جب وہ آنے لگے کہ یہ
و الّیل اذا عسعس ٭ قرآن ھے ایك معزز فرشتہ کا لایا ھوا جو قوت
و الصبح اذا تنفس ٭ والا ھے ، مالك عرش کے نزدیك ذی رتبہ ھے ،
انہ لقول رسول کریم ٭ وھاں اس کا کہنا مانا جاتا ھے ،
ذی قوۃ عند ذی العرش امانت دار ھے . .
مکین ٭ مطاع ثم امین ٭ . . . . (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)
(سورۃ التکویر - ٨١)

وجود باری تعالی پر یقین تجربہ پر مبنی ھے ، نہ اس کو استدلال سے ثابت کیا جاسکتا ھے اور نہ اس کی تردید کی جا سکتی ھے - زمانہ نے اس کو پرکھا اور صحیح پایا - لیکن عقل یا علم یا سائنس (حکمت) کے کارناموں کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی - سائنس کے اصول موضوعہ ، مفروضات ، نظریات و واقعات ، اپنی ماھیت کے لحاظ سے تغیر پذیر ھیں ، لیکن خدا پر یقین واحد ، غیر متغیر ، بدیہی و وجدانی ھے - میں نے جیسا اوپر کہا ھے کہ اس پر یقین رکھنے والوں کے لئے یہ انسان کی واحد عظیم الشان یافت ھے - یہ ایجاد نہیں ھے !

لیکن ایسی صداقت کو ایك ناقص آلے ، یعنی زبان ھی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ھے - زبان کا تعلق انسان سے ھے ، یہ ایك متلون اور تغیر پذیر شیء ھے - کوئی زبان پانچ ھزار یا دس ھزار سال سے زیادہ پڑھی جاسکتی ھے اور نہ سمجھی جاسکتی ھے - زمین پر انسان کی بہت سی ایسی تحریرات ھیں جن کے معنی طاق نسیاں کی زینت ھیں - یہ یقین کرنا ذرا مشکل ھے کہ قرآن کی زبان سنہ . . . ، ١٠ ھجری یا سنہ . . . ، ١٠ ء میں پڑھی یا سمجھی جائے گی - اور فلسفیانہ تحقیق سے یہ بات صاف واضح ھوچکی ھے کہ الفاظ کے معنی میں ، ان کے باریك فروق میں ارتقائی تغیر ضرور ھوتا ھے - کوئی زبان ساکن و جامد نہیں ھوتی - الفاظ اور جملوں کی قوت تأثیر میں کمی اور

زیادتی ہوتی رہتی ہے - یہ کوئی مستقل و غیر متغیر چیز نہیں - یہیں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کے لفظوں، جملوں، محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کے معنی بدل گئے ہیں، بدل رہے ہیں اور بدلتے جائیں گے اور ممکن ہے کہ امتداد زمانہ سے یہ پوری طرح قابل فہم بھی نہ رہیں! لیکن ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کا مرکزی پیغام اس کی زبان سے زیادہ پائدار ہے اور وہ خدا پر یقین ہے - ''زمین و آسمان فنا ہوجائیں گے لیکن میرے کلمات فنا کے قانون سے ماوراء ہیں'' (میاتھیو، ۲۴، ۳۵) اس لئے میرے نزدیک یہ بات صاف ہے کہ ہم قرآن کو لے کر ''پیچھے'' کی طرف نہیں لوٹ سکتے بلکہ ہمیں قرآن کو لے کر ''آگے'' کی طرف بڑھنا چاہئے - میں قرآن کو اسی طرح سمجھنا چاہتا ہوں جیسا کہ عربوں نے اس کو رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں سمجھا تھا تاکہ میں اس کی اس طرح توجیہ یا تعبیر کروں کہ اس کا اطلاق میری زندگی کے حالات پر ہوسکے، اور اس پر اسی حد تک یقین رکھوں جس حد تک کہ وہ مجھ بیسویں صدی کے انسان کو متأثر کرتا ہے - مجھ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ میں صحرا میں اپنی زندگی بسر کروں، اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو عبور کروں، ملخ خور بن جاؤں، انتقام قتل کی ان لڑائیوں میں منہمک ہوجاؤں جو قبائل میں مسلسل ہوا کرتی ہیں، ڈاڑھی رکھوں، جبہ پہنوں، اور نقلی عرب ذہنیت پیدا کرلوں، اسی طرح مجھ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ میں قرآن کی تفصیلی ہدایتوں پر ایمان لے آؤں! مجھے اس کے حقیقی پیغام اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں میں تمیز کرنا ہوگا - مجھے شاعرانہ صداقت اور واقعی صداقت میں امتیاز کرنا چاہئے - مجھے دین کے لب و قشر میں تمیز کرنا چاہئے - میں مجبور ہوں کہ زمانۂ جدید کے ایک انسان کی طرح اس کو سمجھوں اور قبول کروں نہ اس انسان کی طرح جو صدیوں پہلے گزرا ہے - میں استناد و اقتدار کا احترام کرتا ہوں لیکن ضمیر کے معاملہ میں اس کو قبول نہیں کرسکتا -

(۴۸)

اسلام کی بناء قرآن پر قائم ہے اور قرآن کی توجیہ و تعبیر اس کے تاریخی گرد و پیش اور تاریخی واقعہ نگاری کے اصول کے مطابق کی جانی چاہئے ۔ اسلام کو سمجھنے سے پہلے ہمیں یہودیت و عیسائیت کے اصول کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ جب یہ دو مؤخر الذکر مذاہب اپنے تاریخی ماحول کے لحاظ سے اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے تو اسی وقت پیغمبر اسلام کا پیام اور اس کے معنی بھی واضح ہو جائیں گے ۔

اساسی اصول = اسلام کی جدید تعبیر کے لئے جن چھ اصول کا سمجھنا ضروری ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔ ۱

(۱) تاریخ مذاہب کا مطالعہ
(۲) سامی نسلوں کے مذاہب کا تقابل
(۳) سامی السنہ و لسانیات کا مطالعہ
(٤) قانون اور مذہب میں تفریق
(٥) شریعت اور کلام کی نظر ثانی
(٦) کونیات اور سائنسی واقعات کی تعبیر جدید

(۱) تاریخ مذاہب :

تاریخ مذاہب کو اب بہت ساری جامعات میں کافی اہمیت دی جارہی ہے ۔ پروفیسر جوزف ، ایم ، کٹا گوا نے اپنے تازہ مقالہ میں ”تاریخ مذاہب کے دائرہ کی نوعیت اور اس کے لائحہ عمل“

---

(۱) دیکھو میرے دو مقالے : Law & Religion in Islam (اسلام میں دین و شرع) رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ، شاخ بمبئی سنہ ۱۹۵۳ ء ، ص۲۹ تا ٤۸ اور Islamic Law & Theology in India (ہندوستان میں اسلامی قانون اور دینیات) مڈل ایسٹ جرنل سنہ ۱۹۵٤ء ص ۱٦۳ تا ۱۸۳ ۔

کو پیش کیا ہے۔۱ پروفیسر موصوف نے اس مقالہ میں بتلایا ہے کہ "تاریخ مذاہب" کو پہلے "تقابلی مذہب" کہا جاتا تھا۔ جامعہ شکاگو میں تقابلی مذہب کا شعبہ دینیات کے شعبہ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ ہیاسکل لکچررشپ کے قیام کے بعد اس شعبہ کو کافی تقویت حاصل ہوئی ہے، اور مندرجہ ذیل ممتاز علماء نے یہاں ایک مفید روایت کے استقرار میں بڑی مدد دی ہے: ڈی، بی میکڈونالڈ (ہارٹفورد) اے، وی ولیمس جیاکسن (کولمبیا) مارس بلوم فیلڈ (جانس ہاپکنس) کارل بیزولڈ (ھائڈل برگ) سروا پلی رادھاکشن (کلکتہ) ایچ' اے' آرگب (اکسفورڈ) لوی ماسینو (پیارس)۔

کٹا گاوا اس علم کی ماہیت کو اس طرح سمجھاتا ہے:

"ظاہر ہے کہ تاریخ مذاہب صرف مذاہب ہی کے مطالعہ کا دعوی نہیں کرتی۔ معیاری علوم، جیسے دینیات اور فلسفہ اور توصیفی علوم' جیسے سماجیات اور انسانیات وغیرہ مذہب کے مختلف پہلوؤں اور مذہبی مظاہر سے بحث کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ تاریخ مذاہب بہت سارے متعلقہ علوم کے لئے اسم جمع کے طور پر ہی نہیں استعمال ہوتا، جیسے اسلام، عیسائیت، بدھ مت، ہندو مت، یا قدیم مذاہب کی تاریخ یا مختلف ادیان کے عقائد، اعمال، یا روحانی اداروں کا تقابلی مطالعہ۔ مختصر یہ کہ تاریخ مذاہب نہ محض ایک معیاری علم ہے اور نہ صرف توصیفی علم گو اس کا تعلق دونوں سے ہے۔۲"

ایک اور ضروری چیز بعد میں بیان کی گئی ہے:

"تقابلی مذہب کے شعبہ کا کام یہ ہے کہ وہ مذہب کی بدایت

(۱) The Nature & Programme of the History of Religious Field جو Divinity School News (شکاگو یونیورسٹی) سے دوبارہ شائع ہوا ہے نومبر سنہ ۱۹۵۷ء (۲) ایضا ص ۷.

قوم کی زندگی کے ارتقا میں مذہب کے عمل ، فردا فردا ہر مذہب کے ارتقا ، عظیم تر مذاہب کے اصول کے تقابل اور مذہب کی صحت اور اس کی قدر و قیمت سے بحث کرے ۔ یہاں خود مذہب کے علم (سائنس) کے مختلف پہلوؤں کے تعلق سے فکر کی تاریخ پر وقت صرف کیا جاتا ہے ۔ ۱ ،،

کچھ اس قسم کی تربیت و تعلیم اسلام کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے ۔ ہماری دینیات کے طلباء اپنے کام کا اس طرح آغاز کریں تو اچھا ہوگا ۔

(۲) سامی مذاہب :

ان بنیادی علوم سے شروع کر کے ہمیں حضرت موسی کی بعثت سے پہلے سامی مذاہب کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہئے ۔ اور اس کے لئے رابرٹسن اسمتھ کی کتاب "Religion of the Semites" (سامیوں کے مذہب) کو نقطۂ آغاز قرار دیا جانا چاہئے ۔ اس کے بعد یہودیت ، عیسائیت ، اور اسلام کا تاریخی مطالعہ کرنا ضروری ہوگا ۔ یہود و نصاری کے دین میں اور اسلام میں اس قدر باہمی مشابہت پائی جاتی ہے کہ آسانی سے ایک علحدہ علم ایجاد ہوسکتا ہے ۔ اس کو " سامی مذاہب کا تقابلی علم" کہا جاسکتا ہے ۔ اس زمانہ میں اس قسم کے مکمل تقابلی علم کی بڑی ضرورت ہے ۔ ہم میں عیسائیت کے ایسے عالم ملتے ہیں جنہیں اسلام کے متعلق اچھا علم حاصل ہے ، اسی طرح اسلام کے ایسے عالم بھی ہیں جنہیں یہود و نصاری کے مذہبوں سے واقفیت حاصل ہے ۔ اور مذہب یہود کے بھی ایسے عالم ہیں جنہوں نے عیسائیت یا اسلام پر کافی عبور حاصل کیا ہے اور بعض زبانوں پر بھی ۔ لیکن ہم میں بہت کم ایسے عالم ہیں جو اسلام ، عیسائیت اور یہودیت کے اصول ، تاریخ اور ان کے ارتقا پر یکساں دسترس رکھتے ہوں ۔ مذہبی اصول کے خلط ملط کا بھی

---

(۱) ایضا ص ۲۱ ۔

خاص طور پر مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسماعیلی خوجے اسلام اور ھندو مت کی خلط ملط کا نتیجہ ھیں؛ نصیریوں نے عیسائیت کا عقیدۂ تثلیث قبول کرلیا اور اسلام سے اس کا پیوند لگایا۔ اور بعض اسلامی یا یہودی فرقے ایسے بھی ھوسکتے ھیں جن پر ایک دوسرے کا کافی اثر ھوا ھو۔ قرآن اور خود پیغمبر اسلام کی زندگی پر کافی روشنی پڑسکتی ھے۔ اگر ان چیزوں کا مطالعہ علمی اور معروضی انداز میں کیا جائے۔

(۳) سامی زبانوں کی تقابلی لسانیات:

اب ھمیں زبان اور اس کے صحیح فہم کا ذکر کرنا ھے۔ عربی زبان کا مطالعہ اس کی لسانیاتی اضافات و مناسبات کو پیش نظر رکھ کر کیا جانا چاھئے۔ یہ صاف طور پر جان لینا چاھئے کہ عربی، عبرانی، آرامی، سریانی، حبشی وغیرہ کا تعلق اسی لسانی گروہ سے ھے جس کو سامی زبانیں کہا جاتا ھے۔ عربی زبان کی خصوصی مہارت اسی وقت حاصل ھوسکتی ھے جب اس گروہ کی دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ھو اور سامی زبانوں کی صرف و نحو پر عبور حاصل ھوجائے۔ اس سلسلہ میں جرمن مستشرقین، مثلاً نولڈیک براکلمن وغیرھم کی تصانیف کا توجہ کے ساتھ مطالعہ ضروری ھے تاکہ ھم قرون وسطی کے عرب فرھنگ نویسوں کے قیاسوں اور خطاؤں سے محفوظ رہ سکیں۔ اے جفری کی مستند کتاب Foreign Vocabulary of the Quran (قرآن کے لغات دخیلہ) یا ایس فرینکل کی Die Aramaischen Fremdworter in Arabischen (عربی میں آرامی لغات دخیلہ) پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ھوسکتا ھے کہ یورپ کے ماھرین لسانیات نے گزشتہ دو صدیوں میں کتنی ترقی کی ھے۔ (۱) مثلاً لفظ فاروق کو فرق سے مشتق نہیں تصور کرنا چاھئے بلکہ

(۱) Islamic law & Theology in India (ھندوستان میں اسلامی قانون اور دینیات) ص ۱۸۱ - ۱۸۲۔

یہ ایک سریانی لفظ پاروقا سے نکلا ہے جس کے معنی 'نجات دھندہ' کے ہیں کیوں کہ حضرت عمر کو فاروق یعنی نجات دھندہ اس لئے کہتے تھے کہ انہوں نے نصاری کو مسلمانوں کے ظلم سے نجات دی تھی ۔ یہ خطاب سیدنا عمر کو نصاری نے دیا تھا جنہوں نے کسی روزنامچہ میں سریانی زبان استعمال کی تھی ۔

(٤) قانون کی مذہب سے تفریق :

اسلام میں اب قانون دیوانی اور اخلاقی یا مذہبی قانون میں تفریق مزید تاخیر کی متحمل نہیں ۔ ہمیں اولا کلی اخلاقی قوانین مثلا صداقت ، عفت ، تدین وغیرہ میں اور جزئی اخلاقی احکام جیسے لحم خنزیر و شرب خمر کی ممانعت میں فرق کرنا چاہئے ۔ اول الذکر کا حکم تمام مذاہب نے دیا ہے ، ثانی الذکر کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی ۔ یہاں تاکید کا فرق صاف ظاہر ہے ۔

پھر ہمیں قانون پر نظر ڈالنی چاہئے ۔ پہلا کام یہ ہوگا کہ مذہب کے عقائد اور اصول کو منطقی طور پر قانون کے اصول و قواعد سے علحدہ کیا جائے ۔ میرے لئے تو یہ ایک اصول موضوعہ ہے کہ انسان کا حقیقی ایمان قواعد کی خارجی پابندی سے بالکل جدا چیز ہے ، اخلاق احکام کا اطلاق ضمیر پر ہوتا ہے ، اور قانون کے اصول حکومت نافذ کرتی ہے ۔ اخلاقی معیار باطنی چیز ہے اور قانون کے اصول خارجی ہوتے ہیں ۔ روح کی حیات باطنی کو ایک حد تک کردار معاشری کی خارجی صورتوں سے جدا کیا جانا چاہئے ۔ یہ تفریق کوئی سادہ و سہل چیز نہیں ، اس کو غیر اسلامی قرار دیا جاسکتا ہے ۔ لیکن شریعت پر مکرر غور کرنے کی کوشش کا آغاز ہی اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ اصول مان لیا جائے ۔

اس لئے جواز فعل کے لئے جدید احکام کو وضع کرنا ہوگا ۔ شریعت کے احکام ، جنہیں احکام خمسہ کہا جاتا ہے یہ ہیں : فرض ، مندوب ،

مباح، مکروہ، حرام - ان پر ان افعال کا اضافہ ضروری ہوگا جو شریعت کے دائرہ سے تو باہر ہیں لیکن جو خاص خاص حالات میں دیوانی عدالت کے قانون کے مطابق بالکل جائز قرار دئے جاسکتے ہیں، مثلاً ترکی میں قانون دیوانی کا اطلاق، قانون شادی اور طلاق، کمپنی کا قانون، بیمہ کا قانون، قضا کا قانون، کرایہ پر دینے کا وہ طریقہ جس میں ایک مدت معینہ تک اقساط ادا کرنے کے بعد چیز کرایہ دار کی ملک ہوجاتی ہے، بین مملکتی مالیاتی معاملات جن میں ادائی، سود کا حصول، حکومتی قرضے وغیرہ شامل ہیں - ملک کی عدالتوں میں جو قانون نافذ ہے یا خاص عدالتوں کے قوانین مثلاً محصول آمدنی یا صنعتی مناقشوں کے تصفیہ کے قوانین کا احترام ایک مسلمان کی نگاہ میں کسی قدر مختلف نوعیت کا ہوگا، تاہم اصولاً دنیوی یا غیر مذہبی قانون کو تسلیم کیا جانا چاہئے اور یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے - ۱ یہودی اس کو تسلیم کرتے ہیں - ربی اگنازئے باوم کہتا ہے "ہم نے توریت کو ترک نہیں کیا لیکن ہماری زندگی میں توریت (جہاں تک اس کے دیوانی و فوجداری قانون کا تعلق ہے) کا اثر اسی لمحہ ختم ہوگیا جب ہم مغربی تہذیب کے ممالک کے شہری بن گئے - ۲"

اس تحلیل کا اثر ملک کے دستور پر بھی پڑے گا - اسلام کی تعلیم کی رو سے ہر شیٔ کا مالک اللہ ہے؛ ہر مملکت کا وہی در حقیقت حاکم ہے - دنیائے جدید میں یہ نظریہ ایک ناممکن سی چیز ہے، اور قابل عمل اصول وہی ہے جس کو متعدد جدید جمہوری دستور نافذ کرچکے ہیں کہ کسی ملک کے لوگ ہی اپنے قلمرو کے حاکم ہیں - اگر مذہب کو قانون دیوانی کی زنجیروں سے بتدریج رہائی حاصل ہوجائے اور قانون کو آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کی اجازت مل جائے تو مسلم معاشرہ اسی سرعت کے

---

(۱) ایضاً ص ۱۸۰ و ۱۸۱ (۲) The Jewish Mission (یہودی مشن) جیمس کلارک، تاریخ طبع ندارد، دیباچہ کی تاریخ سنہ ۱۹۴۹ء، ص ۹۴ ۔

ساتھ ترقی کرسکتا ہے جس طرح ترکی نے ترقی کے منازل طے کئے۔

مذہب کا اصرار خدا کی عبادت، طہارت نفس اور حسن سیرت پر ہونا چاہئے، اس کو جزئی اوامر و نواہی کی تفصیلات میں الجھنا نہ چاہئے۔ سب سے زیادہ اسلامی فضائل مثلاً فیاضی، تواضع، اخوت، شجاعت، مروت کی تعلیم دی جانی چاہئے اور ان کی کامل مثالیں تاریخ اسلام سے لے کر پیش کی جانی چاہئیں۔ نیز اسلام کی اخلاقی تعلیم کی تائید عالم جدید کے معلمان اخلاق و فلسفہ کی تعلیمات سے کی جانی چاہئے۔ ہم قرآن کو ایسی کتاب تو نہیں بنا سکتے "جو خدا کے زندہ کلمات کو ایک دفتر میں مقید کردے اور روایت کو ایک ناقابل خطا ماخذ قرار دے لے۔۱" خواخیم (یہودیوں کے فقیہ یا عالم) "اپنی ضمیر کی آواز پر کان نہیں دھرتے بلکہ قانون کی کتابوں کے طرف رجوع کرتے ہیں۔۲" یہی حال اسلام کے مذہبی ناصحوں کا ہوگیا ہے!

(۵) شریعت اور کلام پر نظر ثانی:

اسلامی دینیات کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جانا چاہئے اور اس کے بنیادی عقائد کی تشکیل جدید فلسفے، ما بعد الطبیعات، اخلاقیات، نفسیات اور منطق کی روشنی میں کی جانی چاہئے۔ غزالی کے بعد علم الکلام کے مختلف پہلوؤں کا کوئی حقیقی جائزہ نہیں لیا گیا۔ علم کلام کے اصول کے استحکام اور تقویت کے لئے یورپ کے فلسفۂ حاضرہ، پروتستانی مفکرین نے لودھر کے زمانہ سے لے کر اب تک جو اقدام کیا ہے اور مدرسیہ نے سینٹ ٹامس اکویناس اور سواریز کے زمانہ سے لے کر ماری ٹین اور برڈائیو تک جو ترقی کی ہے، اور یہودیوں اور زمانۂ جدید کے فلاسفہ کے افکار و خیالات — ان سب کا عقل و فراست کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہئے!۔۳

(۱) ایضا ص ۹۷ (۲) ایضا (۳) "ہندوستان میں اسلامی قانون اور دینیات" کا ذکر ناہ.

(٦) کونیات اور سائنسی واقعات کی تعبیر جدید :

جہاں کہیں کتب مقدسہ یا روایات میں مظاہر فطرت یا سائنسی واقعات کا ذکر آیا ہے اور اس سلسلہ میں جو دعوی کئے گئے ہیں انہیں جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہئے ان عبارتوں کی توجیہ ، ترمیم اور رد و قبول حکمت جدیدہ کے حدود میں کیا جانا چاہئے ، اس میں انسانیات ، حیاتیات ، طبیعیات ، ریاضیات ، کیمیا اور طب سب شامل ہیں۔کوپرنیکس کے زمانہ کے بعد سے عالم ، زمان اور کائنات کے تعقلات میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا ہے ۔ اسلام کو ان تغیرات پر توجہ کرنی چاہئے اور مذہب سے ترھات کا حذف کیا جانا ضروری ہے !

مثال کے طور پر حضرۃ مریم کے بتول ہونے پر یا قرآن میں جنت و جہنم کا جو بیان آیا ہے اس پر زیادہ زور نہیں دیا جانا چاہئے ۔ ۱ ان کی حقیقی صداقت کا قبول کیا جانا ضروری نہیں ، ان کی شعری صداقت ہی اصل ہے اور یہ کافی ہے ۔ روزے کے روحانی حسن اور قوت پر زور دیا جاسکتا ہے ، دوسری جزوی ہدایتوں سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ عرب میں سمجھا جاتا ہے کہ رمضان کی راتیں جشن منانے ، دوستوں سے ملنے ، محفل رقص و سرود میں حصہ لینے ، شہوت انگیز رقص کے دیکھنے اور وقت اور مال کو ضائع کرنے کے لئے ہیں ۔ شاید یہاں زھد و تقوی کی تاکید اور مذہبی رسوم میں کسی قدر لچك ایمان کی روح کے زیادہ موافق ثابت ہوگی ۔

ثانوی اصول : جب قرآن میں یا شریعت میں کوئی حکم دیا جاتا ہے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ کوئی قانونی اصول ہے یا اخلاق اصول ۔ اگر یہ قانونی اصول ہے تو اس کا نفاذ حکومت کے ذمہ ہے اور اگر یہ اخلاق اصول ہے تو حکومت اس کو نافذ نہیں کرسکتی ۔ جب مذکورۂ بالا اصول کے مطابق اس امر کا واضح طور پر تعین ہوگیا کہ قرآن نے

(۱) دیکھو قرآن سورۂ ٥٥ ، الرحمن ۔

ایک قانونی اصول بیان کیا ہے تو پھر معاملہ کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔

ادبا گزارش ہے کہ اس بیان کو اب قبول نہیں کیا جاسکتا۔ قانون بدل سکتا ہے لیکن مذہب زیادہ دیرپا اور مستقل ہوتا ہے۔

قرآن کی کسی واضح ہدایت کو جانچنے کے لئے جیسی خمر یا لحم خنزیر کی ممانعت ہے، ہمیں ایک خاص طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ وہ طریقہ یہ ہوسکتا ہے: دیکھا جائے کہ

(۱) اسلام سے پہلے کیا قاعدہ تھا یا کیا رواج تھا؟

پیمبرانہ اصلاح کی تعیین سے پہلے تمام موجودہ شہادتوں کو اچھی طرح جانچنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان مصنفین پر اعتماد کرلینا کافی نہیں؛ اسلام سے قبل کی تصانیف، کتبے، دستاویز (ان میں مخطوطات، پیپرس بھی شامل ہیں) سامی، عبرانی، سریانی، حبشی، یونانی اور لاطینی زبانوں یا اور ماخذ سے جو بھی شہادتیں مل سکتی ہیں ان سب پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس تحقیق کی تحدید بیسویں صدی کے علمی تبحر ہی سے ہوسکتی ہے۔

(۲) پیغمبر نے اصلاح کی کس طرح کوشش کی؟

یہ جاننا کہ وقف، اکل و شرب، وضو و غسل، صوم و صدقہ جیسے مسائل کی تعلیم کن خاص حالات میں دی گئی کافی معلومات کے انکشاف کا باعث ہوسکتا ہے۔ آیات قرآنیہ کی صحیح ترجیہ و تفسیر، ان کی تاریخی ترتیب کا مطالعہ اور سامی لسانیات کے تنقیدی مواد کا استعمال کیا جانا ضروری ہوگا۔ حدیث کی ثقاہت و قدامت کی پھر سے تحقیق ضروری ہے۔ قدیم علماء و ائمہ کی سند کو لفظ آخر کے طور پر نہیں مانا جاسکتا۔

(۳) اس اصلاح کے کیا نتائج ہیں؟

مثال کے طور پر عورت کے معاملہ پر غور کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں ازدواج کا قانون، بعض قیود و شروط کے ساتھ، عورت کے لئے مفید ہے، اور یہی حال قانون وراثت کا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں رواج نے غیر منقولہ جائیداد پر عورتوں کے حق کو تسلیم نہیں کیا؟ ہندوستان، انڈونیشیا، مصر، ایران اور شمالی آفریقہ میں صورت حال ایسی ہی ہے۔ اس سے زیادہ پریشان کن یہ بات ہے کہ نہ صرف عورت اپنے قرآنی حقوق سے محروم کردی گئی ہے بلکہ وہ مرد سے ادنی سمجھی جاتی ہے اور بعض سیاسی حقوق کی اہل نہیں قرار دی جاتی۔ مسلم ممالک میں سفر کرنے سے اس تکلیف دہ واقعہ کا علم ہوتا ہے کہ وہاں عورت کو مرد کا کھلونا تصور کیا جاتا ہے اور شاذ و نادر ہی اس کو شریک زندگی، رفیق کار یا مونس و ہمدم خیال کیا جاتا ہے۔ محض یہ کہہ کر اس صورت حال کو دفع نہیں کردیا جاسکتا کہ یہ عمل غیر اسلامی ہے یا روح اسلام کے مغائر ہے۔ ضروری ہے کہ واقعات کا مقابلہ کیا جائے، معاملہ کی تہہ تک پہنچا جائے، غلط اصول و توجیہات کو مسترد کردیا جائے اور قوم کی پھر سے تربیت کی جائے۔ قرآن کی یہ آیت

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض (سورۃ النساء آیت ۳٤)	مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی ہے اللہ نے ایک کو ایک پر۔

کی جدید تعبیر اس طرح کی جانی چاہئے کہ اس کا تعلق ایک خاص مکان و زماں سے ہے۔ اس کے وسیع اطلاق پر پھر سے غور و فکر کی جانی چاہئے اور اگر اس سے کام نہ چلے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معاشری عمل کا ایک ضابطہ ہے جس کا اطلاق دور حاضر پر نہیں ہوسکتا۔

(٤) بعد میں آنے والی صدیوں میں مختلف فقہی مذاہب نے ان اصول کی کس طرح توجیہ کی اور ان کو کس طرح استعمال کیا؟

مذکورہ بالا دو اصول ایک دوسرے سے قریبی ربط رکھتے ہیں۔

عصر حاضر کے ماخذ ، خصوصا آزادانہ اور تنقیدی توجیہات کو بھی جانچنا ہوگا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ان کے فوری نتائج کیا تھے اور ان اصول کے تاریخی ارتقا کی بھی تحقیق کرنی ہوگی ۔ کیا بعد میں آنے والی صدیوں میں ان احکام کی لفظا لفظا تعمیل کی گئی یا محض اس کی حقیقت کو پیش نظر رکھا گیا ؟ کیا انہیں غلط طور پر تو نہیں سمجھ لیا گیا یا ان کے معنی میں تغیر و تحریف تو نہیں کی گئی ؟ کیا انہیں سیاسی یا شخصی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا ؟ اس قسم کے بعض سوالات ضرور پیدا ہوتے ھیں ۔

(۵) قانون کا موجودہ موقف کیا ھے ؟ جدید فقہی فکر نے جو بلند ترین معیار قائم کئے ھیں ان سے یہ کس حد تک فروتر ھے ؟ ان اصول کی کس طرح ترمیم ، تنسیخ یا تائید کی جاسکتی ھے تاکہ یہ معاشری عدل کے جدید تعقلات کے مطابق ثابت ھوں اور ان سے امت مسلمہ کی معاشری فلاح حاصل ھوسکے ؟ وہ امت مسلمہ جو عام معاشرہ کا محض ایک جزء ھے ۔

ان سوالات کا قانون سے خاص تعلق ھے ؛ اسی عمل کا دینی اور اخلاقی اصول پر بھی اطلاق ھوسکتا ھے ۔ اگر اس تنقیدی طریقہ سے دین کی ساری عمارت پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ھے کہ مسلم و مستقل مذھب کے علاوہ اسلام کی ایک احتجاج کنندہ نئی شکل کا بتدریج ظہور ھوگا جو بیسویں صدی کی زندگی کے حالات کے مطابق ھوگی اور ماضی کے فرسودہ اجزاء کو ترک کردے گی ۔ اس کو کیا نام دیا جائے اس کی زیادہ فکر نہ کرنی چاھئے ، لیکن اگر کوئی نام ضروری ھی تصور کیا جاتا ھے تو پھر اس کو " آزاد خیال " یا " غیر متشدد " اسلام کہا جاسکتا ھے ۔

۳ ۔ نتائج

عصر حاضر نے انسان کو جو سب سے بڑا تحفہ عطا کیا ھے

وہ آزادی ہے ،ــ فکر و نظر کی آزادی ، قول کی آزادی ،عمل کی آزادی ۔ اس آزادی کی تحدید قانون سے ہوتی ہے ۔ قانون کہتا ہے کہ ہر انسان کی آزادی دوسرے انسان کی آزادی سے محدود ہے ۔ اسی لئے تم دوسرے انسان کے خلاف بدگوئی نہیں کرسکتے کہ یہ ازالۂ حیثیت عرفی ہوگا۔ اور تم مملکت کے خلاف بدگوئی سے کام نہیں لے سکتے کہ یہ بغاوت ہوگی ۔ تنقید ، ازالۂ حیثیت عرفی اور بغاوت سے جدا چیز ہے ۔ مناسب تنقید ، اور بے بنیاد الزامات ، جو ازالۂ حیثیت عرفی اور بغاوت کی صورت اختیار کرلیں ، صحت و قطعیت کے ساتھ ممیز کئے جاچکے ہیں ۔ اس کا خیال رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ عہد حاضر نے آزادئ فکر و قول و عمل پر کافی زور دیا ہے ۔

اور جہاں تک مذہبی عقائد کا تعلق ہے اسلام کا کیا رویہ ہے ؟ وہ توجیہ و تعبیر کے دروازے کو بند کردیتا ہے ۔ ١ وہ ماہرین قانون کو چند جماعتوں میں تقسیم کردیتا ہے اور ان سے فکر و نظر کی آزادی کو مسلوب کرلیتا ہے ۔ حال میں ہندوستان کے بعض مصنفین نے ، جن میں اقبال اور عبدالرحیم شامل ہیں ، اس عقیدے کے خلاف احتجاج کیا ، لیکن کسی میں ہمت نہیں کہ علماء کے غضب کا مقابلہ کرسکے ۔ دو سال گزرے کہ پاکستان میں کچھ فسادات ہوئے اور تحقیقات کا حکم دیا گیا ۔

---

(١) اس مضمون کے متعلق ایک معیاری اور مسلمہ عقائد کے لحاظ سے کامل بحث ہمیں محمد رشید رضا کی کتاب « الوحی المحمدی » میں ملتی ہے ، دیکھو اس کا پانچواں ایڈیشن مطبوعہ مصر سنہ ١٣٧٥ھ م سنہ ١٩٥٥ء زیادہ ترقی یافتہ نقطہ نظر جو میری رائے سے قریبی مماثلت رکھتا ہے حسن احمد الخطیب کی کتاب ”فقه الاسلام“ میں ملے گا جو مصر میں چھپی ہے (سید علی حافظ) سنہ ١٣٧١ھ م سنہ ١٩٥٢ء ، خاص طور پر صفحات ٣٤٣ سے آخر تک دیکھے جائیں ۔

پاکستان کے میر مجلس نے بہت سارے علماء سے اسلام اور اس کے اهم عقائد و اصول کے متعلق سوالات کئے ؛ ان کا بیان ھے کہ بعض علماء نے دوسرے علماء کو کافر قرار دیا۔۱ ھمارے دین میں فکر کا تحجر اس نوبت پر پہنچ گیا ھے ! راسخ الاعتقاد طبقہ نے اسلام کی جو تعبیر کی ھے اس میں وہ لچك باقی نہیں رھی کہ وہ عہد حاضر کی فکر و زندگی سے تطابق پیدا کرسکے ۔ ھمایون کبیر نے ایك تازہ مقالہ میں لکھا ھے کہ "عصر جدید کی پریشان کن پیچیدگی ایك ایسے ایمان و عقیدہ کی طالب ھے جو اپنی ماھیت کے لحاظ سے عقلی اور مفہوم کے لحاظ سے کلی ھو۔ جو لوگ إله واحد کے قائل ھیں ان کے لئے ذات باری ایك کلی مفہوم رکھتی ھے اور ان کا قبلۂ توجہ یہی ذات ھے ۔ جو لوگ اس معنی میں مؤمن نہیں وہ اسی مفہوم کو "شرافت آدم" کے تصور میں پاتے ھیں ۔ صداقت ، حسن و خیر وہ اقدار ھیں جو نفس انفرادی سے زیادہ عظیم اور زیادہ دائم و قائم ھیں ۔ ان سے توصل انسان کو مروت و ایثار پر آمادہ کرتا ھے ۔ خارجی دنیا کے متعلق ھمارے علم میں مسلسل اضافہ ھوتا جارھا ھے ۔ اس کے ساتھ ساتھ نفس کے عرفان میں بھی اضافہ ھونا چاھئے ۔ سقراط کی یافت کہ 'علم نیکی ھے' آج سے زیادہ کبھی اتنی صحیح نہیں ثابت ھوئی ۔"

آگے چل کر وہ کہتے ھیں "سائنس کی ترقی نے انسان کے ھاتھ میں قلت و فقر کے مسائل کے حل کی کنجی دے دی ھے ۔ اب بھوك اور بیماری پر فتح پانا ھمارے اختیار میں ھے ۔ اور اسی طرح معاشرۂ انسانی اور مادی دنیا کا تباہ کرنا بھی ھمارے اختیار میں ھے ۔

---

(۱) دیکھو "Report of the Inquiry Constituted under Punjab Act II of 1954 to inquire into the Punjab Disturbances of 1953, Lahore 1954" یہ "منیر رپورٹ" کے نام سے مشہور ھے ۔ اس پر ولفرڈ کینٹ ول اسمتھ نے اپنی کتاب Islam in Modern History میں بحث کی ھے جو پرنسٹن میں سنہ ۱۹۵۷ء میں طبع ھوئی ص ۲۳۰ ، خصوصا ص ۲۳۳ .

علم بذات خود ایک بے رنگ اور غیر جانب دار سی چیز ہے - اس امر کا دار و مدار کہ علم کو تباہی و بربادی کے لئے استعمال کیا جائے یا تخلیقی اغراض و مقاصد کے لئے، اس ایمان و عقیدہ پر ہے جو ہمارے قلوب کو گرماتا ہے! ہمارے ایمان کی بنیاد اب وحی و الہام یا سریت و غموض پر نہیں رکھی جاسکتی، لیکن اس کو نفس کی تحدیدات سے تو بہرحال ماوراء ہونا چاہئے - انفس و آفاق کا عقلی علم، مختلف و متضاد نقاط نظر کی موجودگی میں تحمل اور روا داری، فراست و شفقت کے ساتھ بنی آدم سے توصل و اتحاد، اس ایمان کے ضروری اجزاء ہیں جو آج کی مصیبت زدہ اور پریشان دنیا میں ہماری امیدوں کا سہارا ہوسکتا ہے - ۱ "

اسلام میں حریت فکر کے جمود کی ایک اور جاذب توجہ شہادت ربی اگنانز، مے باوم کی کتاب The Jewish Mission سے ملتی ہے - وہ ایک ترقی پسند یہودی ہے، وہ اپنے خیال کی مدافعت میں کہتا ہے کہ یہودیوں نے توریت کو نہیں چھوڑا بلکہ عصر جدید کی زندگی میں توریت، جہاں تک کہ اس کی دیوانی اور فوجداری قانون کا تعلق ہے، بے اثر ہوگئی ہے - " اسلام میں (یہودیت میں نہیں) وحی کو قانون کا ماخذ سمجھا جاتا ہے " جب عصر جدید کے خواخیم کہتے ہیں کہ توریت کا کوئی قانون بھی منسوخ نہیں ہوسکتا تو علمائے اسلام سے ان کا تشابہ زیادہ نظر آتا ہے نہ کہ علمائے یہود، یا خواخیم سے - آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ اسلام نے وحشیوں کو عقلی تہذیب کا درس دیا، " لیکن اس کے لئے اس کو ایک قیمت بھی ادا کرنی پڑی - کسی کو آزاد نہیں چھوڑا گیا - اسلام ایک دینی کلی تعلیم ہے، کلیت پسندی ہے" یہودیت آزادی کے بغیر عمل نہیں کرسکتی -

(۱) دیکھو " Faiths for a Complex World " (پیچیدہ دنیا کے لئے عقائد) جو The American Scholar میں شائع ہوا، سنہ ۱۹۵۷ء، ص ۲۱۹ و ما بعد.

ہمیں اس بیان پر یہ اضافہ کرنا ہے کہ حقیقی اسلام بھی ہر معاملہ میں ، ہر عقیدہ میں ، ہر نظریہ میں فکر و نظر کی آزادی کے بغیر فروغ نہیں پاسکتا ۔ جس طرح کہ لوتھر نے عیسائیت میں عقائد کی دیوار منہدم کردی ، اور ترقی پسند قوم یہود نے یہودیوں کو ایک مجدد الصورۃ یہودیت عطا کی ، اسی طرح ایک آزاد خیال اسلام کو بھی تسلیم کرلیا جانا چاہئیے اور اس کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہونا چاہئیے ۔ اگر ہم تقلید پسندی کا احترام کرتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایمان کی ایک آزاد خیال تعبیر کو کفر قرار دیا جائے ؟ علماء کچھ کہیں ، ہمیں قوت کے ساتھ اس امر پر اصرار کرنا ہوگا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے تو وہ قطعاً مسلمان ہے ، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس کے عقائد پر اعتراض کرے یا اس کو ایمان سے محروم قرار دے ۔ وہ خطرناک حربہ جس کو ' فتوے کفر ' کہا جاتا ہے اب ایک مضحکہ انگیز سہو زمانی قرار دیا جائے گا ۔ اس کا اثر لوٹ کر مفتی ہی کی ذات پر پڑتا ہے ، خاطی کی اس سے نہ اصلاح ہوتی ہے نہ اس کو ہدایت نصیب ہوتی ہے ۔ ایمان و ایقان صرف ضمیر کا معاملہ ہے ، اور اس عہد میں ایمان کے معاملات میں ضمیر کی آزادی کو تسلیم کیا جاتا ہے ۔ غور و فکر کے بعد صرف اتنا کہا جاسکے گا کہ فلاں شخص کی رائے غلط ہے ، یہ نہیں کہا جاسکے گا کہ وہ کافر ہے ۔

جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ " عظیم الشان مذاہب کا ظہور ہوا اور ان کا بنی نوع انسان پر غیر معمولی طور پر اثر بھی پڑا ۔ تاہم اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ادب و احترام کے ساتھ اور بغیر کسی کے قلب کو اذیت پہنچائے یہ کہوں گا کہ ان ہی مذاہب نے ، جس حد تک کہ انسان کے ذہن کو جامد ' متعصب اور ادعائیت پسند بنانے میں حصہ لیا میری رائے میں اس حد تک ان کا اثر مائل بہ شر رہا ۔ جو بات انہوں نے پیش کی ممکن ہے کہ وہ اچھی ہو ، لیکن جب دعوی

یہ کیا گیا کہ آخری لفظ کہہ دیا گیا ھے تو پھر معاشرہ پر جمود طاری ھوگیا ۔ ۱ ‘‘ یہ میرا اذعان ھے ، اور اس میں دوسرے بھی شریک ھیں ، کہ اسلام اب کوئی حرکی قوت نہیں رھا ، اس پر اضطراب زمانہ میں وہ خلق کی صحیح سمت ھدایت نہیں کر رھا ھے اور اس لئے اس کی تعلیمات اور عقائد کی ایک جدید تعبیر نہایت ضروری ھے ۔ اس صورت حال کا مسلمانوں کو مقابلہ کرنا چاھئے ۔

ھمیں اس امر کا شعور ھونا چاھئے کہ بہت سارے مذھبی اعمال و اشغال اب بے جان مراسم ھوکر رہ گئے ھیں ۔ بہت سارے شائستہ اور باحیا مسلمانوں کو اب نماز اور روزے سے تسکین اور تشفی نہیں ھوتی ، مذھب پر اچھی کتابیں نہیں لکھی جارھی ھیں ، عورتوں کے ساتھ معاشی اور اخلاقی اعتبار سے اچھا سلوک نہیں کیا جارھا ھے ، ترقی یافتہ ممالک میں بھی رجعت پسند علماء کے فتووں کی وجہ سے عورتوں کو سیاسی حقوق نہیں دئے جارھے ھیں ، جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ھے وہ بھی معاشی طور پر مفلوک ، تعلیمی لحاظ سے پست اور روحانی اعتبار سے مفلس ھیں ، اسلام کے اکثر قدیم ونفع بخش قوانین زمانہ کا ساتھ نہیں دیتے ۔ ایک ترقی پذیر جدید مملکت میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی کوشش اور زندگی کو قدیم اسلامی روش پر ڈھالنے کی سعی بالآخر ناکام ھوکر رھے گی ۔

اب قلوب کو ٹٹولنے کا زمانہ آگیا ھے ۔ اسلام کی اب تعبیر جدید ضروری ھے ، ورنہ اس کی روایتی شکل فنا ھوکر رھے گی !

’’ Illustrated London News ‘‘ کی ایک تازہ اشاعت میں میں نے ایک خاص جذبہ کے زیر اثر پڑھا کہ ’’ اس موسم میں ھماری یاد تازہ کی جاتی ھے کہ تقریبا دو ھزار سال قبل ، ایک ایسے زمانہ میں جو ھمارے

(۱) What is Culture? (تہذیب کیا ھے ؟) مطبوعہ Orient Review جلد سوم ، شمارہ ۵ مئی سنہ ۱۹۵۷ ع ص ۹ ۔

عہد سے بھی زیادہ ظلم و ستم سے مملو تھا ، ایک مفلس یہودی عورت کو ، جو اپنے شوہر کے ساتھ ایک پر ہجوم سرائے کے اصطبل میں پناہ گزین تھی ، ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عیسی تھا ، اس کی زندگی اور تعلیم نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا اور اس کو اچھی طرح جاننے والوں کے علاوہ دوسرے بے شمار لوگ بھی ، الوھیت سے متصف کرتے ہیں ۔ '' اور کلام مجسم ہوا اور ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسے باپ کے اکلوتے کا جلال ، فضل اور سچائی سے معمور '' (انجیل یوحنا) اس انسان کی ساری تعلیم ، خواہ اس کو الہی تعلیم سمجھا جائے یا انسانی تعلیم ، ——— اور اس کی زندگی اور موت کا ہر واقعہ جو قید تحریر میں آچکا ھے اس تعلیم کی تائید کرتا ھے ——— یہ تھی کہ محبت اور ایثار ھی کے ذریعہ انسان اس دنیا میں مسرت اور دوسری دنیا میں ابدی زندگی حاصل کرسکتا ھے ۔ یہ تعلیم ایک حد تک تو قدیم عبرانیوں کے عمیق مذہب اور فلسفہ پر مبنی تھی لیکن بڑی حد تک بالکل نئی تھی اور عیسی ھی سے مختص تھی ۔ یہ مشرق کی ہر مملکت اور جدید رومی حکومت کے عقیدے اور عمل کے بالکل خلاف تھی جو اس وقت کلی اقتدار کے حصول کی کوشش کر رھی تھی اور اس دنیا پر تو حکمران تھی ھی جہاں عیسی پیدا ہوئے ۔ جب اس کی تشریح کی گئی تو اس کے معلم کو صلیب پر کھینچ دیا گیا کہ ایک مجرم کی طرح فضیحت اور عذاب کی موت مرے ، اور ظلم و حسد و بغض وغلط بیانی کو بظاہر پوری کامیابی حاصل ہوئی ۔ اور جب اس مقام پر جس کو '' کالوری '' کہا جاتا ھے عیسی کو صلیب پر چڑھایا گیا تو خود اپنی تعلیم کے عین مطابق انہوں نے صلیب کے نیچے دیکھ کر فرمایا : '' اے باپ انہیں معاف کردے کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رھے ھیں ۔ ۱ ''

---

(۱) آرتھر بری انٹ ' لندن نیوز باتصویر ' ۲۱ ڈسمبر سنہ ۱۹۵۷ع ص ۱۰۶۸ ۔

اور میں نے اپنے نفس سے کہا کہ اسلام کا ظہور دنیا میں ایک عرب کی تعلیم کے ذریعہ ہوا جو مکہ کا باشندہ تھا۔ وہ ایک مفلس مرد تھا جو کسب معاش کے لئے محنت کرتا تھا۔ اس کا نام محمد تھا۔ اس نے ایک عمر رسیدہ خاتون سے شادی کی اور اس نے اس کو ایک باایمان اور صالح آدمی پایا۔ وہ ایک حلیم، کریم اور سچا انسان تھا اور اس کے پڑوسی اس کو "امین" کہہ کر پکارا کرتے تھے وہ مراقب رہا کرتا اور کئی کئی دن ایک غار میں جا کر عبادت کیا کرتا تھا۔ جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس پر وحی کا نزول ہوا۔ خدا نے اس سے کلام کیا اور اس نے خدا سے۔ اس کو خدا پر جو ایمان تھا اس کی شہادت قرآن دیتا ھے۔ محمد ھمارے طرح بشر تھے لیکن کلام خدا کا کلام تھا:

الحمد لله رب العلمین *	ساری تعریف اللہ کے لئے ھے، وہ سارے
الرحمن الرحیم *	جہان کا مربی ھے، رحمن رحیم ھے، مالک
ملک یوم الدین *	روز جزا کا، ھم بس تیری ھی عبادت کرتے ھیں
ایاك نعبد و ایاك نستعین*	اور بس تجھ ھی سے مدد چاھتے ھیں،
اھدنا الصراط المستقیم *	چلا ھم کو سیدھا راستہ ان لوگوں کا راستہ
صراط الذین انعمت	جن پر تو نے انعام کیا ھے نہ ان لوگوں کا
علیھم غیر المغضوب	(راستہ) جو زیر غضب آچکے ھیں
علیھم ولا الضالین*(آمین)	اور نہ بھٹکے ھوؤں کا!

پیغمبر نے ھم سے ویسی ھی گفتگو کی جیسے ایک انسان انسان سے کرتا ھے، نہ ایسی گفتگو جیسے خدا اپنے بندوں سے کرتا ھے۔ انہوں نے ھمیں تواضع، صداقت، اخوت، شجاعت، فیاضی، امانت، فتوت کی تعلیم دی۔ آپ نے فرمایا: "اوگو! ھاں بیشک ھر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ھے" نیز آپ نے فرمایا: "اے رب کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا؟" لوگوں نے کہا، ھاں! آپ نے اللہ کا

پیغام پہنچا دیا۔۱ ‘‘ پیغمبر نے ہمیں یہ عظیم الشان پیغام پہنچایا ہے، صلوات اللہ علیہ! ہمیں یہ سمجھنا چاہئیے کہ آج اس کا مفہوم کیا ہے، نہ کہ گذشتہ زمانہ میں کیا تھا یا آنے والے زمانہ میں کیا ہو گا۔

میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ کائنات خدا کی مخلوق ہے اور کائنات میں ایک نظم ہے۔ خدا پر ایمان اور کائنات کے نظم پر ایمان میرے عقیدے کے دو بنیادی اجزا ہیں۔ میرا اس پر بھی ایمان ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور یہ کہ وہ دنیا کے دوسرے عظیم الشان معلمین سے نہ افضل تھے نہ ان سے ادنی:۔

قولوا امنا باللہ و ما انزل	کہہ دو ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور
الینا و ما انزل الی ابراھیم	اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراھیم
و اسمعیل و اسحق	و اسمعیل و اسحق اور یعقوب اور اولاد
و یعقوب و الاسباط و ما	(یعقوب) پر اتارا گیا اور جو موسی و عیسی
اوتی موسی و عیسی و ما	کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے انبیاء
اوتی النبیون من ربھم	کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا اور
لا نفرق بین احد منھم	ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق
ونحن لہ مسلمون *	نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۳۶)

میں اپنشد، بدھ، موسی اور عیسی کی تعلیمات سے بہت متأثر ہوں۔ میں تمام مذاہب و ادیان کا ادب و احترام کرتا ہوں۔ میں اسلام کے علمائے اجل کی بھی تعظیم کرتا ہوں لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔ میرا ایمان میرا اپنا ایمان ہے جس کی تشکیل میری اپنی زندگی کے متعلق میرے اپنے نقطہ نظر، میرے اپنے فلسفے، تجربہ اور وجدان سے عمل میں آئی ہے۔ میں ہر مسلمان کو بلکہ ہر انسان کو یہ حق دیتا ہوں کہ وہ اپنے دین و عقیدہ کی خود تشکیل کرے۔ ’’لکم دینکم ولی دین*‘‘

(۱) ماخوذ از خطبۂ حجۃ الوداع۔

میں نہیں مانتا کہ اجتہاد کا دروازہ بالکل بند ہوچکا ہے۔

میرا ایمان ہے کہ قرآن خدا کا پیغام ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے جس کو محمد عربی نے سنا، اور انہوں نے اس کو اپنے الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کیا، اپنے کلام کے ذریعہ، عربی زبان میں پیش کیا۔ میرا یہ یقین ہے کہ ہر عہد میں، ہر ملک میں ان الفاظ کی جدید تعبیر ہونی چاہئے اور ان کو ازسرنو سمجھا جانا چاہئے۔ میرا یہ اذعان ہے کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ اس پیغام کو اپنے طور پر سمجھے۔ میں اسلام کے بڑے مفسرین کا احترام کرتا ہوں، لیکن میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں اگر میں ان کے تیقنات کا ساتھ نہ دے سکوں، کیوں کہ یقین دراصل انسان کے ضمیر کا معاملہ ہے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ وہ میرے ضمیر کے محافظ ہیں!

میرے یقین کی رو سے قانون کو مذہب سے علحدہ کیا جانا چاہئے، میرا یقین ہے کہ سائنس اور مذہب دو جدا چیزیں ہیں۔ میں صداقت، حسن و خیر پر یقین رکھتا ہوں جن کا زندگی پر اطلاق ہوتا ہے۔ میں اخوت، شجاعت، وفا، فیاضی اور تواضع جیسے فضائل پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں نماز کا قائل ہوں لیکن اس نماز کا نہیں جو ایک بے روح رسم کے طور پر عائد کردی گئی ہو اور جو دور حاضر کی زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

میں مسلمان ہوں اس لئے اسلام کی ”تین زبانوں“ کے حسن و لطافت سے بہت زیادہ متأثر ہوں۔ تین زبانیں یہ ہیں: پہلے عربی، پھر فارسی اور ترکی، اور دوسری ان سب زبانوں سے بھی جو اللہ رب العالمین کی حمد اور رسول اللہ کی محبت کے ترانے گاتی ہیں۔ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے فن، موسیقی، شاعری اور دست کاری سے متأثر ہوں۔ مجھے ان سے ایک روحانی رشتہ ہے جس کا احساس میری روح میں ہر وقت حاضر و موجود ہے۔ میں ایک مہذب مسلمان کی شاندار

مہمان نوازی اور دلفریب خوش خلقی کی داد دیتا ہوں ۔ میرا یقین ہے کہ اسلام ہر قسم کے لوگوں کا مذہب ہے خواہ ان کے حالات کچھ ہوں ، خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر ، جاہل ہوں کہ عالم ، مبتدی ہوں کہ البیرونی یا ابن خلدون کی طرح منتہی !

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ پیغمبر اسلام کا گزر چند افراد پر ہوا ۔ آپ نے ان کو سلام کیا اور ٹھیر گئے اور پوچھا : " تم کون ہو ؟ " انہوں نے جواب دیا کہ "ہم مومن ہیں " آپ نے دریافت فرمایا " کیا تمہارے ہاں اس کا کوئی ثبوت ہے؟ " انہوں نے کہا "ہاں" آپ نے فرمایا " پیش کرو " انہوں نے کہا : " ہم نعمت میں خدا کا شکر کرتے ہیں اور مصیبت میں صبر ، اور قضائے الہی پر راضی ہیں" حضور نے فرمایا کہ " بیشک تم مومن ہو " ! میں رہ گزر کے انہیں مسکین مسافروں میں اپنا شمار کرتا ہوں !

اسلام نوع انسان کا ایک مذہب ہے -- واحد مذہب نہیں ۔ وہ زندگی کا ایک طریقہ ہے ۔ وہ توحید باری کا اعلان کرتا ہے ۔ وہ تمام انبیاء کی تعظیم کرتا ہے ۔ اس کی تعلیمات یہودیت و عیسائیت سے ماخوذ ہیں ، سیدنا موسی اور سیدنا عیسی اسلام کے مبلغ ہیں ۔ اسلام محمد رسول اللہ کی محبت کا نقش دل پر بٹھاتا ہے ۔ ان ہی کی ذات مبارک نے وحشی عرب کو متمدن انسان بنادیا ۔ وہ سب سے زیادہ قابل محبت انسان تھے ۔ انہوں نے اخوت، تواضع ، حسن و کرم ، ترحم ، صداقت و خدمت خلق کا سبق دیا ۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ صرف ایک بشر ہیں ، فرشتہ نہیں ، روح نہیں ، خدا نہیں ! وہ خدا کے ایک رسول تھے ، اوتار نہیں ۔

اسلام اس امر پر زور دیتا ہے کہ کائنات میں ایک نظم ہے ۔ وہ صداقت ، حسن و خیر کو بہت اہمیت دیتا ہے ، جو فلاطونی اقدار ہیں ۔ جہاں تک صداقت کا تعلق ہے ، بہت کم تہذیبوں نے سائنس اور فلسفہ کی

اتنی خدمت کی ھے جتنی کہ اسلام نے! اسلام نے ایک شاندار تہذیب پیدا کی، یونانی اور سنسکرت زبانوں سے کتابوں کے ترجمے کئے، حکمت اسلامیہ تمام جدید سائنس کا منبع قرار دی جاسکتی ھے ـ حسن کے سلسلہ میں اسلام نے فن، موسیقی، اور علم تعمیر کو ترقی دی ـ خیر کی حد تک اس نے اخوت انسانی کا اعلان کیا اور اس پر عمل کر دکھایا ـ اس طرح اس نے جمہوریت کے جدید تصور کی راہ صاف کی ـ اس نے بین قومی قانون کی بنا ڈالی ـ

تقریباً سات صدیوں تک تہذیب کی خدمت کرنے کے بعد اسلام پر ظلمت کا سایہ پڑنے لگا ـ تعصب و تشدد نے اس کی روح کو کمزور کر دیا، عصبیت نے اس کی دینیات کی زبان بندی کر دی' اور کلیت پسندی نے اس کی جان نکال لی ـ گزشتہ دو صدیوں سے کوشش کی جارھی ھے کہ اس کو اس کی زنجیروں سے رہا کیا جائے ـ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اسلام کو ایک ظالم حکومت نے قید کر رکھا ھے جس کے دائرہ میں "پروانۂ حاضری ملازم" کا عمل دخل نہیں! ھمیں اس سرور و رحم و اخوت و تحمل و معقولیت کی روح روشن کو پھر سے آزاد کرنا چاھئے اور عہد جدید کا انسان اس کے حضور میں زیادہ شاد و بامراد ھوگا! اس ذات گرامی نے، جس کے نام سے پیش نظر کتاب منسوب کی جارھی ھے، کسی زمانہ میں ــــ ھر زمانہ کے لئے ــــ اسلام اور قومیت کے تعلق سے کچھ باتیں کہی تھیں، ھم اسی کے ولولہ انگیز الفاظ پر اپنی بات کو ختم کرتے ھیں:

"میں مسلمان ھوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ھوں کہ مسلمان ھوں ـ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ھیں ـ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ھونے دوں ـ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کی تہذیب، اسلام کے علوم و فنون میری دولت کا سرمایہ ھیں، اور میرا فرض ھے

که اس کی حفاظت کروں ۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے ۔

”لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے ، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی ، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے ۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں ۔ میں اس متحد اور ناقابل تفریق قوم کا ایک جزء ہوں ۔ اس قوم کی عظمت بغیر اس قیمتی جزء کے نامکمل ہے ۔ میں اس ترکیب کا ایک ضروری جزء ہوں اور میں کبھی اس دعوی سے دست بردار نہیں ہوں گا ۔

”ہم اپنے ساتھ ایک بڑی دولت لے آئے ہیں اور یہ سرزمین بھی اپنی بے پایاں دولت سے معمور تھی ، ہم نے اپنی دولت اس ملک کے سپرد کردی اور ہندوستان نے اپنے خزانوں کے منہ ہمارے لئے کھول دئے ۔ ہم نے اس ملک کو اپنی ملک کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ عطا کیا جس کی اس کو سخت ضرورت تھی ۔ ہم نے اس کو جمہوریت و مساوات کا پیغام پہنچایا ۔ ۱ “

---

(۱) مولانا آزاد کا خطبۂ صدارت اجلاس کانگرس (رام گڈھ) یکم اپریل سنہ ۱۹۵۸ء م ۱۳ رمضان سنہ ۱۳۷۷ھ ۔

مولانا آزاد اور چڑیاں

از

مالکم میکڈونالڈ

جب مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے محبوس تھے تو انہوں نے وہاں ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا جس کا عنوان ”چڑیا چڑے کی کہانی“ تھا۔ اس مضمون میں ان چڑیوں کا ذکر کیا گیا تھا جنہوں نے مولانا کے کمرے میں اپنے گھونسلے بنائے تھے، وہ اپنے بچوں کی پرورش کررہی تھیں اور اپنی دوسری دلچسپ اور پرشور سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ حقیقت میں وہ اس زندان میں مولانا کی رفیق اور ہمدم تھیں۔

اس کہانی میں وہی لطافت و ظرافت موجود ہے جو عام طور پر مولانا کی تحریر و تقریر میں پائی جاتی ہے لیکن اس کے علاوہ اس میں چڑیوں کی عادات و اطوار پر ایسے صحیح مشاہدات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا کا اس طرف میلان طبع ہوتا تو وہ ایک ممتاز ماہر حیوانات ثابت ہوتے۔ اگر وہ سیاسیات سے احتراز کرتے اور اس کی بجائے فطرت کے مطالعہ کی طرف توجہ کرتے تو وہ قلعہ احمد نگر کی زندان میں اتنا عرصہ اداسی کے عالم میں زندگی نہیں بسر کرتے بلکہ آزادی اور مسرت کے ساتھ اس کشادہ زمین پر پرندوں کی زندگی کے مشاہدہ میں اپنا وقت صرف کرتے۔

لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو ظاہر ہے کہ اب وہ مولانا آزاد نہیں رہتے جو اپنے دوستوں کے محبوب و مطلوب رہے ہیں، اور جنہوں نے ہندوستان میں تاریخ کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں ایک ایسی نسل میں کھولی تھیں جس کو ہندوستان کی آزادی دوبارہ حاصل کرنی تھی، اس لئے ان کے قلب نے، جو حب وطن

سے سرشار تھا، سوائے اس کے کوئی اور صورت نہیں پائی کہ ہندوستان کی قومی تحریک کے رہنماؤں کے ہراول دستہ میں شریک ہو کر اپنے قدم آگے بڑھائیں۔ یہاں تأسف کی ضرورت تو نہیں لیکن صرف یہ تفکر کافی ہے کہ ان کے ہم وطنوں کا عظیم الشان نفع چڑیوں اور ان کی حبس کے لئے اندوہ ناک نقصان ثابت ہوا۔

زندان کی زندگی کی کوفت سے نجات پانے کے بعد شاید انہیں کبھی اتنا وقت نہیں ملا کہ وحشی پرندوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے۔ خصوصاً جب انہوں نے حکومت ہند میں اپنا نیا عہدہ سنبھالا تو وہ امور مملکت میں بالکلیہ منہمک ہو گئے، ورنہ انہیں خود دھلی میں اس کا موقع مل جاتا کہ ''علم طبائع الطیور'' میں اپنی خدا داد قابلیت کو ترقی دے سکتے، جس کا اظہار انہوں نے پہلی اور آخری دفعہ ''چڑیا چڑے کی کہانی'' میں کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض دفعہ یہ شہرۂ آفاق مدبر جب اپنے باغ میں آرام کی خاطر بیٹھتا ہوگا تو اس کی نگاہ اس دار الحکومۃ دھلی کے ایک دوسرے مشہور شہری پر بھی پڑتی ہوگی جس کو 'گوریا' یا 'کنجشک خانہ' کہا جاتا ہے، اور پھر اس کو قلعہ احمد نگر کے زندان کے اپنے قدیم رفیق کے اس نقش ثانی سے ایک قسم کی الفت محسوس ہوتی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کابینہ کے اجلاس میں جانے سے پہلے وہ کچھ لمحوں کے لئے ان زندہ ھستیوں کو بھی مسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو جو آزاد ہندوستان میں --- وہی ہندوستان جس کو آزادی دلانے میں اس نے اتنی جد وجہد کی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری پر مسرت ایام میں اس کے مکان اور باغ میں اپنی بھی زندگی بسر کر رھے ھیں! کیوں کہ دھلی کی آبادی میں بے شمار خوبصورت پرندے بھی شامل ھیں!

ہم میں سے بہتوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ دھلی کی نفیس شاھراھوں اور با رونق باغوں میں وحشی جانوروں کی مختلف انواع

بکثرت نظر آتی ہیں ۔ سب سے زیادہ عام نوع تو وہی ہے جس سے تعلق کا مجھے اعزاز حاصل ہے ۔۔۔ جماعت سفراء کے افراد! ہائی کمشنروں کی سات، سفراء کی اڑتیس، اور وزراء کی تقریبا بارہ مختلف قسمیں ہوتی ہیں (حکومت کے وزیر ان کے علاوہ ہیں) جن کا مولانا خود ایک غیر معمولی حسین نمونہ ہیں ۔ مدبرین ''ڈیپلومات'' سب کے سب عزت مآب ہیں، ان میں بہت ساری قابل قدر خوبیاں ہوتی ہیں، گو ان کی بعض عادتیں عجیب و غریب سی ہیں، مثلاً وہ شام کے چھ اور آٹھ بجے کے درمیان شراب نوشی کی مختلف محفلوں میں اکٹھے نظر آتے ہیں!

خوش قسمتی سے صبح کے وقت، چھ اور آٹھ بجے کے درمیان، شراب کی محفلیں نہیں ہوتیں ۔ اس وقت کم از کم میں تو اپنے تفریحی مشغلہ کے لئے آزاد ہوتا ہوں ۔ میں اپنے باغ میں دوربین لے کر گھومتا ہوں اور اس راجدھانی میں زندگی کی دوسری انواع کا بھی مشاہدہ کرتا ہوں ۔ یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ یہ عظیم الشان شہر، جو ہزار سال سے مہذب، پر سطوت، راجدھانی رہا ہے، وحوش و طیور کی وحشی اور غیر مانوس مملکت سے نہایت قریب ہے ۔ میرا مکان راشٹر پتی بھون اور پارلیمنٹ کی عمارتوں اور سرکاری دفاتر سے کچھ قدم کے فاصلہ پر ہے اور میں نے یہاں نو مختلف قسم کے عقاب اور شکرے اپنے باغ میں دن کی روشنی میں دیکھے ہیں اور بعض اوقات رات میں گیدڑ بھی دریچوں کے نیچے چیختے سنائی دیتے ہیں ۔

میری فرصت کا ایک محبوب مشغلہ پرندوں کا مشاہدہ ہے ۔ گزشتہ اٹھارہ مہینوں میں میں نے اپنے باغ میں ایک سو بیس مختلف قسم کے وحشی پرندے دیکھے ہیں اور گرما کے اس موسم میں یہاں ۲۶ مختلف انواع نے اپنے ایک سو سے زیادہ گھونسلے بنائے ہیں ۔ پرندوں کی یہ کثیر تعداد میرے باغ کی پھولوں کی کیاریوں اور جھاڑیوں میں

جمع ہوتی ہے ، کھاتی ہے ، اچھلتی کودتی ہے ، اپنے گھونسلے بناتی ہے ، اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے ، انہیں مطلق پرواہ نہیں کہ باغ کی دیوار کے پیچھے بسیں ، موٹریں ، سیکل سوار اور پیادہ رو کنگ جارج اوینیو میں جمع ہیں اور شور و غل میں مصروف !

ضمناً یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ دہلی کے پرندے اتنے ہی خوبصورت ہوتے ہیں جتنے کہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ کے پرندے ہوا کرتے ہیں ۔ ان میں سے ہم ان نفیس پرندوں کا ذکر کر سکتے ہیں : سنہری اوریول ، پھولے ہوئے سر کا پراکیٹ (یہ ایک قسم کا چھوٹا طوطا ہے جس کی دم لانبی ہوتی ہے) ہوپی (اس کے پر کئی رنگ کے ہوتے ہیں اور سر پر کھڑی کلغی ہوتی ہے) پتلی دم والا پرند جو شہد کی مکھی کہا جاتا ہے ، سبز کبوتر ، سفید آنکھوں والے ، خاکستری سر ، نیلے ، دم جنباں مولے ، اور سنہری کمر والے ھدھد ۔ گو میرے باغ میں پانی کی چادر نہیں تاہم دریائی پرند جیسے سیاہ شکم ٹرن (اس کا قد معمولی مرغابی سے چھوٹا مگر چونچ بڑی ہوتی ہے) اور چھوٹے کارمورانٹ (ماہی خور پرندہ جو گز بھر لمبا ہوتا ہے) اور دلدلی زمین کے پرندے جیسے اگرٹ (چھوٹی قسم کے بگلے) بگلے ، لق لق اور آئیبس (لق لق سے مشابہ) جو اکثر سبزہ زار پر اڑتے نظر آتے ہیں ۔ یہ پرندے قد و قامت کے لحاظ سے ہر طرح کے ہوتے ہیں ، عظیم الجثہ گدوں اور شکروں سے لے کر صغیر قامت وھائٹ تھروٹ (ایک قسم کے خوش الحان پرندے) اور خاکستری رن (چھوٹی گانے والی چڑیاں) تک میرے باغ میں نظر آتے ہیں ۔ ان میں وہ پرندے بھی شامل ہیں جو مختلف قسم کے گھونسلے بناتے ہیں ۔ ان میں سے بعض تو چند ہی ٹہنیوں کے ہوتے ہیں جیسے قمریوں کے گھونسلے ، یا پھر گھانس کے بنائے ہوئے معلق قبے جو زرد سن برڈ کے گھونسلے ہوتے ہیں ، یا دیوار میں صرف ایک سوراخ جس کا

ساز وسامان چھدرا چھدرا ہوتا ہے جو بومچوں کا آشیانہ ہوتا ہے ، یا صرف دو پتے ہوتے ہیں جنہیں ہوشیاری سے جوڑ دیا جاتا ہے اور یہ بیا کا مسکن ہوتا ہے ، یا ایک جالی دار جھولا جو کسی درخت کے تنے پر لٹکتا ہے اور یہ سیاہ ڈرونگو کا جوڑا اپنے لئے بناتا ہے ۔

جب ہم ہر روز مخلوقات کی اس حیران کن کثرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی عائلی زندگی کی بہت سی تفصیلات بھی معلوم ہوجاتی ہیں اور ہم ان کی خوشی و غم میں بھی ایک حد تک شریک ہوجاتے ہیں ۔ ہماری نظر ان کی زندگی کے بہت سارے ڈراموں پر پڑتی ہے جن میں سے بعض الم ناک اور بعض طرب ناک ہوتے ہیں اور یہی ان پرندوں کی زندگی کی ساری واردات ہیں !

مثال کے طور پر مجھے وہ گھونسلا یاد آتا ہے جس کو لمبی ٹانگوں کی جنگلی طوطیوں نے بنایا تھا ۔ ان طوطیوں کی ایک عجیب سی عادت یہ ہے کہ ہر گھونسلا ان پرندوں کا جوڑا نہیں بناتا بلکہ اس کو کاری گروں کی ایک جماعت بناتی ہے جو چار یا چار سے زیادہ افراد پر مشتمل ہوتی ہے ۔ اس سے تعلق رکھنے والی ہر مادہ اس پنچایتی پنگوڑے میں انڈے دیتی ہے اور جب ان سے بچے نکل آتے ہیں تو ان کا تغذیہ حقیقی اور رضاعی والدین کی ساری جماعت کیا کرتی ہے اور یہ قطار بنائے اپنی چونچوں میں عمدہ سے عمدہ لقمے لئے ہوئے اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح مہمانوں کی خدمت کے لئے ملازمین کی ایک قطار کھڑی ہوتی ہے !

لیکن اس گھونسلے میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں عجیب قسم کے حالات دیکھنے میں آئے ۔ میں اس میں پانچ خوب صورت نیلے سبز انڈے دیکھ کر خوش ہوا اور مجھے توقع تھی کے کچھ دن بعد پانچ ننھے ننھے بچے نکل آئیں گے اور رفتہ رفتہ قوت و قامت کے لحاظ سے ترقی کر کے اپنی فطرت کی تکمیل کرلیں گے ۔ ان میں سے ایک دوسروں سے دو روز پہلے

نمودار ہوا اور اپنے ننھے بھائیوں اور بہنوں کی پیدائش سے پہلے کافی موٹا تازہ ہو گیا۔ جب ان دوسروں نے انڈوں سے باہر قدم رکھا تو اس بے وفا دغا باز پہلوٹے نے ان کو گھونسلے سے نیچے پھینک دیا اور تنہا ان کی جگہ پر قابض ہو گیا، اور بہت جلد اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گیا، کیوں کہ جب اس کے پر نکلنے لگے تو ان کا رنگ ھلکا خاکی رنگ نہ تھا جیسا کہ ایک جنگلی طوطی کا ہوا کرتا ھے بلکہ انوکھا سفید و سیاہ رنگ تھا۔ اصل میں یہ بچہ پچ رنگ کلغی والا ککو (کوئل جیسا پرندہ) تھا! اس کے ماں باپ دور دراز آفریقہ سے اڑ کر چند ھفتہ پہلے دھلی کے ایک گھونسلے میں یہ شرارت کر گئے تھے۔ لیکن طوطیوں کی جس جماعت نے یہ گھونسلا بنایا تھا وہ اس دھوکے کو سمجھ نہ سکی اور اپنے ھی معصوم بچوں کے اس قاتل کی پرورش کرتی رھی۔ چاروں کے چاروں قطار باندھے اپنے منہ میں کیڑے مکوڑے لئے اس کو غذا دیتے رھے، یہاں تک کہ یہ کم سن پاجی اس قابل ہو گیا کہ اپنے پروں کو جنبش دے سکے، چنانچہ وہ اڑا اور انہیں الوداع کہتا ہوا اپنا راستہ لے لیا!

پرندوں کے بچوں کا اپنے ماں باپ کی سرپرستی میں تدریجی طور پر ترقی کرنا اور پھر ان کا اس قابل ہو جانا کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر خارجی دنیا میں قدم زن ہو سکیں -- یہ سارا نظارہ بڑا دلکش ہوتا ھے! ایک دن دوپہر کے وقت میں نے یہ نظارہ ایک نازک کاسہ نما آشیانہ میں دیکھا، یہ دو خوب صورت پرندوں کا مسکن تھا جن کو "سفید چشم" کہا جاتا ھے! ان کے دو چوزے آشیانہ میں پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اچانک آشیانہ کی دیوار کے اوپر آ بیٹھا، ایک تیز و تند اور کرخت آواز نکالی اور اپنے پروں کو پھڑ پھڑانا شروع کیا۔ کچھ لمحوں کے لئے تذبذب کی حالت میں اس نے اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسی پر چلنے والا کوئی نٹ ایک ڈھیلی رسی پر اڑ کھڑا رھا ھے، اور پھر وہ اپنے مقام سے سر کے

بل نیچے گرا اور درخت کی شاخوں میں اٹک کر رہ گیا۔ فوراً ہی اس کے ماں باپ آپہنچے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لا مکان سے ابھی ظاہر ہوئے ہیں، ان کی آواز میں تشویش تھی، وہ اضطراب کی حالت میں ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اچک کر بیٹھتے تھے، گویا اپنے ننھے سے کہہ رہے تھے کہ ذرا ہمت سے کام لے اور پھر آشیانہ میں اٹھ آئے! ننھے نے ان کی بات مان لی اور ماں باپ کو سکون نصیب ہوا۔

لیکن اس خورد سال "سفید چشم" میں جاں بازی کی مضطرب روح اپنا کام کر رہی تھی۔ بہت جلد وہ پھر آشیانہ کے ایک گوشہ پر چڑھ بیٹھا، کچھ دیر اضطراری طور پر لڑکھڑاتا رہا، اور پھر زور سے گرا۔ لیکن اس دفعہ اپنے گھونسلے ہی میں جا پڑا۔ اس صورت حال کا مشاہدہ کر کے اس کے والدین نے محسوس کیا کہ اس بچے کو گھوارہ ہی میں ٹھیرے رہنے پر مجبور کرنا فضول ہے، کیوں کہ وہ اب بڑا ہو رہا ہے، بلوغ کی منزل میں قدم رکھ رہا ہے اور اس کے دل میں امنگیں جوش مار رہی ہیں۔ وہ بھی آشیانہ کے اطراف کی شاخوں پر چھلانگیں لگانے لگے، اور کہنے لگے کہ اچھا بابا ذرا ہمت سے کام لینا! بچے نے بھی ہمت سے کام لیا لیکن جذبات کے اظہار میں غلط اقدامات سے بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ ضروری نہیں کہ میں یہاں اس بچے کی جد و سعی کی ان تفصیلات کو پیش کروں جن سے گزر کر اس نے یہ سیکھا کہ گوشۂ آشیاں پر اپنا توازن کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے اور قریب ہی کی شاخ پر حفاظت و سلامتی کے ساتھ اچک کر کس طرح بیٹھا جاسکتا ہے! اس عمل کے سیکھنے میں پورے دس منٹ لگ گئے جو میرے لئے قہر، کرب اور فتح و نصرت کے جذبات سے لبریز تھے، اور اس عرصہ میں میں سہم سہم جاتا تھا، ھکا بکا رہ جاتا تھا کیوں کہ مجھے خوف یہ ہوتا تھا کہ کہیں یہ بچہ جو بالکل ہی نادان نظر آتا ہے نیچے زمین پر گر کر ہلاک نہ ہو جائے!

اس دوران میں دوسرا بچہ گھونسلے میں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا اور بظاہر اس کو ان عظیم الشان واقعات کا کوئی علم ھی نہ تھا ـ والدین نے اس کو للکارا ، اس نے فورا حرکت کی اور بڑی دقت سے گھونسلے کے کنارہ پہنچ سکا ـ میں چاھتا تھا کہ ٹھیر کر اس کا حال بھی دیکھ لوں لیکن اسی حیران کن لمحہ ایک اھم سفارتی فریضہ میری راہ میں حائل ہو گیا ـ میں نے اپنی گھڑی دیکھی اور اندازہ ھوا کہ اب یقینا وقت آ گیا ھے کہ میں سفراء کے غول میں جا ملوں جو جاپان کے وزیر اعظم کے استقبال کے لئے پالم کی طیران گاہ پر جمع ھو رھے تھے ـ جاپانی وزیر اعظم بیس منٹ بعد حکومت ھند کے معزز مہمان کی حیثیت سے ورود فرمانے والے تھے ـ میں نے اپنی دم دبائی اور راہ فرار اختیار کی ـ ایک گھنٹہ بعد جب میں اپنے باغ میں واپس آیا تو دیکھا کہ دونوں کم سن ''سفید چشم'' اپنے آشیانے سے دو قدم بلند شاخ پر بازو بازو بیٹھے ھوئے اپنے کارنامہ پر بہت خوش نظر آتے ھیں اور اپنے والدین کی پرخروش مبارکبادیاں سن رھے ھیں !

بعض وقت پرندوں کی زندگی میں قصہ کا اختتام غیر متوقع طور پر مختلف ھوتا ھے ـ کسی زمانہ میں میں ایک اونچے درخت پر ایک سبز کبوتر کا گھونسلا دیکھا کرتا تھا ـ اس کے دو انڈوں میں سے بچے ابھی نکلے تھے اور کبوتری ان نو مولود بچوں کے پاس طمانیت کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی ـ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ عائلی زندگی کا یہ خوش آیند آغاز ھے ، ناگہاں ایک سایہ سا درخت کی شاخوں پر سے گزرا اور گھونسلے کے قریب درخت کے تنہ پر آ جما ـ میں نے دیکھا کہ وہ ایک زاغ صحرائی ھے ، جو کووں کے قبیلہ کا ایک زرق برق پروں والا ، بھاڑے کا بانکا فرد ھوتا ھے ، یہ یک روزہ چوزوں کو لقمہ بنانا بہت پسند کرتا ھے ـ وہ نیچے سے اپنی خنجر نما چونچ کے ضرب آشیانہ کی دیواروں پر لگانے لگا تاکہ اس نازک نوعمر چوزہ کو لقمہ بنائے ـ ماں نے

ھنگامہ مچایا اور باپ جو بازو کے ایک درخت پر بیٹھا ھوا تھا اڑا اور اس موذی پر جھپٹا اور اس کو مار بھگایا ۔ پھر کچھ دیر سکون واطمینان سا نظر آنے لگا !

لیکن میں اسی دوپہر اپنے برآمدے میں بیٹھا چاء پی رہا تھا کہ کبوتر کی درد بھری آواز سے میرے کان گونجنے لگے اور میں دوڑا کہ دیکھوں کیا واقعہ ھے ۔ زاغ صحرائی پھر پہنچ گیا تھا اور تنہ پر بیٹھ کر آشیانہ کی نیچے کی سطح پر اپنی چونچ مار رہا تھا ۔ کبوتر کے دونوں چوزے آشیانہ میں پڑے ھوئے تھے اور بیچاری محصور ماں پریشان کھڑی تھی اور کونوں سے جھک جھک کر اس ناخواندہ حیوان پر ضرب لگانے کی کوشش کر رھی تھی ۔ لیکن افسوس ھے کے باپ کا پتہ نہ تھا ، وہ شاید کسی اور کام میں کسی اور جگہ مصروف تھا ۔ دو لمحوں کے دوران میں میں نے ایک خوفناک جنگ دیکھی ۔ زاغ صحرائی کبوتری کے وار خالی دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ آشیانہ میں سوراخ ڈالنے کی بھی برابر کوشش کر رہا تھا تا کہ ھوسکے تو اس میں سے اپنے شکار کو گھسیٹ نکالے ۔ کبوتری کا غصہ اور زیادہ تیز ھو رہا تھا اور وہ زیادہ جھک کر دشمن پر وار کرنے کی کوشش کر رھی تھی ۔ میرا خیال ھے کہ زاغ صحرائی عمداً اس کی پہنچ سے باھر ھو رہا تھا تا کہ کبوتری اپنی گردن زیادہ دور تک لے جائے ۔ اگر اس کا یہ مقصد تھا تو وہ بالآخر کامیاب بھی ھوا ۔ حسین و پر غضب کبوتری یکایک اپنا توازن کھو بیٹھی اور نیچے گری ۔ زاغ اس پر جھپٹا اور گتھم گتھا ھوگیا ، اور دونوں پرند ایک دوسرے کو کاٹتے اور نوچتے زمین پر گرے ۔ نیچے کچھ دیر ھاتھا پائی جاری رھی اور پھر میں نے دیکھا کہ زاغ تیر کے مانند گھونسلے کی طرف جھپٹا ، اس کے کنارہ پر آ بیٹھا ، اپنا سر اندر ڈالا اور دونوں مسکین چوزوں کو اپنی چونچ میں دبا کر لٹکاتا ھوا چلتا بنا !

پرندوں کے معاشرہ میں جو حادثات ھر روز میرے باغ میں

ہوا کرتے ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں ۔ مثلاً میں نے ایک روز دیکھا کہ ایک گندمی عقاب درخت کے اس جوف کے دھانہ پر آ بیٹھا جو طوفان برق و باراں نے اس درخت میں ڈال رکھا تھا ۔ ایک عرصہ سے یہ جوف ہزاروں جنگلی شہد کی مکھیوں کا نشیمن بنا ہوا تھا ۔ جوں ہی عقاب کے قدم جمے مکھیاں اپنے قلعہ سے نکلیں اور جنگی جہازوں کے دستہ کی طرح سبھوں نے عقاب کے سر، بازو اور گردن پر ھلہ بول دیا ۔ لیکن اس عظیم الجثہ شکاری پرندے نے، جو بالوں کے اسلحہ سے پوری طرح مسلح تھا، اس خفیف ایذا رسانی کی کوئی پرواہ نہیں کی، درخت کے تنہ کے اندر اپنی چونچ ڈالی، مکھیوں کے انڈوں کا ایک بڑا، شیریں و خوشبودار مومی ٹکڑا نکالا، پاس کے درخت پر جا بیٹھا اور مزے لے کر کھانے لگا ۔ مکھیاں کچھ دیر تک بیکسی کے عالم میں بھنبھناتی رہیں اور پھر فلسفیانہ انداز میں اپنی راہ لیں! اور یہ جوف کئی ماہ بعد پہلی مرتبہ خالی اور خاموش نظر آنے لگا ۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ کے لئے نہیں ۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا کہ شوخ و گستاخ میناؤں کا ایک جوڑا اس جوف میں داخل ہوا، ان کی چونچوں میں گھونسلا بنانے کا عجیب و غریب سامان موجود تھا ۔ ان مگن لیکن بدتمیز پرندوں کا ذوق عمارت سازی نہایت بھونڈا ہوتا ھے، یہ چاکلیٹ کے نقروی کاغذ، چیتھڑے، ردی کاغذ اور اسی طرح کا کوڑا کرکٹ دھلی کی گلیوں سے چن لیتے اور ان ھی سے اپنے مکان کی تعمیر و آرایش کرلیا کرتے ھیں ۔

میرے باغ میں یا دھلی کے کسی اور باغ میں اگر کوئی ماہر حیوانات جائے تو اس کو اپنی توجہ صرف پرندوں ھی پر مرکوز کرنے کی ضرورت نہیں ۔ سبزہ زاروں، پھولوں اور ترکاریوں کے تختوں اور جھاڑیوں والے اس دو ایکڑ کے باغ میں بہت ساری دلکش و دلفریب جان دار ھستیاں اپنی زندگی بسر کرتی ھیں ۔ ان میں گلہریوں، چھپکلیوں، چوھوں، مینڈکوں، بڑباگلوں، چمگادڑوں اور تتلیوں

اور حشرات الارض کی ایک پریشان کن کثرت شامل ھے ۔ ان کی خانگی زندگیاں بے حد دلچسپ ھوتی ھیں ۔

بعض دفعہ جب میں اپنے باغ کے مطالعہ کے کمرہ میں کچھ کام کرتا بیٹھا رھتا ھوں تو ایک نیولا دروازہ میں گھس آتا ھے ، متجسسانہ انداز سے میرے کمرہ میں گھومتا ھے ، میرے قریب آتے ھوئے شبہہ کی نظر سے مجھے دیکھ کر ھوا کو سونگھنے لگتا ھے ، میری بو سے ناراض سا معلوم ھوتا ھے اور پھر احتیاط سے کمرہ سے نکل جاتا ھے ۔

یہ وہ چند دلکش جانور ھیں جنھیں مولانا آزاد اپنی مخصوص نثر میں پیش کر کے انھیں مخلود الذکر بنا سکتے تھے بشرطیکہ وہ ھندوستان کی تاریخ کا ایک نیا باب آغاز کرنے کی بجائے تاریخ حیوانات کا مطالعہ کرنا پسند کرتے ۔ یہ تو نہ ھوسکا ، لیکن چڑیوں پر ان کا واحد مقالہ ھندوستانی ادب میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ھے ۔ اگر ان پرندوں کو یا ان کی اولاد کو یہ معلوم ھوتا کہ ان کی یاد میں ایک کتاب المیلاد شائع کی جارھی ھے تو وہ بھی آزادی کی جد و جہد کے زمانے کے قلعہ احمد نگر والے قدیم رفیق کی یاد میں ضرور اظہار عقیدت کرتے ۔ ان ھی کی جانب سے میں نے یہ مختصر مقالہ لکھا ھے !

مرغ آفتابی[1] کا آشیانہ

از

هوریس الکزنڈر

مولانا آزاد کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا ، مثال کے طور پر ان کا وہ مضمون پیش کیا جاسکتا ھے جو انہوں نے قید کے زمانہ میں چڑیوں کے عادات و اطوار کے متعلق لکھا تھا ۔ اس لئے میں یہ غیر ضروری سمجھتا ھوں کہ آپ سے اس امر کی معذرت چاھوں کہ اس وقت میں مرغ آفتابی کے ایک جوڑے اور اس کے آشیانہ کی ایک مختصر سی کہانی سناؤں ۔ یہ اس ذات گرامی کی یاد کے احترام میں ھے جو یہ جانتی تھی کہ جن افراد کے قلوب پر حقیقی عظمت کی تجلی ھوتی ھے انہیں ان چیزوں سے بھی مسرت و سکینت حاصل کرنی ھوتی ھے جو بظاہر حقیر سی نظر آتی ھیں !

میں مولانا کے مرض الموت کے زمانہ میں نئی دھلی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک مکان میں مقیم تھا جو مولانا کی رھایش گاہ سے چند ھی گز کے فاصلہ پر تھا ۔ جب میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ میں پہنچا تو اپنے سامنے ایک ارغوانی رنگ مرغ آفتابی کا آشیانہ دیکھا جس کا ابھی کچھ ھی حصہ بنا تھا اور جو ایک معلق رسی سے وابستہ تھا ۔ یہ جگہ خود پرندے کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی ، کیوں کہ جب لوگ برآمدہ میں نکل کر بیٹھا کرتے تھے تو وہ آشیانہ سے چند ھی قدم کے فاصلہ پر ھوتے تھے اور خود یہ چھوٹا پرندہ اس چیز کو پسند نہیں کرسکتا تھا کہ آدم کی اولاد اس کے رین بسیرے سے اس قدر قریب ھو ۔ وہ اپنے آشیانہ کی تعمیر کے لئے کچھ ساز و سامان منہ میں لئے اچانک درختوں سے نکلتا ، تشکیک کے عالم میں آشیانہ پر منڈلاتا اور نہایت

---

(۱) ایک چھوٹا سا پرندہ جس کے پروں کا رنگ بہت سرخ ھوتا ھے .

عجلت کے ساتھ اس پر اپنے قدم جماتا ، نو اندوختہ مواد آشیانہ میں پھینکتا اور فوراً ہوا ہو جاتا ، دل ہی دل میں شاید یہ کہتے ہوے کہ "واقعی یہ انسان دوسروں کے جذبات کا کچھ لحاظ نہیں کرتے ، وہ مجھ سے یہ توقع کیسی رکھ سکتے ہیں کہ میں کوئی معقول آشیانہ بناؤں اور وہ مجھ سے اس قدر قریب بیٹھے گپ مار رہے ہوں اور اپنی اچانک نقل و حرکت سے مجھے پریشان کر رہے ہوں !" یہ واقعہ تھا کہ آشیاں سازی کا بہت کچھ سامان زمین پر گر جاتا تھا اور برآمدہ غلیظ ہو جاتا ۔

یہاں اس عجیب و غریب بات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گو پرندے اپنے آشیانوں کی تعمیر کے لئے ہر جگہ سے موزوں مواد فراہم کرنے میں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن خود اپنے آشیانوں کے نیچے پڑی ہوی چیزوں کو حاصل کرنے کی مطلق فکر نہیں کرتے ۔ اگر کوئی چیز ان کے منہ سے چھوٹ کر گر جائے تو پھر وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب یہ کسی طرح قابل حصول نہ رہی ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے میں نے انگریزی زبان کے مشہور مصنف ڈبلیو ، ایچ ، ھڈسن کی ایک کتاب پڑھی تھی اس میں اس نے ان کووں کا ذکر کیا ہے جو اپنے گھونسلے بنا رہے تھے ۔ انہوں نے بہت سارے تنکے اپنی چونچ سے نیچے گرادئے تھے ۔ کئی دن تک انہیں پھر نہیں اٹھایا ۔ ایک دن ایک آزاد ، غیر پابند رسم و رواج پرندہ نے جس کا تعلق کسی خطرناک انتہا پسند بدعتیوں کے گروہ سے معلوم ہوتا تھا ، دیکھا کہ گھونسلوں کے نیچے تنکوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے ۔ وہ ان کی طرف لپکا ، دوسروں نے فوراً اس کا اتباع کیا اور کچھ ہی دیر میں سارے تنکے اٹھا لے گئے ۔ پھر وہ چارے کی تلاش میں نکلے اور بہت جلد تنکوں کی ایک نئی ڈھیر جمع ہو گئی ۔ اب انہوں نے گرے ہوئے تنکوں کو اٹھا لینے اور محنت بچانے کی کوشش نہیں کی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرندوں میں محنت، بچانے والی تدابیر کو کام میں لانے کا رواج نہیں ہے ۔

اب ذرا آفتابی پرندوں کا قصہ سنئے۔ خوش قسمتی سے دن میں کئی گھنٹے ایسے بھی گزرتے تھے جن میں کوئی انسان ان کی مساعی میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے آشیانہ کی تعمیر تیزی سے ہونے لگی۔ جب میں اس طرف سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت چھوٹا سا کاسہ نما دروازہ بن چکا ہے۔ صرف قبہ کی تعمیر اور استرکاری باقی رہ گئی تھی۔ گو میں نے دو ایک مرتبہ پرندہ کو پریشان کئے بغیر غور سے دیکھا لیکن معلوم نہ کر سکا کہ وہ گھانس کے تاروں کو کس طرح بٹتا ہے۔ وہ دو ایک چکو کے ادھر ادھر لگاتا تھا اور پھر تازہ مواد کے لئے چل دیتا تھا۔ لیکن چونچ کی ان ہی چند ضربوں نے کام کی تکمیل کردی تھی۔ نازک سے نازک اوزار بھی کسی کام کی اس سے بہتر تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی چونچ ہی سب سے زیادہ نازک آلہ تھی۔

میں نے کہا ”اس کی چونچ“۔ اس سے قبل میں نے کہا تھا ”ان کے آشیانے“ لیکن یہ آشیانہ بناتا کون ہے؟ نر، مادہ یا دوسرے؟ اس سلسلہ میں مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ساری سخت محنت بیچاری مادہ ہی کرتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں کہ نر کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اکثر میں نے اس کے پر اثر اور شیریں نغمے تھوڑے ہی فاصلہ سے سنے ہیں۔ ایک سے زیادہ دفعہ، جب مادہ اپنے کام میں مصروف ہوتی وہ اچانک کسی قریب کی رسی پر آبیٹھتا، دو چار مؤثر نغمے سناتا اور پھر اپنی راہ لیتا۔ جفاکش بیوی پر ان نغموں کا کیا اثر ہوتا ہے؟ شاید وہ اس کی آواز سے ایک نشاط محسوس کرتی ہے اور تازہ دم ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ نغمہ کچھ ایسا اچانک اور بلند آواز ہوتا ہے کہ میرے کانوں کو تو ایسا سنائی دیتا تھا کہ گویا ایک مرد چلا کر کہہ رہا ہے: ”اے کاہل عورت، کیا تو اپنا یہ کام ذرا تیزی سے نہیں کرسکتی؟“ لیکن پرندوں کی خفیہ زبان کی ترجمانی

کرنے والا میں کون ؟

ایک دن کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ، ہم برآمدے میں بیٹھ کر کافی پی رہے تھے ۔ میں ان سے یہ سوال کرنا چاهتا تھا کہ کیا آپ نے مرغ آفتابی کا آشیانہ دیکھا ھے ؟ لیکن بات زبان پر نہ آسکی ! میں نے دیکھا کہ آشیانہ کا نشان تك بھی باقی نہ تھا ! شاید میں نے غلط رسی پر نگاہ ڈالی تھی ! دیوانہ وار چاروں طرف میں نے نظر دوڑائی، آشیانہ کا وجود نہ تھا ، رسی آشیانہ سے خالی تھی اور نیچے کی زمین بھی صاف پاك نظر آئی ! پرندوں کا بھی پتہ نہ تھا ، گھر کا سارا نقشہ ھی بدل چکا تھا ۔ آخر بات کیا تھی ؟ صداقت کا پتہ لگانا مشکل تھا ، شاید اسی میں خیر تھی ! سنا یہ ضرور گیا کہ آشیانہ ٹوٹ کر نیچے گرگیا تھا ۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ خبر صحیح نہیں تھی ۔ اگر برآمدے کو پاك صاف رکھنا میری ذمہ داری تھی تو مجھے پرندوں سے نفرت ہونی چاهئے تھی ۔ بہر حال جس کسی نے بھی جگہ کو صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور آشیانہ کی بربادی کا ذمہ دار تھا اس نے بہت جلد محسوس کرلیا ہوگا کہ اس مکان میں اس قسم کی صفائی کوئی مرغوب چیز نہ تھی ! نہ ھی خود پرندوں نے اشارہ پاکر یہ کام کیا تھا ۔ پرندے بھی انسان کی طرح ’’ گھر سے زیادہ عزیز کوئی مقام نہیں ‘‘ کے قائل ہوتے ھیں ۔ وہ بھی مہاجرین اور دوسرے خود سر افراد انسانی کی طرح رهائش کے لئے زیادہ کشادہ مقام پر هنکائے جانے کو پسند نہیں کرتے ۔

دوسری صبح جب میں برآمدے میں نکلا تو صاف طور پر نظر آنے لگا کہ ثابت قدم چھوٹے پرندے نے اپنا کام پھر سے شروع کردیا ھے ۔ اسی قدیم جگہ پر کئی تار بٹے جا چکے تھے ۔ شاید عنقریب وہ کچھ انڈے دینا چاهتی تھی ۔ یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ھے ۔ اگر آشیانہ تیار نہ ہو تو پرند انڈے دینے میں کتنی تاخیر کر سکتے ھیں ؟ کون جانتا ھے کہ کن عجیب و غریب قوانین کی وجہ سے باطنی ارتقا میں

خارجی حالات کے زیر اثر تاخیر یا تعجیل ہو سکتی ہے؟ لیکن اتنا تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ کافی تاخیر یا تعجیل ہو سکتی ہے اور اس کا ثبوت مشاہدہ سے ملتا ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ آشیانہ کی تکمیل کسی حادثہ کی وجہ سے نہیں ہونے پاتی ۔ بہر حال اس نے اس دفعہ اپنا آشیانہ نہایت تیزی سے بنایا ۔ ابھی اس کی عمر کے تین دن گزرے تھے کہ مجھے اس مکان ہی سے رخصت ہونا پڑا! اور یہیں پر میری کہانی ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ مجھے اس کے بعد کے واقعات کا علم نہیں ۔ اب ایک مہینہ گزر چکا ہے اور مجھے امید ہے کہ انڈے دئے جا چکے ہوں گے اور حالات قابل اطمینان ہوں گے! اے چھوٹے پرندے، آشیانہ کے لئے جو مقام تو نے منتخب کیا تھا وہ ایک نفیس طبع جاروب کش کے لئے مشکل سے موزوں ہو سکتا تھا لیکن میرے لئے تو قطعا موزوں تھا!

خطائے بطلیموسی

از

سی راجہ گوپال آچاریہ

متعدد حق جویوں کی ناکامی کے باوجود صداقت کے حصول اور روحانی کمالات پر فائز ہونے کی تمنا قلب انسانی سے نکالی نہیں جاسکتی۔ روح انسانی میں صداقت مطلقہ کی یافت کا جذبہ ہر ناکامی کے بعد بھی باقی اور قائم رہتا ہے۔ شکست کا اعتراف نہ کرنا اور لا ادریت سے مطمئن نہ ہونا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔

اشیاء کی قیمت کا اندازہ لگانے میں انسان اپنی انا کو مرکز کائنات قرار دیتا ہے اور یہی وہ جنم پاپ ہے جو اس کو لا محدود کی طلب و تلاش میں گمراہ کردیتا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ متقی اور صالح افراد بھی، جب غم اور ناقابل برداشت کرب و الم میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو جس ہستی کا مدۃ العمر ادب و احترام کرتے آئے ہیں، اسی کے خلاف علم بغاوت بلند کردیتے ہیں۔ ان کے سابقہ ایمان کی شدت کفر کی نفی میں بدل جاتی ہے۔ جس طرح ایک ناراض لڑکا اپنے باپ کے خلاف ہوجاتا ہے اسی طرح انسان بعض دفعہ خدا کے متعلق بھی یہی پہلو اختیار کرلیتا ہے۔ چوں کہ یہ آسمانی باپ نظروں سے پوشیدہ یا غائب ہے ناراضی یا خفگی شدید انکار اور صریح مادیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے!

بطلیموسی علمائے ہیئت نے زمین کو اجرام سماویہ کا مرکز قرار دیا تھا۔ ان کی نظر میں زمین کا مرکز کائنات ہونا ایک بدیہی واقعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح انسان اشیاء کی قیمت کا اندازہ اپنی تشفی کے معیار سے کرتا ہے اور یہی چیز اس کو بداہۃً صائب نظر آتی ہے۔ مادی کائنات کی لامحدود وسعتوں کے متعلق جو جدید

معلومات ہمیں حاصل ہوے ہیں ، ان کے با وجود ، راحت و مسرت کا انسان کو جو احساس ہے وہی اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ لگانے میں نقطۂ مرکزی کا کام دیتا ہے ۔ اس خطا کو ایک افسانہ کی شکل میں پیش کرکے یہ بتانا نہایت آسان ہے کہ کائنات ، اس کی ساخت یا اس کی تدبیر امر کو اس سیارے کی بسنے والی بے شمار انواع میں سے ایک نوع کی مسرت یا عدم مسرت کے پیمانہ سے جانچنا کس قدر غیر حکیمانہ فعل ہے ۔ اگر ہمیں اس جملہ کے استعمال کی اجازت دی جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ "ریاضیاتی دیانت" کی سخت توہین ہے ، اور اس پیمانہ میں زمین کے تمام باشندوں کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔ صرف انسان ہی کو خدا کے خلاف فیصلہ کا حق دیا جاتا ہے اور زمین پر بسنے والی ذی حیات انواع میں شاید انسان ہی کو عادل کہلانے کا سب سے کم حق ہے ۔ خوش قسمتی سے انسان کا ذہن اپنے مغالطہ کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اپنی ذات کو مرکز کائنات قرار دینا غلط ہے ، گو جذبات کا وفور صداقت کو کتنا ہی محجوب کردے ! انانیت کی باطنی کمزوری کے با وجود ہمیں اس امر کا ادراک ہوسکتا ہے کہ "عدالت" کا ہم نے جو تصور قائم کیا ہے وہ محض انسانی احساسات پر مبنی ہے اور اس کو کائنات اور اس کے خواص و صفات کے جانچنے کے لئے استعمال کرنا اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ اعداد کا رنگ ثابت کرنا یا تصورات کو کسی مادی پیمانہ سے ناپنا ۔

اس عمل میں جو خطا پوشیدہ ہے اس کی ایک بدیہی مثال تو یہ ہوگی کہ ہم صحرا کے وحوش کو ان کے مسکن و مامن سے محروم کرکے ان کو قابل کاشت اراضی میں منتقل کردیں ۔ کیا ہمارا یہ فعل شیروں ، چیتوں اور ہاتھیوں کے حق میں انصاف ہوگا ؟ ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ عدل کا جو تصور ہم نے قائم کیا ہے وہ بالکلیہ انسان مرکزی ہے اور اس کائنات میں بھی جس کا اکتشاف ہمیں

دوربینوں سے ہوتا ہے، کسی طرح درست نہیں اور یہ اقدار کے تعین کا صحیح ذریعہ بھی نہیں۔

ہم اس چیز پر اعتراض نہیں کر رہے ہیں کہ عقل انسانی اپنے نقطہ نظر سے عمل کرے، ہم صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ صدق و کذب کا استنباط ان التباسات کی اساس پر کرنا غلط ہے جو ہماری انانیت پسند کوتاہ بصیرت کے پیداوار ہیں۔ یقیناً 'دھرم' (ضمیر) ہی پر انسانی زندگی کی اساس قائم کی جانی چاہئے لیکن ہم دھرم کو وہ مرقات نہیں قرار دے سکتے جس کے ذریعہ صداقت کی بلندی تک پہنچ ہو سکتی ہو، وہ صداقت جو انسان کی دنیا اور اس کے اعمال و افعال کے قوانین و قواعد سے ماوراء ہے۔ صداقت انسانی مصلحت یا افادیت کا کوئی نظریہ نہیں۔ وہ بالکل دوسری ہی چیز ہے، وہ انسان کے افعال و اعمال سے اسی طرح بے نیاز و غیر محتاج ہے جس طرح ریاضیاتی مسائل خیر و شر سے بے تعلق ہیں۔

ہندوستان کا دستور

از

ایم - سی - چھاگلا

کسی ملک کے دستور میں اس کی گزشتہ تاریخ اور اس کے مستقبل کی تمنائیں دونوں شامل ہوتی ہیں۔ ہندوستان کا دستور محض ایک سادہ تختی پر تحریر نہیں کر دیا گیا ہے۔ یہ دستور کسی خونی انقلاب کا نتیجہ بھی نہیں، کیونکہ اقتدار تو پر امن طریقہ سے حکومت برطانیہ سے نکل کر ہندوستانی قوم کی طرف منتقل ہوا، اور قوم نے ہندوستان کو ایک مقتدر جمہوریہ میں تبدیل کرنے کا سنجیدگی و وقار کے ساتھ ارادہ کر کے اپنے لئے ایک دستور مرتب کیا۔

زیر بحث دستور سے پہلے حکومت ہند کا قانون سنہ ۱۹۳۵ء ہی دستور سمجھا جاتا تھا۔ اس نے صوبوں کو ایک محدود شکل کی ذمہ دارانہ حکومت عطا کی تھی لیکن مرکز میں گورنر جنرل اپنی مجلس انتظامی کے ساتھ اب بھی پورے اختیارات کا حامل تھا۔ اس قانون سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ قوم اور جمہوری اداروں پر اعتماد نہیں کیا جاتا ہے، اقلیتوں کے حقوق پر بیجا اصرار کیا جاتا ہے اور ان تمام امور کو انگریزوں کے ہاتھ دے دیا گیا ہے جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہیں۔ گو نیت تو یہ تھی کہ دستور وفاقی ہو لیکن قانون کے وفاقی دفعات پر کبھی عمل نہیں کیا گیا، کیونکہ ہندوستانی ریاستوں کو دستوری خاکہ سے خارج ہی رکھا گیا اور انہیں ایک قسم کا استقلال عطا کیا گیا، ہاں ان پر وائسرائے کا اقتدار اعلی قائم رہا جو شاہ انگلستان کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا۔

حکومت ہند کا قانون خود ایک تفصیلی دستور تھا، اور ہمارے دستور میں بہت ساری دفعات ایسی ہیں جو اس قانون سے نقل کرلی

گئی ھیں ۔ چوں کہ ھندوستان کا نظم و نسق اپنے ماضی سے کامل طور پر منقطع نہیں ھوسکتا تھا اس لئے ان انتظامی وسائط و وسائل کو باقی رکھنا پڑا جو برطانیہ سے ورثہ میں ملے تھے اور ان دفعات کو دستور میں قائم رکھنا پڑا جو حکومت ھند کے قانون میں موجود تھے ۔ لیکن دستور کی تسوید میں مختلف ممالک کے دستوروں کا مطالعہ کرنا پڑا ، چنانچہ ھمارے دستور میں اس مطالعہ کے اثرات ملتے ھیں ۔ بڑی حدتك یہ دستور برطانیہ اور امریکہ کے نمونہ پر بنایا گیا ھے ۔

امریکہ کے دستور کی مثال کی اس ضروری حدتك تقلید کی گئی ھے کہ دستور کو ملك کا اعلی ترین قانون قرار دیا گیا ھے ۔ ھر حاکم اسی کا تابع ھے اور اسی کے ساتھ وفا شعاری اس کے لئے لازم ھے ۔ یہ برطانوی دستور سے مختلف چیز ھے ، کیوں کہ یہاں پارلیمنٹ مقتدر اعلی ھوتی ھے اور کسی بھی قانون کو نافذ کرسکتی ھے ، اگر اس کے اقتدار پر کسی قسم کی تحدید عائد ھوتی ھے تو وہ صرف اتنی ھے کہ قانون عملی اور معقول ھو ۔ اس کا ایك اھم نتیجہ یہ ھے : اگر دستور کو اقتدار اعلی حاصل ھے تو عاملہ و مقننہ کو دستور کے حدود میں رہ کر عمل کرنا ھوگا ، انہیں ان حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو دستور نے قائم کئے ھیں ۔

یہ فریضہ محکمہ عدالت کے سپرد کیا گیا ھے ۔ انگلستان میں محکمہ عدالت کتنا ھی اھم کیوں نہ ھو اور اس کی روایات کتنی ھی وقیع و بلند کیوں نہ ھوں ، اس کو مقتدر اعلی پارلیمنٹ کے سامنے جھکنا ھی پڑتا ھے ۔ اس کو یہ غور کرنے کا حق نہیں کہ پارلیمنٹ کو کسی قانون کے بنانے کا اختیار بھی ھے اور نہ اس کو یہ حق ھے کہ کسی قانون کی دستوری حیثیت کا جائزہ لے ۔ امریکہ اور ھندوستان میں صورت حال بالکل مختلف ھے ۔ امریکہ میں اور ھمارے یہاں محکمہ عدالت کو تنقید و تبصرہ کا حق دیا گیا ھے ۔ وہ پارلیمنٹ یا ریاست کے

مقننہ کے نافذ کردہ ہر قانون کی جانچ کرسکتا ہے تاکہ اس کی دستوری حیثیت کا تعین کرسکے اور اگر مقننہ نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے تو وہ قانون بے اثر یا کالعدم قرار دیا جاتا ہے ۔

مرکز اور ریاستوں میں حکومت کے عملے کے قیام میں برطانوی دستور کا اتباع کیا گیا ہے ۔ حکومت کا نظام ذمہ دارانہ نظام ہے نہ کہ صدارتی نظام جو امریکہ میں رائج ہے ۔ مجلس عاملہ مجلس مقننہ سے بنائی گئی ہے ، اور اپنے وجود کے لئے مجلس مقننہ کے اعتماد کی محتاج ہے ۔ ان دونوں نظاموں میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی ۔ ذمہ دارانہ حکومت میں مجلس عاملہ رائے عامہ سے زیادہ متاثر ہوتی ہے اور شاید زیادہ صحیح طور پر اس کا اظہار بھی کرتی ہے ۔ مجلس عاملہ ناقابل علحدگی ہے یہی حکومت کو قوت و دوام عطا کرتی ہے گو اس سے مجلس عاملہ کے لئے یہ بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ مخالف رائے عامہ کا مطلق لحاظ نہ رکھے ۔ برطانیہ کا پارلیمنٹ والا نظام جو ہم نے اختیار کرلیا ہے ہر ملک اور ہر حال میں کامیاب ثابت نہیں ہوا ۔ فرانس میں بہت ساری علحدہ جماعتوں کی وجہ سے کوئی وزارت چند ماہ سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی اور اس ملک میں کابینہ ہمیشہ بحران میں مبتلا رہتی اور ناکام ہوتی ہے اور سیاسی اصلاح یا معاشی فلاح کے کسی طویل المدۃ منصوبہ پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرسکتی ۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں یک جماعتی حکومت کا خطرہ لگا رہتا ہے ۔ پارلیمنٹی حکومت کو کامیاب ہونے کے لئے ایک قوی حزب مخالف کا ہونا ضروری ہے جو ضرورت کے وقت ایک متبادل حکومت بناسکے ۔ اس وقت ہندوستان میں ان دونوں کا فقدان ہے ۔ لیکن اس کے موجودہ سیاسی اور معاشی ارتقا کے لحاظ سے شاید یہی صورت حال بہتر ہے ۔ کانگرس کو ، جو برسرحکومت جماعت ہے ، جد و جہد آزادی کی روایات ورثہ میں ملی ہیں اور یہ در اصل قوم کی جماعت ہے

کیوں کہ آزادی سے پہلے یہی ایک قومی تنظیم تھی جس کے حامی بکثرت لوگ تھے - اسی لئے یہ قوم کی احتیاجات سے واقف ہے اور اپنے سینہ میں اس کے مصائب کا درد محسوس کرتی ہے - خوش قسمتی سے ہمارے وزیر اعظم سچے جمہوریت پسند فرد ہیں اور یک جماعتی حکومت کو ہرگز ایسی جبریت کی شکل اختیار کرنے نہیں دیں گے جو بد ترین جبریت ثابت ہوسکتی ہے یعنی ایسی جبریت جس کی تائید عوام کی رائے دھندگی سے ہوتی ہو - ہندوستان میں ہمیں تیزی سے کام کرنا ہے اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ جماعتوں کے عروج و زوال اور ان کے طریق عمل کے تغیر و تبدل کا نظارہ کرتے رہیں - جب ہم اپنے اہم مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر ہمیں ان خطرات پر غور کرنا ہوگا جو اس نظام میں پوشیدہ ہوتے ہیں جو ایک ہی جماعت کو مملکت قرار دے لیتا ہے -

ہمارے دستور کا ایک دلچسپ اور اہم پہلو اس کا حصہ سوم ہے جس میں اساسی حقوق بیان کئے گئے ہیں - یہ وہ حقوق ہیں جن کی ہر شہری کو ضمانت دی گئی ہے بلکہ بعض صورتوں میں ان کو بھی ضمانت دی گئی ہے جو شہری نہیں - یہ ہر فرد کے لازمی حقوق ہیں جو اس کی انسانی عظمت کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہیں - مثال کے طور پر ان حقوق کا ذکر کیا جاسکتا ہے : قانون کی نظر میں مساوات ، سرکاری خدمات میں امتیاز کی ممانعت ، تقریر و تحریر کی آزادی ، متحدہ اداروں یا انجمنوں کی تشکیل کی آزادی ، جائداد یا ملک حاصل کرنے ، قبضہ میں رکھنے یا فروخت کرنے کی آزادی ؛ کسی پیشہ ، حرفہ یا تجارت کو اختیار کرنے کی آزادی ، جان یا انفرادی آزادی سے محروم نہ کئے جانے کا حق ، الا یہ کہ کسی کو اس کی شخصی آزادی سے محروم کرنا قانونا ضروری ہو ، ضمیر کی آزادی کا حق ، کسی مذہب کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا حق ، اپنی تہذیب یا ثقافت

باقی رکھنے کا حق، کسی تعلیمی ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے کا حق اور اگر جائداد جبری طور پر حاصل کرلی جائے تو اس کا معاوضہ پانے کا حق۔

عہد حاضر کے پیچیدہ معاشرہ میں فرد اور مملکت کی صیانت و منفعت کے حقوق میں ہمیشہ تنازع پیدا ہوا کرتا ہے۔ جب مملکت عدم مداخلت کے اصول پر کاربند تھی تو فرد کو اپنے معاملات میں کامل آزادی حاصل تھی۔ لیکن جب مملکت کا نصب العین رعایا کی فلاح قرار دیا جاتا ہے (جیسا کہ ہماری مملکت کا نصب العین ہے) تو پھر فرد کے حقوق اور اس کے اعمال و افعال میں مداخلت ضروری ہوجاتی ہے۔ عصر جدید کا سب سے مشکل مسئلہ یہی ہے کہ ان دو متضاد مطالبوں میں اعتدال قائم کرے تاکہ مقتدر اعلی مملکت اس حد اعتدال سے تجاوز نہ کرسکے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر صورت میں فرد کے حقوق کو خیر معاشری کے تابع کردینا چاہئے۔ اس کے برخلاف اتنی ہی قوت سے یہ استدلال کیاجاسکتا ہے کہ خیر معاشری کا تعین مملکت کرتی ہے اور جس چیز کو مملکت خیر معاشری قرار دیتی ہے ضروری نہیں کہ یہ وہی خیر معاشری ہو جس کو مملکت کے بسنے والے افراد نے متعین کیا ہو۔ یہ بھی کہاجاسکتا ہے کہ بعض انفرادی حقوق اس قدر اساسی ہوتے ہیں اور ان پر روح انسانی کی عظمت کا اس قدر انحصار ہوتا ہے کہ مملکت کا کوئی مفاد یا خود مملکت کی صیانت بھی ان حقوق کی تنسیخ نہیں کرسکتی۔

ہمارے دستور نے اس مشکل مسئلہ کو عملی، اور بحیثیت مجموعی تشفی بخش طریقہ، پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجلس مقننہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنائے جو ان اساسی حقوق کی بھی مخالفت کرسکتے ہیں، اگر اس مخالفت کا محرک جمہور کا مفاد، مملکت کی صیانت، عامۃ الناس کے اخلاق کی نگہداشت یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات کا قیام ہو۔ محکمہ عدالت کو ریاستوں کی عدالت عالیہ

اور مرکز کی عدالت العالیہ کی شکل میں ان اساسی حقوق کا محافظ و نگران قرار دیا گیا ہے ۔ حقوق اساسی پر مجلس مقننہ نے جو تحدیدات عائد کئے ہیں آیا وہ معقول ہیں یا نہیں قابل داد رسی امر قرار دیا گیا ہے اور اس کو قابل داد رسی امر قرار دے کر دستور نے مجلس عدلیہ کو ایک عظیم قوت کا مالک بنا دیا ہے ۔ شہریوں کو ان کے اساسی حقوق سے محروم کرنا مجلس مقننہ کی اکثریت کے اختیار میں نہیں رہا ۔ مجلس مقننہ کی زمام اختیار عدلیہ کے ہاتھمیں ہے اور ہر شہری کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ہر ایسے قانون پر اعتراض کرسکتا ہے جو اس کو ان میں سے کسی حق سے محروم کررہا ہے ، اور بالآخر عدلیہ کو اختیار ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ یہ اعتراض صحیح ہے یا غلط ۔

کافی اصرار کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ عدالتی نظر ثانی کی یہ قوت اس اہم معاشری و معاشی قانون سازی میں حارج ہوسکتی ہے جس کی ہندوستان کو فلاحی مملکت کے حصول میں ضرورت ہے ۔ یہ بتلایا گیا ہے کہ قانون کی عدالتیں اصطلاحی یا فنی پہلو اختیار کرسکتی ہیں اور محض محدود نظری اسباب کی بناء پر قانون سازی کو باطل قرار دے سکتی ہیں اور اس طرح جو چیز عوام کے لئے وسیع معنی میں خیر ہے اس کو نظر انداز کرسکتی ہیں اور اس لئے اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ ہمارے دستور نے پارلیمنٹ کے اقتدار اعلی کو نہیں تسلیم کیا اور عدلیہ کی بجائے پارلیمنٹ کو حقوق اساسی کا محافظ و نگران نہیں قرار دیا ، کیوں کہ پارلیمنٹ ہی اس بات کا بہتر تصفیہ کرسکتی ہے کہ کونسا قانون ضروری ہے اور کس حد تک قانون سازی سے افراد کے حقوق کی تنسیخ ہوسکتی ہے ۔ لیکن واضعان دستور نے یہ محسوس کیا ، اور اس معاملہ میں وہ حق بجانب بھی ہیں کیوں کہ اگر نئی مملکت کی ابتداء ہی میں مجلس مقننہ کو قانون سازی کی غیر محدود قوت دے دی جائے تو یہ بڑی خطرناک چیز ہوسکتی ہے ۔ یہ محسوس کیا گیا کہ

ایک طویل عرصہ تک صرف ایک ہی جماعت کی حکومت رہے گی اور مشکل ہی سے کوئی حزب مخالف وجود میں آئے گی اور ہندوستان میں جمہوریت کا وجود ہی معرض خطر میں پڑجاتا اگر کسی ایک جماعت کو اتنی قوت حاصل ہو جاتی کہ وہ انفرادی حقوق کو پامال کر دیتی اور ان لوگوں کے احتجاج کو نظر انداز کردیتی جن کا اس جماعت سے تعلق نہ ہوتا ۔ اسی لئے ملک کی ترقی کی رفتار کو خطرہ میں ڈال کر، حریت و جمہوریت کے مفاد کی خاطر ایک مستقل اور غیر جانب دار محکمہ مرجوعیہ کی تشکیل عمل میں لائی گئی جو فرد اور مملکت کے درمیان فیصلہ کرسکتا ہے اور جو فرد کے حقوق اور اختیارات اور مملکت کی صیانت اور اس کے مفادات کے متعلق اپنا فیصلہ سنا سکتا ہے ۔

یہ بات نہایت ضروری تھی کہ یہ محکمہ ، مقننہ اور عاملہ سے بالکل آزاد اور مستقل ہو، اس کی دیانت اور غیر جانب داری ہر شک و شبہ سے پاک ہو اور عامۃ الناس کا اس کو کامل اعتماد حاصل ہو ۔ اس لئے دستور نے ایک جماعت عدلیہ ، ریاستوں میں عدالتہائے عالیہ اور مرکز میں عدالت العالیہ کی شکل میں قائم کی جس کو برخاست نہیں کیا جاسکتا اور جو مقننہ یا عاملہ کی کسی طرح زیر اثر نہیں ۔ عدلیہ کے حقوق دستور میں بیان کردئے گئے ہیں اور وہ مقننہ کے نافذ کردہ کسی قانون سے متأثر یا متغیر نہیں ہوسکتے ۔

ہر دستور کے متعلق جو سوال عام طور پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دستور وحدانی ہے یا وفاقی ۔ ہمارا دستور نہ وحدانی ہے اور نہ وفاقی ، گو یہ دونوں کی اہم خصوصیات کا حامل ہے ۔ صورت کے لحاظ سے یہ وحدانی ہے ، کیونکہ یہ ریاستوں کا اتحاد قائم کرتا ہے ۔ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ ایک مضبوط مرکزی حکومت کی اہمیت پر زور دیتی ہے ، اور ان خطرات کی نشان دہی کرتی ہے جو مرکز گریز میلانات کے قوی ہوجانے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔ لیکن ہندوستان پر مرکز سے

حکومت کرنا اور ان گوناگوں مسائل کا حل دریافت کرنا بہت مشکل تھا جو آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جن کی کچھ مقامی خصوصیات بھی ہوتی ہیں اور ہر ریاست میں ان کا رنگ مختلف ہوتا ہے اس لئے ایک حد تک " تضعیف مرکزیت " بھی ضروری تھی ۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو جو رقبہ کے لحاظ سے وسیع --- بعض دفعہ یورپی ممالک سے بھی زیادہ وسیع --- اور آبادی کے لحاظ سے بڑی ہوتی ہیں اتنے اختیارات دینے پڑے کہ مرکز کی زیادہ مداخلت کے بغیر اپنا انتظام سنبھال سکیں ۔ اس لئے ہمارے دستور نے وحدانی حکومت کی بعض اہم خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے متحدہ حکومت کے بعض پہلوؤں کو بھی اختیار کرلیا ہے جن کی وجہ سے ریاستیں بڑی حد تک خود مختار اور مستقل وحدتیں بن گئی ہیں ۔

وفاقی نظم حکومت کی ایک اہم خصوصیت دھری شہریت اور دھری مجلس عدلیہ ہوتی ہے ۔ ججوں کی ایک جماعت ریاستی قوانین نافذ کرتی ہے اور دوسری وفاقی قوانین ۔ ہمارے دستور میں ان میں سے ایک بھی خصوصیت موجود نہیں ۔ شہریوں کی وفاداری و اطاعت کا مرکز متحدہ ہندوستان ہے ، گو ریاستوں میں عدالتہائے عالیہ ہیں لیکن جماعت عدلیہ واحد و سالم ہے ۔ وہ ریاست اور متحدہ حکومت دونوں کے قوانین کو نافذ کرتی ہے ۔ دھلی میں جو عدالت العالیہ ہے وہ ملک کی مختلف عدالتوں کا گویا راس ہے اور نہ صرف ایک وفاقی عدالت ہے بلکہ اعلی ترین عدالت مرافعہ بھی ہے ۔

ریاست کی مقننہ مجلسوں اور مملکت متحدہ کی مقننہ کی قانون سازی کے سلسلہ میں ایک نئی تدبیر سے کام لیا گیا ہے ۔ مملکت متحدہ کی ایک فہرست ہوتی ہے ، ایک ریاستی فہرست ہے اور ایک متراکز فہرست ہے ۔ قانون سازی کے فاضل اختیارات کی حامل مملکت متحدہ کی پارلیمنٹ ہے ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا کے دستوروں میں

صحیح وفاق اصول کی یہ صراحت ہے کہ وفاق کے قانون سازی کے اختیار کو سختی سے متعین کر دیا گیا ہے اور باقی تمام فاضل اختیارات کو ریاستوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ کنیڈا میں اس اصول کے عکس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مختار ریاستوں نے اپنے بعض اختیارات وفاق کے حوالے کردئے اور جو اختیارات کہ انہوں نے اس طرح حوالے نہیں کئے تھے وہ ریاستوں ہی کے یہاں باقی رہے۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوا۔ برطانیہ کے راج میں صوبوں نے کبھی اس طرح کے مستقل اختیارات کا دعوی ہی نہیں کیا۔ جن اختیارات کو انہوں نے استعمال کیا وہ ان کے استعمال کرتے وقت در اصل مرکزی حکومت کے نمائندے تھے اور انہیں مختلف فرائض کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا جو نتیجہ تھا تضعیف مرکزیت کی حکمت عملی کا۔ لہذا جب دستور کے تحت ریاستوں کی تشکیل عمل میں آئی تو انہیں وہی اختیارات سپرد کئے گئے جن کو ضروری سمجھا گیا اور جن سے قومی مفادات کو کسی ضرر کے پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔

متراکز فہرست کی ایجاد ایک نئی ایجاد ہے اور اس کی وجہ سے سلطنت متحدہ کی جماعت مقننہ کے لئے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ ان امور میں بھی یکسانیت پیدا کرلے جن میں ریاستی مقننہ کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں۔ اس فہرست کے تحت ریاستی مقننہ اور مملکت متحدہ کی مقننہ دونوں کی قانون سازی کا دائرہ ایک ہی ہوسکتا ہے، لیکن مملکت متحدہ کی قانون سازی ریاستی قانون سازی پر تفوق رکھتی ہے۔ مملکت متحدہ کی جماعت مقننہ کو وسیع اختیارات دئے گئے ہیں یہاں تک کہ وہ ان امور کے متعلق بھی قانون بناسکتی ہے جن کا شمار ریاستی فہرست میں ہوا ہے۔ پارلیمنٹ کو اختیار ہے کہ ریاستی فہرست

کے کسی امر کے متعلق قانون بناسکے ۔ اگر قومی مفادات کا تقاضہ ہو یا ناگہانی حالات کے پیدا ہونے کا اعلان کر دیا گیا ہو ۔

ہر وفاقی دستور کی ایک اہم خصوصیت اس کی دو ایوانی قانون سازی ہے ۔ ایوان زیرین قوم کا نمائندہ ہوتا ہے اور ایوان بالا ریاستوں کا ۔ ہندوستان میں ہم نے دو ایوانی نظام کو اختیار کرلیا ہے لیکن اس کی جملہ وفاقی خصوصیات کے ساتھ نہیں ۔ دارالعوام یعنی ایوان زیرین کا انتخاب بالغوں کی عام رائے دہندگی کی اساس پر ہوتا ہے اور مجلس نظمیہ (کونسل آف اسٹیٹس) میں ریاستوں کی ساری نمائندگی نہیں ہوتی بلکہ ان کی آبادی کے لحاظ سے ہوتی ہے ۔ ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ صدر بارہ ارکان کو نامزد کرتا ہے جو ادب ، سائنس ، فنون وغیرہ کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

صرف اہم ریاستوں میں دو ایوانی نظام رائج ہے ، اور ایوان بالا کے حلقۂ انتخاب کنندگان میں مقامی عہدہ دار ، طیلسانین ، اساتذہ اور ایوان زیرین یا مجلس قانون ساز کے ارکان شامل ہوتے ہیں ۔ ادب ، سائنس ، فنون ، تحریک امداد باہمی وغیرہ کی نمائندگی کے لئے ارکان کو نامزد کرنے کی بھی گنجائش موجود ہوتی ہے ۔ اس امر کی بھی گنجائش ہے کہ پارلیمنٹ کسی ریاست کے ایوان بالا کو موقوف کردے جہاں ایسی مجلس ہو یا جن ریاستوں میں ایسی مجلس نہیں اس کو قائم بھی کیاجاسکتا ہے بشرطیکہ ریاست کی مجلس وضع قوانین اپنے جملہ ارکان کی اکثریت رائے سے ، یا موجودہ رائے دہندہ ارکان کی دو تہائی کی اکثریت سے ایسا کرنے کا فیصلہ کرلے ۔

بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایوان بالا ایک غیر ضروری تعیش ہے ۔ اس کے برخلاف یہ بھی کہاجاسکتا ہے کہ ایوان بالا قانون سازی کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم کام انجام دے سکتا ہے ۔ یہ نظر ثانی کرسکتا ہے ، یہ ایوان زیرین کے منظور کردہ قوانین پر متانت سے

غور کرسکتا ھے۔ یه بڑے بوڑھے مدبرین کی قابلیت و تجربه سے استفادہ کرسکتا ھے جو سیاسی انتخابات کی گرد سے اپنی ذات کو آلودہ نہیں کرنا چاھتے۔ یه شرط که جو وزراء ایك ایوان کے ارکان ھیں دوسرے ایوان میں شریك ھونے کا حق رکھتے ھیں جامد دو ایوانی نظام کے ثقل کو کافی ھلکا کرسکتی ھے۔

ھم نے اپنے دستور کو سوچ سمجھ کر نہایت لچك دار بنایا ھے۔ چوں که یه دستور نہایت تفصیلی ھے اس لئے یه درست نه ھوتا اگر اس کو سخت اور بے لوچ کردیا جاتا اور اس کے قواعد و شرائط میں ترمیم کو مشکل بنا دیا جاتا۔ دستور میں ترمیم کی صورت یه ھے که ھر ایوان پارلیمنٹ کے جمله ارکان کی اکثریت کی رائے ھو یا ھر ایوان کے موجود اور رائے دینے والے ارکان کی دو تہائی کی اکثریت کی رائے ھو۔ بعض دفعات جو دستور کے وفاقی پہلوؤں سے، اور سلطنت متحدہ اور ریاست کی جماعت عدلیه سے بحث کرتے ھیں ان کی ترمیم کے لئے ریاستوں کی کم از کم نصف مجالس وضع قوانین کی توثیق ضروری ھے۔ انہیں اس قسم کی قرارداد منظور کرنی ھوگی۔

تاریخی وجوہ کی بنا پر ریاستوں کو حصۂ الف حصۂ ب اور حصۂ ج میں تقسیم کیا گیا ھے۔ حصۂ د ریاست پر غور کرنا غیر ضروری ھے، یه صرف جزائر اندمان اور نکوبار پر مشتمل ھے۔ حصۂ ب والی ریاستوں پر دستور کا اطلاق چند ترمیمات کے ساتھ ھوتا ھے، اور گو صرف ایك ھی دفعه ایسی ھے جو حصۂ ب والی ریاستوں سے بحث کرتی ھے، تاھم اس واقعه کی وجه سے دستور کے طالب علم اس انقلاب سے صرف نظر کرلیتے ھیں جو حصۂ ب والی ریاستوں کی تخلیق میں کارفرما رھا ھے۔ جب برطانیه عظمی نے ھندوستان کو اقتدار سونپا تو اس کو ایك نہایت مشکل مسئله حل کرنا تھا یعنی بہت ساری ھندوستانی ریاستیں ایسی تھیں جن پر نوابوں اور مہاراجوں کی حکمرانی تھی

جن کے برطانیہ عظمی سے معاہدے تھے اور جو برطانیہ عظمی کے اقتدار اعلی کے تحت عملا آزاد و خود مختار تھیں ـ صورت حال وہی تھی جو اٹلی میں میازینی اور کیاوور کو در پیش تھی ، یعنی ہندوستان کا اتحاد اور ہندوستانی نظم حکومت میں ریاستوں کا شمول ـ

میری رائے میں حصول آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت کی ایک بڑی کامیابی ہندوستان کے نقشے کو اس طرح رنگنا تھا کہ دنیا کے نقشے میں سارے ملک کا ایک ہی رنگ نظر آئے ـ برطانوی عہد میں ہندوستان کا نقشہ ایک مرقع گوناگوں تھا جس پر ہر طرف زرد نقطے نظر آتے تھے ، ان سے ہندوستانی والیان ریاست کے مقبوضہ رقبوں کی نشان دہی ہوتی تھی ـ پہلا کام چھوٹی ریاستوں کے ایک وفاق کا قیام تھا تاکہ صرف چند بڑی ریاستیں رہ جائیں اور اس امر کی تکمیل کے بعد بڑی ریاستوں کو ترغیب دی گئی کہ ہندوستان کی متحدہ حکومت میں شریک ہوجائیں ـ اس مقصد کے حصول میں کامیابی ہوئی ـ لیکن ریاستوں نے جمہوری ارتقا کی مختلف منزلیں طے کی تھیں ، اس لئے ان کی حکمرانی کے لئے خاص انتظامات کئے گئے ـ حصۂ الف کی ریاستوں میں تو گورنر (والی) کا تقرر کیا گیا اور حصۂ ب کی ریاستوں میں راج پرمکھ کا ـ اب یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ حصۂ الف اور حصۂ ب کی ریاستوں کی تفریق کی ضرورت باقی نہیں رہی اور جدید تنظیم کی رو سے ریاستوں کی ان دونوں قسموں میں کامل یکسانیت پیدا کردی گئی ہے ـ اب ہندوستان کی تمام ریاستوں پر دستور کا یکساں اطلاق ہوگا ـ

حصۂ ج کی ریاستیں ایسی ریاستیں تھیں کہ خاص وجوہ کی بناء پر ان کا انتظام صدر ہی کے سپرد کیا گیا تھا جو اپنے ایک چیف کمشنر (نائب اعظم) یا لفٹنٹ گورنر (حاکم صوبہ) کی وساطت سے حکومت کے فرائض انجام دیتا تھا ـ ان میں سے اکثر ریاستیں ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ضم ہوگئی ہیں اور دستور میں جو امتیاز قائم

کیا گیا تھا وہ اب باقی نہیں رہا۔

میرے خیال میں دستور محض ایک ذریعہ ہے جس کو مملکت اپنے مقصود کے حصول کے لئے استعمال کرتی ہے اور یہ مقصود سقراط کے الفاظ میں ''حیات طیبہ'' ہے۔ دستور میں جمہوریت کے سارے ساز وسامان موجود ہوسکتے ہیں، مثلاً ایک مجلس مقننہ جس کا انتخاب بالغوں کی عام رائے دہندگی سے ہوتا ہے، وزراء مقننہ کے آگے جواب دہ ہوتے ہیں اور ایک مضبوط عدلیہ، تاہم یہ دستور ناکامیاب ثابت ہوگا اگر اس کا ایک خاص مقصد یا غایت نہ ہو۔

ہمارے ملک کے اس مقصد یا غایت کو دستور کی تمہید میں صاف اور واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ ہے تمام شہریوں کے لئے معاشری، معاشی، اور سیاسی انصاف، آزادئ فکر، تحریر وتقریر، یقین و ایمان اور عبادت کی آزادی، رتبہ، حیثیت اور مقام میں مساوات، شہریوں میں مواخات، اور فرد کی عظمت اور قوم میں وحدت کے حصول کی سعی! قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ دستور سیاسی جمہوریت کی تکمیل تو کرتا ہے لیکن معاشری اور معاشی جمہوریت کا حصول اتنا ہی اہم ہے۔

ملک کی آئندہ اجتماعی تنظیم کے متعلق ہمارے وزیر اعظم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ہمارا مقصد اشتراکی نمونہ کے معاشرہ کا قیام ہے اور اشتراکی جمہوریت کے متعلق ہماری حالیہ قانون سازی صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ ہم من حیث الکل ذکور و اناث میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں اور ادنی طبقوں کے داغ کو دور کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کا قیام چاہتے ہیں جس میں ذات پات کی کوئی تفریق نہ ہو۔

ان میں سے اکثر مقاصد کا حصول دستور کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ریاستوں کی مجالس مقننہ اور پارلیمنٹ ان کی تکمیل کرسکتی ہیں۔

دستور نے مقننہ کی واضح اور ناقابل خطا طور پر رہبری کی ہے۔ دستور کا حصۂ چہارم مملکت کی حکمت عملی کے ہدایت بخش اصول پر مشتمل ہے۔ یہ دستور کی ایک غیر معمولی خصوصیت ہے کیوں کہ یہ واضح طور پر بیان کردیا گیا ہے کہ اس حصہ میں جو شرائط و قواعد ہیں ان کا نفاذ کوئی عدالت نہیں کرسکتی۔ یہ اخلاقی ہدایات پر مشتمل ہے اور مملکت کا یہ اخلاقی، نہ کہ قانونی، فرض قرار دیتی ہے کہ قانون سازی کے وقت ان اصول کا لحاظ رکھے۔ اگر ان تمام اصول پر عمل کیا جائے تو ہمارا ملک ' فردوس بر روئے زمین ' کا مصداق ہوجائے گا۔ اس صورت میں ہندوستان نہ صرف سیاسی معنی میں جمہوریت کہلائے گا بلکہ ایک فلاحی مملکت بھی جو اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کا لحاظ رکھتی ہے، ایسی مملکت جس میں تمام شہریوں کو معاشی مساوات حاصل ہوگی، اور جس میں ہر فرد کو اپنی تعلیم، کام، اور اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرنے کا مساوی موقع ملے گا۔

ان رہنما اصول کے لحاظ سے تمام شہریوں کو یہ حق ہوگا کہ اپنا رزق کمائیں، ملت کے مادی وسائل کی ملکیت اور تصرف کی ایسی تقسیم عمل میں لائی جائے کہ خیر مشترک کے حصول میں ممد و معاون ہو؛ معاشی نظام کا عمل ایسا نہ ہو کہ دولت اور پیداوار کے ذرائع ایک مقام پر مرکوز ہوجائیں جس سے ضرر عام کا اندیشہ ہو۔ ذکور و اناث کے لئے مساوی کام کا مساوی معاوضہ ہو۔ ان راہ نما اصول کی رو سے مملکت کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اپنی معاشی ارتقا اور استعداد کے حدود میں رہ کر اس امر کی کوشش کرے کہ ہر شہری کو کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کا حق ملے اور اس کو بے روزگاری، بڑھاپے، بیماری، معذوری اور احتیاج کی دوسری صورتوں میں امداد دی جائے۔ وہ اس امر کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ مملکت تمام مزدوروں کو، خواہ زرعی ہوں

یا صنعتی ، مناسب قانون سازی یا معاشی تنظیم کے ذریعہ ، کام ، گزارے کے موافق اجرت ، کام کا ایسا ماحول جو معقول معیار زندگی کے مطابق ھو اور فرصت کو صرف کرنے کا حق ، اور معاشری و تمدنی ارتقا کے مواقع فراھم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ راہ نما اصول دستور کے نفاذ کے آغاز سے دس سال کی مدت اس غرض کے لئے مقرر کرتے ھیں کہ اس عرصہ میں مملکت تمام بچوں کے لئے جبری تعلیم کا انتظام کرے یہاں تک کہ وہ چودہ سال کی عمر کو پہنچ جائیں۔

دلچسپی سے خالی نہ ھوگا اگر ھم مختلف ریاستوں کی مقننہ جماعتوں اور پارلیمنٹ کی قانون سازی پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کس حد تک اس قانون سازی نے ان راہ نما اصول کے اثر کو قبول کیا ھے۔ ایک غیر جانب دار ناظر اس نتیجہ تک ضرور پہنچے گا کہ دستور کے نفاذ کے بعد جو چند سال گزرے ھیں ان میں ھندوستان نے ان ھدایتوں پر جو واضعان دستور نے مجالس مقننہ کے سامنے پیش کئے تھے عمل کرنے کی کامیاب کوشش کی ھے۔

ھمارے دستور کا ایک اھم پہلو یہ ھے کہ وہ ایک غیر دینی مملکت کا قیام عمل میں لاتا ھے۔ ھماری مملکت کا کوئی خاص مذھب نہیں ھے اور تمام مذاھب کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ھوا، ضمیر کی آزادی ، پیشے کی آزادی ، مذھب پر عمل اور اس کی تبلیغ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ھے اور ھر عہدہ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ملت کے ھر فرد کے لئے کھلا ھوا ھے۔ احتیاط کی جاتی ھے کہ ملک میں کسی لسانی گروہ پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ ھندوستان ایسا ملک ھے جس میں مختلف مذاھب بھی ھیں اور متعدد زبانیں بھی ، اور بظاھر اس کے مختلف تمدنوں میں کثرت و اختلاف نظر آتا ھے تاھم یہ سب وحدت کے سنہرے تار میں ایک دوسرے سے وابستہ ھیں ۔ اس وحدت کے رابطہ کو قوی کرنے کے لئے واضعان دستور نے بہت ساری تدابیر سے کام لیا ھے۔

بالآخر کسی دستور کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ اس نے ملک کو اپنے مقصد کے حصول میں کس حد تک مدد کی۔ یہ صحیح ہے کہ گو دستور کو منصۂ وجود میں آکر آٹھ سال گزر چکے ہیں اس میں کافی تغیر ہو چکا ہے۔ لیکن دنیا کے ہر ادارہ کی طرح دستور بھی تجربہ ہی کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے۔ ایک طرف تو قوم کو اپنے دستور کا احترام کرنا چاہئیے اور دوسری طرف اگر دستور میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو ملک کو ایک فلاحی مملکت کا مقام حاصل کرنے میں مانع ہو رہی ہیں، تو پھر ان چیزوں کو ترک کرنا ہی پڑے گا۔ دستور کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو قوم کی فلاح و بہبودی اس سے زیادہ مقدس شی ہے اور اگر دستور میں کسی قسم کا تغیر کیا جاتا ہے تو اس کا اختیار قومی پارلیمنٹ ہی کو حاصل ہے جو بالغوں کی عام رائے دھندگی سے منتخب ہوتی ہے اور ہم یہ ماننے تیار نہیں کہ یہ پارلیمنٹ قوم کی رائے کی صحیح نمائندگی نہیں کرتی۔

اجتماعیات السنہ

از

اے - آر - واڈیا

بعض احباب کے ذہن میں جب یہ خیال پیدا ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اعزاز میں مقالات کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے اور اس کو ان کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں ان کی خدمت گرامی میں پیش کیا جائے تو یہ خطرہ کسی کے قلب میں نہیں گزرا تھا کہ موت کے ظالم ہاتھ سالگرہ کے اس تحفہ کو کتاب التذکرہ کی صورت میں مبدل کر دیں گے! احکام قضا کا تقاضا تھا کہ مولانا سیاسیات کے میدان میں قدم زن ہوں اور سیاسی قائد کی حیثیت سے زندگی میں امتیاز حاصل کریں، لیکن ان کے قلب کے رجحان پر نظر کی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ دراصل ایک عالم متبحر تھے، جنہیں تین زبانوں — اردو، فارسی اور عربی — پر کامل عبور حاصل تھا اور جنہیں مطالعۂ کتب اور عمیق دینی اور انسانی مسائل پر تصنیف و تالیف کے سوا کسی اور چیز میں اتنا لطف نہیں ملتا تھا - گو وہ انگریزی زبان میں گفتگو نہیں کیا کرتے تھے لیکن اس کو بخوبی سمجھ لیتے تھے اور ان سے زیادہ کوئی اور سیاسی رہنما انگریزی زبان کی اہمیت، اور ہندوستانی قومیت کو ابھارنے اور جذبۂ حب وطن کے بیدار کرنے میں اس نے جو تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے اس کی قدر وقیمت سے واقف نہ تھا - وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے وہ ہندوستان کی لسانی الجھن کو دور کرنے میں بہت کچھ مدد کر سکتے تھے، لیکن دستوری پابندیاں ان کی راہ میں حائل تھیں اور وہ اپنی محبوب آرزؤں کی تکمیل نہ کر سکے - اس پس منظر کی روشنی میں اب میں اس مقالہ کو ان کی یاد کے احترام میں ہندوستان کے لسانی مسئلہ کی بحث کے لئے

وقف کرتا ہوں ۔

زبان اپنی ترقی یافتہ شکل میں انسان کی ایک بے بہا ایجاد ھے ۔ شاید یہ اس کا ایک نہایت قیمتی اثاثہ ھے ، اور اسی لئے صحیح عمرانی نقطۂ نگاہ تو یہ ھوگا کہ اس کو انسان کا خادم تصور کیا جائے نہ کہ مخدوم ۔ اس کا ارتقا بھی تدریجی طور پر ھوتا ھے اور کسی زبان کا یہ دعوی نہیں ھوسکتا کہ وہ اپنی روز پیدایش ھی سے کامل و مکمل ھے ۔ زبان کے ارتقا سے انسان کی ترقی کا تعین ھوتا ھے اور تہذیب انسانی کے ارتقا کے ساتھ زبانیں بھی ترقی کرتی ھیں ، رو بزوال ھوتی ھیں اور فنا بھی ھو جاتی ھیں ، لیکن اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتی ھیں ۔ اس سارے عمل کا انکشاف لسانیات کا شاید سب سے زیادہ دلفریب کام ھے ۔ سنسکرت کی مثال لو ۔ اس کے حروف تہجی تقریبا کامل ھیں ، اس کی صرف و نحو واضح اور متعین ، اس کے الفاظ کی شوکت اور زیادہ مسحور کن ، اس کے ادب کا مقابلہ بہت کم زبانیں کرسکتی ھیں ، اس پر تفوق تو شاید کسی کو حاصل نہیں ھوا ۔ ویدوں کی زبان ھونے کی وجہ سے اس کو الہی زبان سمجھ کر اس کا احترام کیا جاتا ھے ۔ لیکن ان تمام صفات کی حامل ھونے کے باوجود اس میں تغیرات ضرور ھوئے ھیں جن سے ھندوستانی تمدن کے ارتقا کا پتہ چلتا ھے ۔ علماء کے لئے ویدی سنسکرت کا ارتقا کلاسیکل سنسکرت میں ھوا اور پراکرت بن کر وہ عوام کی زبان ٹھیری ۔ پالی اس کی سب سے زیادہ معروف شکل ھے اور جب مہاتما بدھ نے اپنا پیغام پہنچانا چاھا تو انہوں نے ویدی یا کلاسیکل سنسکرت کو اپنا آلہ نہیں بنایا بلکہ پالی کو بنایا جو عوام کے بول چال کی زبان تھی ۔ بدھ کے زمانہ ھی میں سنسکرت ایک مردہ زبان تھی ، مردہ اس معنی میں نہیں کہ وہ بھلائی جاچکی تھی بلکہ اس معنی میں کہ عام استعمال میں نہ تھی ۔ یہ عوام کی پہنچ سے باھر تھی ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بے کار ھو گئی تھی ۔

وہ علماء کی زبان رہی اور ہندو تمدن کے لئے رشتۂ وحدت کا کام دیتی رہی - یہ وہ زبان تھی جس کو ملایا کے شنکر آچاریہ نے ہندوستان کے شمال اور مشرق و مغرب میں رہنے والے باشندوں تک تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کو پہنچانے کے لئے استعمال کیا اور تامل کے رامج آچاریہ نے اپنی ویشنو مارگ کی تبلیغ کے لئے اسی کو بہترین آلہ پایا ، اور یہی خیال مدھو آچاریہ کا بھی تھا - اب بھی جب شمالی یا جنوبی ہندوستان میں پنڈت فلسفیانہ محفلوں یا مذہبی جلسوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو یہی زبان استعمال کرتے ہیں - یہ اب بھی ہندو تمدن کے لئے باعث فخر ہے کیوں کہ یہی پورے ہندو تمدن کا مرکز ہے - تاہم یہ اب زندہ اور متحرک زبان نہیں رہی - سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں مشرقی ہندوستان میں ۵۰۹ ، اور مغربی ہندوستان میں ۲۸ ، اور وسطی ہندوستان میں ۱۸ نے سنسکرت کو اپنی مادری زبان بتایا - ممکن ہے کہ لاکھوں آدمی اس کو نظری طور پر تو جانتے ہوں - اب جب کہ زبان کا مسئلہ ہندوستان میں اس قدر خوفناک نظر آرہا ہے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنادیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں ، سنسکرت ہندوستانی پارلیمنٹ یا عوام کی زبان ہرگز نہیں بن سکتی- اسرائیل کی جمہوریت کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ ایک مردہ زبان کا احیاء ہوسکتا ہے - لیکن یہودی تعداد میں کم ہیں ، اور ان کے مذہبی و سیاسی جوش اور سرگرمی نے عبرانی زبان کو پھر سے زندہ کردیا ہے - لیکن ہندوستان میں جہاں کروروں لوگ بستے ہیں ، اور جہاں مذہب ، تمدن اور زبانوں کی اتنی کثرت ہے سنسکرت کے احیاء کی کوشش ممکن نہیں - صدیوں سے سنسکرت نے ملک کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے ، اسی کے مخزن سے تمام ہندوستانی زبانوں نے اپنے الفاظ کا ذخیرہ حاصل کیا ہے - یہ بات نہ صرف سنسکرتی زبانوں

جیسے ہندی ، بنگالی ، مرہٹی اور گجراتی کے متعلق صحیح ہے بلکہ تلنگی ، کنڑی اور مرہٹی زبانوں کے متعلق بھی اتنی ہی صحیح ہے ۔ ان دنوں بہت ہی کم ہندوستانی مصنف سنسکرت زبان میں لکھتے ہیں ، لیکن یہ مشتبہ امر ہے کہ ان کی سنسکرت بحیثیت ادب باقی بھی رہے گی ۔ یہ ایک عمل بدیع ہے جو قابل تحسین تو ہے لیکن اس سے ہمارا قلب متأثر نہیں ہوتا ۔

اوستا کی تاریخ میں بھی اسی قسم کا ارتقا ہوا ہے ۔ وہ نہ صرف ایک مردہ زبان تھی بلکہ فراموش کردہ زبان بھی تھی ، یعنی لوگ اس کے معنی بھول چکے تھے ، آنکیوٹل دوپراں نے اس کا تعلق سنسکرت زبان سے ثابت کیا اور اوستا کو زیادہ تر سنسکرت ہی کے ذریعہ سمجھا گیا ۔ اوستا کا پہلوی ، قدیم فارسی اور جدید فارسی میں ارتقاء زبان کے نشو و نما کے عام رجحان کو ظاہر کرتا ہے ۔

لاطینی زبان کی تاریخ بھی زبان کے ارتقا پر کافی روشنی ڈالتی ہے ۔ اہل روما کی زبان ہونے کی حیثیت سے اس نے رومی فوج کی فتوحات کے ساتھ ساتھ قدم اٹھایا ۔ اس کے لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ روما کی عظیم سلطنت کے اطراف کے رقبوں میں جو زبانیں بولی جاتی تھیں ان کی جگہ لے لے ، گو یہ زبانیں کتنی ہی خام اور غیر ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں ۔ لیکن ان زبانوں میں لاطینی الفاظ داخل ہونے لگے اور نئی زبانیں (جیسے فرانسیسی ، ہسپانوی اور ولندیزی) عرصۂ ظہور میں آنے لگیں ۔ اپنی ہی سرزمین میں اس نے اطالوی زبان کو جنم دیا ۔ لیکن صدیوں تک یورپ میں علماء کی زبان لاطینی ہی رہی ۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ مختلف علاقوں میں ربط و اتصال کے ذرائع بہت ہی کم تھے متعدد و مختلف زبانوں کا وجود ہی باہمی اختلاط کے امکان کی نفی کرتا تھا ۔ لاطینی زبان ان علاقوں کے متحد کرنے میں مفید ثابت ہوئی اور یورپ کے علم و شعور کے اظہار کا آلہ بن گئی ۔ یورپ کے مختلف ممالک کے مصنفین کا یہ دستور ہو گیا

که لاطینی زبان میں اپنے معلومات کا اظہار کریں تاکہ پڑھنے والوں کی ایک کثیر تعداد ان سے استفادہ کرسکے۔ لارڈ بیکن جیسا عظیم المرتبت مصنف، جس کا انگریزی ادب کی تاریخ میں ایک لافانی مقام ہے، لاطینی زبان میں لکھنے کا مخالف نہ تھا۔اس نے اپنے "مقالات" (Essays) اپنے ملک کے باشندوں کے افادہ کے لئے انگریزی زبان میں لکھے تاھم فلسفی ہونے کی حیثیت سے اس نے اپنی دو کتابیں یعنی "Novum Organum" اور "De Augmentis Scientiarum" لاطینی زبان میں لکھنے زیادہ بہتر سمجھا اور اپنے اس فعل کو یہ کہہ کر حق بجانب ثابت کیا کہ "میں چند ایسی فلسفیانہ کتابیں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو ساری دنیا میں اور خصوصاً یورپ کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پڑھی جائیں گی، لیکن اگر میں انہیں انگریزی زبان میں لکھوں تو ان کو بہت کم لوگ سمجھ سکیں گے، اسی لئے میں انہیں لاطینی زبان میں لکھ رہا ہوں"۔ بیکن کے لئے انگریزی صرف ایک مقامی زبان تھی۔ انگریزی ادب میں ملٹن کی کتاب "فردوس گم گشتہ" (Paradise Lost) ایک عظیم الشان رزمیہ سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ خود ملٹن مضطرب تھا کہ آیا یہ نظم لاطینی میں لکھی جائے یا انگریزی میں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ اگر وہ اس کو لاطینی زبان میں لکھتا تو کیا وہ ورجل اور ھوریس کا ہم پلہ تصور کیا جاتا۔ لیکن انگریزی میں لکھ کر اس نے انگریزوں کے دل میں ایک بے مثال سا مقام پیدا کرلیا۔ اس کا وافر ثبوت نہ صرف اس رزمیہ نظم سے ملتا ہے بلکہ اس کی Lycidas سے بھی فراھم ہوتا ہے جو انگریزی زبان میں ایک لاجواب مرثیہ ہے۔ اس کی دوسری نظم "Epitaphium Damonis" جو اس کے سب سے زیادہ عزیز دوست چارلس ڈیوڈاٹی کی موت کے غم میں لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی جب شائع ہوئی تو اس کی بس اتنی تعریف کی گئی کہ "کسی انگریز نے اس سے زیادہ صحیح اور اس سے زیادہ خوبصورت لاطینی نظم

نہیں لکھی " ۔ لاطینی زبان میں اس کے لکھے ہوئے سیاسی رسالے اب شاید ہی پڑھے جاتے ہوں لیکن اس کی "Areopagitica ۔ ۱ " ۔ پر شوکت انگریزی میں لکھی ہوئی ـــ کلاسک سمجھی جاتی ہے !

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ چار صدی قبل اٹلی میں ڈانٹے کو بھی وہی مشکل پیش آئی جس سے ملٹن کو سابقہ پڑا تھا آیا وہ اپنی " Divina Comedia " لاطینی میں لکھے یا اطالوی میں ۔ اس نے اپنے فلسفیانہ شہ کار De Monarchia لاطینی زبان میں لکھا تھا لیکن جب اس نے ایک عظیم الشان نظم لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کے قلب میں اضطراب پیدا ہوا اور بالآخر اس نے اس کو اطالوی زبان میں لکھا اور اس طرح اطالوی ادب کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کردیا ۔ اطالوی زبان تو اس کی زبان تھی جس میں وہ گفتگو کرتا تھا اور جس سے اس کو محبت تھی مگر لاطینی زبان میں مطالعہ نیم شبی کا خمار تھا اور بس ! فلسفہ کی ایک نہایت عظیم الشان تصنیف یعنی اسپنوزا کی "کتاب الأخلاق" (Ethica) لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی کیوں کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہسپانوی زبان فلسفیانہ افکار کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی !

سترھویں صدی تک لاطینی زبان یورپ کے تمدن کی وحدت کا ایک نشان سمجھی جاتی رہی ۔ اب بھی اس کو رومن کیتھولک کنیسہ کے مذہبی رسوم میں اور کسی حد تک کلیسائے انگلستان کی طرح قومی کلیساؤں میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے ۔ یورپ کی جامعات کے رسمی کاموں میں یہ اب بھی استعمال کی جاتی ہے ۔ اسناد لاطینی زبان ہی میں دی جاتی ہیں ۔ رومن کیتھولک کلیسا کے پادری اپنے تعلیمی اداروں میں لاطینی زبان ہی کو بول چال اور تعلیم کا ذریعہ قرار دیتے ہیں تاکہ مختلف مادری زبان والے طلباء کی تعلیم کا مسئلہ حل ہوجائے ۔ حیاتیات کی اصطلاح میں یہی چند بقایا ہیں لیکن دوسرے تمام اعتبارات سے

(۱) ملٹن کی لکھی ہوئی ایک تقریر ہے جو سنہ ۱٦٤٤ء میں شائع ہوئی ۔ مترجم.

لاطینی زبان ایک مردہ زبان ھے تاھم وہ تمام یورپی زبانوں کو اپنے الفاظ سے اور قدیم یونانی زبان کے اصطلاحات سے مالا مال کرتی رھی ھے اور آئندہ بھی کرتی رھے گی۔

واقعات کے اس مختصر جائزہ سے ممکن ھے کہ ھندوستان کے لسانی مسائل پر کچھ روشنی پڑے۔ ھندوستانی زبانوں کی تاریخ ھندوستان کی سیاسی تاریخ کی آئینہ دار ھے۔ ھندوؤں کے ھندوستان میں مسلمانوں کے ورود سے پہلے تک سنسکرت ھی کو غلبہ رھا گو عوام نے اپنی دیسی زبانوں کو ترق دے لی تھی اور اپنی روز مرہ ضروریات کی تکمیل کے لئے انہیں استعمال کر رھے تھے۔ ھندوستان پر مسلمانوں کے تسلط سے ھمیں ایک اور مثال اس کلی عمرانی قانون کی ملتی ھے کہ جب ایک ملک پر دوسرے ملک کا تسلط ھوتا ھے تو فاتحین کی زبان آھستہ آھستہ مفتوحین کی زبان میں نفوذ کرتی جاتی ھے اور بالآخر یہی ملک کی غالب زبان بن جاتی ھے۔ یہی حال لاطینی زبان کا تھا جو رومی سلطنت کی زبان تھی، اس نے رفتہ رفتہ مفتوحہ ممالک کی زبانوں کو متأثر کیا اور ان میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ اسی طرح مسلمان ھندوستان میں اپنے ساتھ فارسی زبان لے آئے جو خود بھی عربی زبان سے اس وقت بہت متأثر ھوی تھی جب عربوں نے ایران کو فتح کر لیا تھا۔ فارسی زبان کے حسن و موسیقی نے ھنود کو اس کا گرویدہ کر دیا اور ھندو پنڈتوں نے اس کو سیکھنے بلکہ اس میں لکھنے میں بھی زیادہ تاخیر نہیں کی۔ ھندی اور بنگالی نے اپنے اندر ھزاروں فارسی الفاظ جذب کر لئے، اور گجراتی نے بھی یہی کیا کیوں کہ گجرات اور ایران میں تجارتی تعلقات نہایت قوی تھے۔ تاھم ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس ھوئی اور اس طرح اردو زبان نے جنم لیا۔ اردو کے لغوی معنی لشکر کی بولی کے ھیں کیوں کہ اس کو مغل فوج کے سپاھیوں نے جنم دیا تھا۔

اردو کی اصل ساخت تو ھندی ھے اور اس کے اساسی الفاظ بھی

ہندی ہیں لیکن اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور اس طرح اس کا ایک خاص مزاج بن گیا اور وہ ایک خاص زبان ہو گئی۔ لیکن یہ امتیاز زیادہ تر اس کی تحریر میں دکھائی دیتا ہے نہ کہ تقریر میں۔ بول چال کی زبان کے اعتبار سے یہ بتلانا مشکل ہوتا ہے کہ ہندی کہاں شروع ہوتی ہے اور اردو کہاں ختم، لیکن مصنفین نے ان کو سنسکرت یا فارسی اور عربی کے زیادہ الفاظ شامل کر کے ان کو دو مختلف زبانیں بنا دیا ہے۔ گو ہندی اور اردو کا ارتقاء دو مختلف زبانوں کی حیثیت سے ہوا ہے اور ان کا رسم الخط بھی مختلف ہے لیکن ان کو بالکلیہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ متحد کر دینا بھی غلطی ہے۔ جس عمرانی قانون کی حکمرانی زبانوں پر ہے اس کی رو سے اردو نے مسلمانوں کے دور حکومت میں کافی ترقی کی لیکن وہ محض مسلمانوں کی تخلیق نہیں۔ بے شمار ہندوؤں نے اردو کی دولت میں اضافہ کیا، اور وہ ہندوؤں کی بھی اسی طرح مادری زبان بن گئی جس طرح کہ مسلمانوں کی۔ گزشتہ بیس سال سے سیاسیات میں ہندو مسلم اختلاف نے زبانوں پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے اور متعصب ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کر دیا ہے اور بعض ہندو مصنفین کی یہ مسلسل کوشش رہی ہے کہ عربی یا فارسی الفاظ کو بالکل استعمال نہ کریں۔ اس کا ایک مذموم امر ہونا یوں بھی نظر آتا ہے کہ جنوبی ہند کے متعدد مصنفین نے اپنے ڈراویڈی تعصب سے کام لے کر سنسکرت مادہ کے الفاظ کو قصداً ترک کر دیا۔ اس قسم کی کوئی کوشش ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی کیوں کہ زبانیں اپنی ارتقاء میں استعمال اور سہولت کے فطری قوانین کی پابند ہوتی ہیں اور سیاسی تعصبات ان کی نشو و نما میں حارج نہیں ہو سکتے۔ مولانا آزاد اردو کے کامل استاد ہونے کی حیثیت سے ہندی اور اردو کے اس روز افزوں افتراق پر اپنے قلق و اضطراب کو پوشیدہ نہ رکھ سکے اور اس کو دور کرنے میں خوش قسمتی سے ان کی تائید بہت سارے ممتاز ہندوؤں نے بھی کی

جن میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شامل ہیں ۔ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوسکتی ہے جیسا کہ ہندی ہندوستان کی سرکاری زبان بننے کی خواہش مند ہے لیکن اردو کی خالص ہندوستانی اصل و بدایت کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور ہندوستانی دستور نے اس کے ایک قومی زبان ہونے کو تسلیم کرلیا ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جن سیاسی جذبات نے تقسیم سے قبل ہندوستان کے امن کو غارت کردیا تھا انہیں اب اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ ہندی اور اردو کے ہموار اور پر سکون ارتقاء کی راہ میں حائل ہوں!

زبانوں کے عمرانی قانون کی توضیح ہندوستان کی تمدنی زندگی میں انگریزی کے ظہور سے بھی ہوتی ہے توقع کی جاسکتی تھی کہ انگریز ابتداء ہی میں اپنی زبان کو مفتوح ہندوستانیوں کے سر تھوپ دیں گے ۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ وارن ہیسٹنگس اور اس نسل کے انگریزی عہدہ داروں نے انگریزی کو نظام تعلیم میں رائج کرنے کی حمایت نہیں کی ، انہوں نے سنسکرت ، عربی اور فارسی کی سرپرستی کی جس حد تک ان سے ہوسکی ۔ یہ راجا رام موہن رائے کی فراست کا کرشمہ ہے جنہوں نے وجدانی طور پر یہ محسوس کرلیا کہ انگریزی زبان کے ذریعہ ہندوستان کے خوابیدہ عوام کو جگایا جا سکتا ہے اور ان میں جوش عمل پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ گو وہ خود پنڈت بھی تھے اور منشی بھی لیکن ان ہی کی پر جوش حمایت نے تمام مخالفتوں کا زور توڑ دیا تھا اور اس نئی انقلابی حکمت عملی سے لارڈ میکالے نے بھی اتفاق کرلیا جو بالآخر ہندوستان کی سیاسی آزادی کا باعث ہوئی ۔ شاید وارن ہیسٹنگس اور اس کے ہم خیال افراد نے جبلی طور پر یہ محسوس کرلیا تھا کہ انگریزی تعلیم سے مغربی علوم اور مغربی تمدن کے دروازے کھل جائیں گے اور ہندوستانیوں کے قلوب میں آزادی کا جذبہ پیدا ہوجائے گا اور اس طرح ہندوستان پر برطانیہ کے تسلط یا قہرمانی کا دوام بالکل ناممکن

ہو جائے گا خود میکالے اس بارے میں کسی التباس میں مبتلا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگریزی زبان میں تعلیم بالآخر ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کو ختم کردے گی۔ لیکن ایک سچے انگریز کی طرح جس کے قلب میں حریت کی محبت جاگزیں تھی وہ مستقبل سے خوف زدہ نہیں تھا اور اس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کا دن برطانیہ کی تاریخ میں فخر و مباہات کا دن ہوگا۔ دوسرے انگریزوں کا بھی یہی احساس تھا۔ بمبئی میں لارڈ انفسٹون اور مدراس میں ٹامس منرو سمجھتے تھے کہ ان کی حیثیت محض اس امین کی سی ہے جس کا کام ہندوستان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا اور غیر ملکی تسلط سے اس کو آزاد کرنا ہے۔ پھر ایک انگریز –– ایلن آکٹیوین ہیوم –– ہی کے ذہن میں ہندوستانی قومی کانگرس کی تشکیل کا تصور پیدا ہوا جو ساٹھ سال کے اندر اندر ہندوستان کو آزاد کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی موت کے مختلف اسباب ہیں، لیکن سب سے زیادہ قوی اور صریح سبب خود انگریزی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی تمام جامعات کا ذریعہ تعلیم رہی اور اس طرح اس نے ہندوستان کے تمام روشن خیال طبقہ کے لئے ایک مشترک زبان فراہم کی۔ یہ تمام سیاسی تمناؤں کی زبان بن گئی اور ہندوستانی قومی کانگرس کو اس قابل بنایا کہ ہندوستانیوں کی قسمت کو بدل دے! اس کے جاننے والے چند ہی ہندوستانی ہوسکتے ہیں لیکن ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر ان ہی چند کا اثر ہے۔ ان ہی کے توسط سے ہندوستان ہر قسم کے بین قومی اجتماعات میں حصہ لے سکتا ہے۔

ہندوستان کی جدید سیاسی تنظیم میں یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کا مستقبل میں کیا مقام ہوگا۔ اہل سیاست کا عام رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی دوسری ہندوستانی زبان کو دی جائے۔ ہمارے مدرسوں میں تو ایسا کیا ہی

جا رہا ہے ۔ لیکن جامعات کا سوال دوسرا ہے ۔ جامعات کے ارباب حل وعقد انگریزی زبان کو ترک کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ کسی ہندوستانی زبان میں وہ کتابیں نہیں ملتیں جن میں جامعات میں پڑھائے جانے والے مختلف مضامین کی تعلیم دی جاسکے ۔ ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے ، کیوں کہ یہ ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے ، لیکن سنسکرت الفاظ کے ورثہ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو جنوبی ہند کے باشندے ہندی کو ایک اجنبی زبان سمجھتے ہیں اور جنوبی ہند کے عوام ہندی سے ناواقف ہیں ۔ حال میں دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی کوششوں سے جنوبی ہند کے ہزاروں شہری ہندی زبان سیکھ رہے ہیں ۔ تاہم روایتی صوبہ واری رقابتوں نے یہ بدگمانی اور خوف پیدا کر دیا ہے کہ ہندی کا تسلط جنوب پر شمال کا تسلط ہے ۔ اس کی وجہ سے ایک نیا نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ "انگریزی ہمیشہ ، ہندی کبھی نہیں" آج ہندوستان کو ایک خوفناک لسانی مسئلہ کا مقابلہ کرنا ہے اس مسئلہ کی اگر تحلیل کی جائے تو اس کے مندرجہ نمایاں خصوصیات نظر آتے ہیں :

(۱) انگریزی زبان اتنی اجنبی زبان ہے کہ اس کو تمام ہندوستانی ہرگز نہیں سیکھ سکتے ۔ وہ صرف خواص کی زبان ہوسکتی ہے نہ کہ عوام کی ۔

(۲) انگریزی نے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب پر ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ تمام تعلیمی اقدار و معیارات کو منقلب کئے بغیر اس کو ترک نہیں کیا جاسکتا ۔

(۳) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ چند سال بعد انگریزی کی جگہ کسی اور زبان کو دی جاسکے گی پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس کی جگہ کس کو دی جائے گی ؟ ہندی کو یا علاقائی زبانوں کو ؟

اگر ہندوستان کی سیاسی وحدت کو قائم رکھنا ہے تو پھر

ایک مشترک زبان کا ہونا ضروری ہے اور وہ یا تو انگریزی ہوسکتی ہے یا ہندی ۔ اگر انگریزی زبان کے متعلق یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عوام کی زبان بن جائے گی تاہم اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ روشن خیال طبقہ میں اتحاد پیدا کرنے والی زبان تو بن سکتی ہے ۔ جامعات میں علاقائی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے تو ہندوستان کی سیاسی و تمدنی وحدت کو سخت ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اس سے انگریزی زبان کی ساری فتوحات کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ لسانی مسئلہ میں زیادہ پیچیدگی یوں بھی پیدا ہوگئی ہے کہ کسی ریاست میں لسانی گروہوں میں کامل تجانس نہیں پایا جاتا ۔ اقلیت کا سوال ہمیشہ باقی رہے گا ۔

ان پیچیدگیوں کی وجہ سے بہتر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالت کو بدستور باقی رکھا جائے ۔ قانون عمرانی کا عمل ہندی کی موافقت میں ہوگا اگر ناراض ریاستوں پر اس کو قبل از وقت مسلط نہ کیا جائے ۔ وقت خود ایک ایسی زبان کی تعمیر کرے گا جو جامعات کی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے گی اور انگریزی سے اس زبان میں بتدریج دخول ہو سکے گا ۔ مادری زبان کے تصور میں زیادہ مبالغہ سے کام لیا جاسکتا ہے ۔ امریکہ میں کروروں حبشی انگریزی کو اپنی مادری زبان سمجھنے لگے ہیں ، یہی حال یورپ کے ان مختلف ہم قوم افراد کا ہے جنہوں نے امریکہ کو اپنا نیا وطن بنا لیا ہے ۔ زبان نئے تصورات اور نئی وفاداریاں پیدا کرنے کا ایک نہایت قوی آلہ ہے جن کا مرور زمان متقاضی ہے ۔ انسان دوستی کے اس وسیع نقطہ نظر ہی سے لسانی مسئلہ کا حل دریافت ہو سکتا ہے ۔ سیاسی جذباتیت اور مفادات حاصلہ ایک سیدھے سادھے مسئلہ کو تاریک کر دیتے ہیں اور اس کے صحیح حل میں روڑے اٹکاتے ہیں ۔

لسانی مسئلہ کے متعلق سیاسی اور تعلیمی نقطہ نظر جو اختیار کیا جاتا ہے اس کے فضاء کو تصورات کے اس تصادم سے ظاہر کیا جاسکتا ہے جو مہاتما گاندھی اور مہارشی کاروے میں نظر آتا ہے ۔

سالہا سال قبل جب ڈاکٹر کاروے (جو خوش قسمتی سے سو سال کی عمر تک پہنچ کر بھی ہم میں موجود ہیں) عورتوں کے لئے ایک جامعہ کے قیام کی کوشش کر رہے تھے اور جس کا ذریعۂ تعلیم وہ کسی ہندوستانی زبان کو بنانا چاہتے تھے مہاتما گاندھی ہنجنسے دیکھنے گئے جو ڈاکٹر کاروے کی مساعی کا مرکز تھا۔ ماہر تعلیمات ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر کاروے انگریزی کی اہمیت سے خوب واقف تھے اور اس لئے انہوں نے عورتوں کی جامعہ میں بھی انگریزی کو ایک لازمی مضمون قرار دیا تھا۔ گاندھی جی نے اعتراضا کہا کہ "اگر آپ انگریزی کو لازمی قرار دیتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتا" ڈاکٹر کاروے نے مناسب وقت ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جرأت سے جواب دیا: "اس صورت میں ہمیں آپ کی تائید کے بغیر ہی اپنا کام جاری رکھنا ہوگا" یہ ایک نہایت صحیح طریقۂ کار ہے، کیوں کہ انگریزی صرف انگلستان کے رہنے والوں ہی کی زبان نہیں ہے۔ وہ اب دنیا کی زبان ہو چکی ہے، اس سے ہمارے سیاسی جذبات کا متأثر ہونا صحیح نہیں، خصوصاً جب ہم اس تاریخی واقعہ کو پیش نظر رکھیں کہ ہمارے جذبۂ حب وطن کی پرورش انگریزی زبان ہی کے گہوارہ میں ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کا سیکھتے رہنا ہمارے لئے ایک ضرورت ہے، تعیش نہیں کہ اس کو ہم جب چاہیں ترک کردیں۔ یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن میں بھی تھی جو انگریزی کو کوئی بوجھل شیء تو نہیں قرار دیتے تھے لیکن ان حدود سے اچھی طرح واقف تھے جن میں رہ کر ہی سیاسی جذبات کو کام کرنا چاہئے اور اس سے ایک قدم بھی آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

هندوستان اور مغرب

از

تارا چند

۲۳ جون سنہ ۱۷۵۷ء کے دن ایک چھوٹی سی فوج ، جو ایک ہزار بائیس یورپی سپاہیوں ، توپچیوں اور اکیس سو ایسے ہندوستانی سپاھیوں پر مشتمل تھی ، جن کی تربیت یورپی طرز پر کی گئی تھی ، اپنے سپہ سالار کلایو کی زیر قیادت پلاسی کے میدان میں ، جو بارش سے تربتر تھا ، صف باندھے کھڑی تھی - ان کے مقابل نوجوان ، متکبر ، تند و تیز لیکن بزدل سراج الدولہ ، نواب بنگال کے پچاس ہزار سپاھی تھے - دشمن کی متکبرانہ روش اور اس کے درخشاں ساز و سامان کو دیکھ کر متذبذب برطانوی سپہ سالار جنگ چھیڑنے پر کچھ زیادہ آمادہ نظر نہیں آتا تھا - تاہم دونوں فوجیں آپس میں الجھ پڑیں -

صبح میں تو وقفہ وقفہ سے گولہ اندازی ہوتی رہی جس میں دونوں فوجیں مشغول رھیں - لیکن جوں ھی دن ڈھلنے لگا نواب کی فوجیں اپنے پڑاؤ کی طرف پلٹنے لگیں - ھم عصر تاریخ نگار آرمے کا بیان ھے کہ کلایو اس وقت قیلولہ کر رہا تھا - اس کے نائب نے جرأت سے کام لے کر اپنی ذمہ داری پر فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا - ہندوستانی ساھیوں کو جنگ کی برداشت ھی نہ تھی کیوں کہ کلایو کے الفاظ میں ''دھوکے ، حیلے ، سازشیں ، سیاسیات اور خدا جانے کیا کیا''۔۔ ان سب نے مل کر جنگ شروع ھونے سے پہلے ھی اس کا فیصلہ کر دیا تھا - عہدہ داروں کی غداری ، اور واحد وفادار کپتان کی موت نے نواب کو سمجھا دیا کہ بڑی بہادری یہی ھے کہ آدمی اپنی جان بچائے - وہ فورا اپنی راجدھانی کی طرف بھاگا اور وھاں اپنے انجام کو پہنچا -

اس غم ناک واقعہ کو جو نہ فاتح کے لئے قابل تعریف قرار

دیا جا سکتا ھے نہ مفتوح کے لئے، تاریخ عالم میں "سب سے بڑی نکبت یا تنزل" سمجھا گیا ھے اور اسی اندوہ ناک حادثہ نے مشرق و مغرب کی طویل اور نشیب و فراز سے مملو تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ پلاسی کے میدان سے ایک نئی تہذیب کا آفتاب طلوع ھوا جو بحر ظلمات کی فضا پر چمکا اور جس کی چمک دمک نے ایشیا کے ستاروں کے نور کو بے رونق کر دیا!

ایک ایشیائی کے لئے یہ تباہ کن واقعہ گویا ایک للکار ھے! ھندوستان کی اندوہ ناک ناکامیابی اور انگلستان کی شہرۂ آفاق کامیابی کی توجیہ کرنی ضروری ھے۔ کیوں کہ پلاسی کی شکست محض فوجی شکست نہ تھی، یہ ایک پوری تہذیب کا خاتمہ تھا۔ فتح کا راز صرف فوجی تفوق ھی میں پوشیدہ نہ تھا، گو یہ صحیح ھے کہ برطانیہ کی چھ پونڈ والی توپوں نے سراج الدولہ کی چوبیس و تیس پونڈ والی توپوں سے زیادہ بہتر کام انجام دیا۔ کیا یہ شکست جرأت کے فقدان کا نتیجہ تھی؟ نہیں، ھندوستان کی فوجوں نے پلاسی کے بعد جنگ کے ھزاروں میدانوں میں اس بات کا کافی ثبوت پیش کیا ھے کہ وہ اس خاص صفت میں کسی سے کم نہیں!

کہا جا سکتا ھے کہ برطانیہ کی افواج کی تربیت زیادہ بہتر ھوئی تھی، لیکن داؤ پیچ تو سیکھے جا سکتے ھیں جیسا کہ مرھٹوں اور سکھوں نے بعد کی جنگوں میں ثابت کر دکھایا۔ لیکن جدید آلات کارزار اور جنگ کے جدید طریقوں کے خلاف کچھ کیا نہ جا سکا، اور پلاسی کے سو سال کے اندر اندر سارا ھندوستان برطانوی حکومت کے زیر نگیں ھو چکا تھا!

واقعہ یہ ھے کہ کلایو اور اس کے ایک ھزار یورپی سپاھی زندگی کے اس نئے طریقہ کی نمائندگی کر رھے تھے جس کو مغرب نے ھندوستان آنے سے چند صدی قبل ایجاد کیا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے

وسط میں یورپ اور خصوصا اس کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ جزء، برطانیہ، ایک متحرک اور قوت امتطاط رکھنے والے تمدن کا حامل تھا ـ گزشتہ پانچ سو سال کے دوران میں وہ کئی انقلابات سے گزر چکا تھا جو جاگیری نظام کی زنجیروں کو توڑکر فرد اور جماعت کو آزاد کرچکے تھے ـ ان انقلابات میں سے پہلا تو انگریزی قصبوں اور فرانسیسی تعلقوں کا معاشی انقلاب تھا، جس نے تجارت اور صنعت کو ترقی دی، سرمایہ اندوزی کی حمایت کی اور متوسط طبقہ کو پیدا کیا جو بعد کے تمام معاشی، اجتماعی اور سیاسی تغیرات کا اصل سبب بنا ـ

اس طبقے کے گھروں میں اور پہلے ایطالیہ اور پھر دوسرے یورپی ممالک کے شہروں میں روح کی بیداری کا عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا، اس نے ذہن کو اقتدار کی ساری زنجیروں سے نجات بخشی، فطرت کے نا معلوم دائروں اور روح کے باطنی گوشوں کو نظر کے سامنے پیش کردیا ـ انسان کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ھوا ـ اس نے اقتدار کا مرکز اپنی ذات کو پایا، غیر کا محتاج نہ رھا، اپنی ذات پر اس کو ایقان پیدا ھوا، اور اس طرح حریت کے جذبہ کے ساتھ اس نے دنیا کی تسخیر کے لئے قدم اٹھایا ـ اس نے بحر و بر کو عبور کیا ـ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ مفلس ھے تو اس کو کیا خوف، کائنات کے خزانے اس کے سامنے کھلے پڑے ھیں، اس کو غذا کی قلت ھے تو کیا فکر، سرسبز و شاداب اراضی کے غیر محدود رقبے اس کو پکار رھے ھیں کہ قدم بڑھاؤ اور ھمیں کام میں لاؤ! اگر آبادی زیادہ گنجان ھوگئی تھی تو قدیم یورپ نے ھر فرد کے لئے چوبیس ایکڑ کا پیشکش کیا، اور جدید یورپ نے چار پانچ حصہ اور زیادہ بڑے خالی رقبے عطا کئے ـ حساب لگایا گیا ھے کہ سولھویں صدی کی عظیم الشان انکشافات سے پہلے یورپ کی آبادی ایک سو ملین نفوس تھی اور

ان کے قبضے میں تین ملین سات سو پچاس مربع میل اراضی تھیں ۔ زر و سیم کی ممکن الحصول مقدار دو سو ملین ڈالر تھی ۔ جب پلاسی کی جنگ ہوئی تو اس وقت آبادی میں پچاس فیصدی سے زیادہ اضافہ ہوچکا تھا، اور زمین کا رقبہ چھ گنا زیادہ ہوگیا تھا، ساتھ ھی قیمتی دھاتوں کا ذخیرہ دو ہزار فیصد بڑھ گیا تھا ۔ تجارتی مال و اشیاء کی دولت میں کتنا اضافہ ھوا تھا اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا ۔

جو ھوائیں یورپ کے جہازوں کو بحر اوقیانوس میں سبک حرکت کے ساتھ لے جا رھی اور لا رھی تھیں ان ھی نے اس کے تجارتی کاروبار میں بھی گرم بازاری پیدا کردی تھیں ۔ ان ھی سے اور جذبات بھی بیدار ھو گئے، مثلاً خود اعتمادی، حاضر دماغی، سنگدلی، تقلید و اقتدار سے معاندت و نفرت ۔

نشأۃ ثانیہ اور عہد اکتشاف کے بعد ھی عہد اصلاح کا فیض شروع ھوا ۔ رومن کیتھولک کلیسا نے اپنے کلی روحانی اقتدار کا جو عقیدہ یورپ کے عیسائیوں کے قلوب میں پیدا کرنا چاھا تھا اپنے تضمنات کے لحاظ سے نوخیز ذھنوں کے لئے سخت نا گوار ثابت ھوا ۔ مفاد اور اصول، سیاسیات اور اعتقاد دونوں کا تقاضا تھا کہ پوپ کے اقتدار کو تسلیم نہ کیا جائے اور نظام کلیسا کے بیرونی تصرف سے نجات حاصل کی جائے ۔ ضمناً اس تحریک نے سرمایہ داری اور انفرادیت کو بھی پروان چڑھایا ۔

اس کے بعد انگلستان میں سنہ ۱٦۸۸ء کا عظیم انقلاب آیا ۔ یہ ان واقعات کے سلسلہ کی ایک اھم کڑی تھا جس نے انگلستان کے سیاسی نظام کی ھیئت بدل دی ۔ اس نے پارلیمنٹ کو وہ مرکز قرار دیا جس کے اطراف قوم کی ساری زندگی گھومتی تھی ۔ ھابس کی پیمبرانہ بصیرت حق بجانب ثابت ھوئی، مملکت پر آسٹن کی تعریف صادق آنے لگی ۔ ھمہ تواں فرمانروا مملکت وجود میں آئی ۔ اقتدار اعلی کی حامل پارلیمنٹ تھی

اور پارلیمنٹ کا قیام متوسط طبقه سے تھا ـ تاجر زمین دار ہو گئے ، اور زمین دار مہم جو تاجروں کی اجاره دار کمپنی کے حصے دار بن گئے ـ پیورٹین انقلاب میں تہذیب کے جو بیج بوئے گئے تھے ان سے ایک تناور درخت اگا ، اس کے پھل آزادی ، خوش حالی ، قانونی کارروائی ، اور سب سے زیاده قومی شعور کی صورت میں نمایاں ہوئے ـ قومیت کا دور شروع ہوا ـ سنه ۱۷٤۰ء میں پہلا قومی ترانه ''برطانیه کا حکم موجوں پر چلتا ہے'' لکھا گیا ـ قوم کی آواز کروروں روزناموں میں ظاہر ہونے لگی ـ بولنگ بروک نے جذبۂ حب وطن پر تفصیل سے لکھا ـ ملٹن نے اپنی پر شکوه نثر میں ایک برگزیده قوم یعنی جدید انگلستان کی ولادت پر خوشی منائی جو اس کے الفاظ میں ''انبیاء ، اولیاء و حکماء کی قوم'' تھی !

ایک دوسرا انقلاب ، جس کے نتائج اور زیاده دوررس تھے ، آرہا تھا ـ جھتروئل ، ٹاونسنڈ ، رابرٹ بیک ول اس تحریک کے پہلے رہنما تھے جو بہت جلد صنعتی انقلاب کے زبردست دھارے میں جذب ہوجانے والی تھی ـ

اس عہد کے پیغام بر ، جس میں انسان اور فطرت ایک نئی شان میں نمایاں ہوئے تھے ، لاک ، نیوٹن ، ہیوم اور آدم اسمتھ تھے ـ انہوں نے اس دور کے معاشری اور سیاسی تغیرات کی تائید کی اور انگلیسی تمدن کی نظری بنیادوں کو استوار کیا ـ انہوں نے فکر کی صورت تشکیل دی ، عمل کے قوانین اور طریقے دریافت کئے ـ ان کے فلسفه میں انسان اور فطرت دو متقابل و مستقل جوہر ہیں ــ انسان ایک خاص مستقل و غیر محتاج ذی شعور جوہر ہے اور فطرت ذرات مادی کا ایک خارجی نظام ہے تجربه ان دونوں کو مربوط کرتا ہے ــ تجربه ایک انفرادی شیء ہے ، جو علم کی ایک ذہنی دنیا پیدا کرتا ہے اور تمام افراد انسانیه ایسا ہی کرتے ہیں ـ اس سے لازم آتا ہے که مساوات

وحریت کا خیال رکھا جائے ، مذہب کے معاملہ میں کوئی اکراہ یا جبر نہ ہو اور معاشرہ ، سیاسیات و اقتصادیات میں کم سے کم دباؤ یا جبر سے کام لیا جائے ۔ انسان ایک آزاد و مختار وجود ہے جو اپنی معاشری اور سیاسی عمارتوں کی خود تعمیر کرتا ہے ، اپنے قوانین خود آپ مدون کرتا ہے اور زمین اور آسمان کی چیزوں کے پیمانے خود مقرر کرتا ہے ۔

فطرت ایک ایسا نظام وحدت ہے جو خارجی مکان و زمان میں سرگرم عمل ہے ۔ وہ انسان کے شعور کی لوح سادہ پر اپنی تحریر نقش کرتا ہے ، انسان ان علامات کو پڑھتا ، اور ان کو ترکیب دیتا ہے اس طرح صور و اشکال ، رنگ و بو ، اور صوت و آہنگ کی کتاب مرتب ہوتی ہے ، فطرت تو واحد ہے لیکن یہ کتابیں تعداد میں اتنی ہی ہوتی ہیں جتنی کہ افراد انسانیہ کی کثرت ہے ۔

مغرب کی انقلاب زدہ تہذیب ہرقلتیوس کی اس دریا کے مانند ہے جس کے اندر کوئی شخص دو بار قدم نہیں رکھ سکتا ۔ تغیر اس کی ماہیت میں داخل ہے ۔ اس کی عقلی اساس وہ سیماب وش علم ہے جس کا ماقبل و مابعد ہمیشہ بدلتا رہتا ہے ۔ انیسٹائن نے کہا تھا کہ "مادی حقیقت کے متعلق ہمارے تعقلات کبھی قطعی نہیں ہو سکتے ۔" اس کا ان اشیاء میں انہماک جو محسوس و مشاہد ہیں ، اس کو ان چیزوں میں دلچسپی لینے نہیں دیتا جو غیر مشہود و سرمدی ہیں ۔ امریکہ کے کسی جدید مفکر نے کہا تھا کہ "ہم مغرب کے حکیمانہ ، فلسفیانہ اور مذہبی نظریات کو صحیح اس لئے نہیں سمجھتے کہ ہم ان کے ادعا کا براہ راست تجربہ یا مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ ہم مفروضہ کے طور پر ان کو صحیح سمجھ لیتے ہیں اور اس سے منطقی استنباط یا ریاضیاتی قیاس کے طور پر یہ لازم آتا ہے کہ واقعات تجربہ جو ہمیں براہ راست محسوس ہوتے ہیں وہی ہیں "جو وہ ہیں"۔

پلاسی کے آم کے درختوں کے جھنڈ میں جب کلایو اس دن

میدان جنگ کا جائزہ لے رہا تھا تو کیا اس نے یہ غیر شعوری طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ قضا و قدر کے اٹل احکام کی تکمیل کا محض ایک آلہ تھا؟ اس کے مقابل میں صف بستہ فوجیں تھیں جن کا نظارہ نگاہوں کو خیرہ کررہا تھا۔ ان صفوں کے پیچھے کیا چیز تھی؟ ایک تہذیب تھی جو تین ہزار سال قدیم تھی، جو دنیا کی بے ثباتی کا ماتم کررہی تھی۔ عظمت و جلال کے دن بھی اس نے دیکھے تھے، اندرونی خلفشار کی شام کا دھندلکا اور پھر ذلت و نکبت کی تاریک راتیں بھی اس پر گزری تھیں۔ حملہ آور آئے، ملک فتح کئے، سلطنتیں تعمیر کیں، امن قائم کیا، دولت کو جمع ہونے، فنون کو ترقی کرنے اور تمدن کو شائستہ ہونے کا موقع دیا۔ اجنبی اپنے بیرونی مذاہب اور غیر معروف طریقوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوے۔ ان میں سے اکثر ہندو معاشرہ میں منجذب ہوگئے جس کی حالت اسپنج کی سی ہے۔ اسلام نے اپنی دینی انفرادیت قائم رکھی، تاہم تمدنی اثرات نے اس کو بھی کافی متغیر کردیا۔ چنانچہ سلطنت مغلیہ کے بانی، بابر نے جب ہندوستانیوں (جن میں اس کے ہم مذہب بھی شامل ھیں) میں اور دوسرے ملک کے لوگوں میں اختلافات کی خلیج دیکھی تو حیران سا رہ گیا اور اس کو "ہندوستانی طریقے" سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوا۔

بابر کی مملکت نے ترقی کی، چار دانگ عالم میں اس کی شہرت ہوئی، ملٹن نے "ھرمز اور ھند کی دولت" کے گیت گائے۔ یورپ کے سیاح جب یہاں آئے تو انہوں نے دھلی اور آگرہ کو لندن اور پیرس پر فائق پایا۔ اکبر، جہانگیر، اور شاھجہاں نے ھندوستان کو منتہائے کمال تک پہنچادیا۔ پھر تقدیر نے حالات بدل دئے، اس عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ اٹھارھویں صدی میں یہ برباد ہوگئی۔ مرکزی اقتدار جس سے وحدت و نظم کا قیام تھا غائب ہوگیا اور ہندوستان مخالف امتضاد عناصر کا اکھاڑا بن گیا ھابس نے عہد فطرت کا

جو نقشہ کھینچا تھا اس کی ایک کامل مثال کے طور پر اس زمانہ کے ھندوستان کو پیش کیا جاسکتا ھے۔

سیاسی وفا شعاری کے فقدان سے بے اصول انانیت اور خود غرضی پیدا ھوئی ۔ سیاسی وحدت کی تباھی نے مملکت کو مفلس و قلاش کردیا اور معاشی اختلال رونما ھوا۔ ''مجھے اپنے کام سے کام اور جو پیچھے رہ جائے وہ جہنم میں جائے'' --- یہ تھا عام اصول عمل۔ لیکن یہ سیاسی تباھی کوئی انوکھی چیز نہ تھی ۔ اس سے قبل کئی مرتبہ نراج کی ایسی ھی حالت پیدا ھوچکی تھی ۔ لیکن اس کو ملک کے اندر ھی کسی قوت نے دفع کردیا تھا یا باھر سے آنے والے فاتح کے زبردست ھاتھوں نے اس کو ٹھیک کردیا تھا ۔ مگر قدیم عمارت کے کھنڈر پر جو نئی تعمیر کی گئی اس نے عمارت کا نقشہ نہیں بدلا ۔ نظام معاشرت اور تمدن ھر زمانہ میں وھی رھا ، اس میں کوئی انقلابی یا بنیادی تغیر نہیں ھوا ۔ ھندوستان پر برطانیہ کے تسلط کی یہ شکل نہیں تھی ۔ دو بنیادی طور پر مختلف تہذیبوں کا تصادم ایک بالکل ھی نیا تجربہ تھا اور اس سے فیصلہ کن نتائج پیدا ھوئے۔

برطانیہ کے تسلط سے قبل ھندوستان کی حالت کیا تھی اس کا پیش کرنا ذرا مشکل ھے ۔ سیاسی اصطلاحات کے استعمال سے غلط فہمی پیدا ھوتی ھے ۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں ھندوستان کا جو معاشرہ تھا یا مملکت تھی ان کی وہ صفات نہ تھیں جو ان الفاظ کے استعمال سے ذھن میں آتی ھیں ۔ مملکت ایک سیاسی نظام ھے جس کے تین شعبے ھیں -- مقننہ ، عدلیہ ، عاملہ ۔ ھندوستانی ریاست کا کام قانون سازی نہ تھا اور وہ مشکل ھی سے عدل گستری کا فریضہ انجام دیتی تھی ۔ قانون خدا کا نافذ کردہ تھا اور انسان کا ارادہ اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں کرسکتا تھا ۔ کتب مقدسہ -- ھندوؤں کی دھرم شاستر اور مسلمانوں کی شریعت -- میں تمام معاشری اور سیاسی ضروریات اور احتیاجات

کی تکمیل کے لئے دوامی احکام پیش کر دئے گئے تھے - فقہاء قانون کے قوائد و شرائط سے واقف تھے اور توجیہ و تاویل کے مسلمہ اصول کے مطابق ان کا انطباق ہر موقع پر کرسکتے تھے - کوئی دنیوی تنظیم ان قوانین میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتی تھی - نہ کسی پارلیمنٹ ھی کی ضرورت تھی اور نہ کسی جماعت مقننہ کی - قانون سازی مملکت کے اختیار سے باہر تھی -

شخصی مقدمات میں عدل مقدس قوانین کے مطابق کیا جاتا تھا اور یہ کام ذی علم پنڈتوں شاستریوں، مولویوں اور قاضیوں کا تھا - یہ خود ساختہ مستقل ماہرین قانون تھے جن کے فیصلے تمام قوم کے لئے قابل قبول تھے - حکومتیں خواہ انہیں تسلیم کریں یا نہ کریں، اراضی کی شکل میں انہیں انعام سے سرفراز کرے یا ان کی طرف مطلق توجہ نہ کرے - جرائم کی سزا زیادہ تر ان ھی علمائے دینیات کے اختیار میں تھی لیکن کسی سنگین معاملہ میں گاؤں کے عام لوگ اس کا فیصلہ کیا کرتے تھے - مملکت یا اس کے عمال کے خلاف جرموں کی سزا حاکم اپنی رائے کے مطابق دیا کرتا تھا - شرعی یا مذھبی حدود سے باہر قانون کی حکمرانی نہیں بلکہ شخصی رائے کی فرماں روائی تھی - شرعی حدود میں کسی دنیوی اقتدار کو مداخلت کرنے کی جرأت نہیں ھوتی تھی -

ھندو مذھب اور اسلام نے عاملہ کے فرائض بادشاہ کے سپرد کردئے تھے - محاصل اور فوج کے محکمے — کوسا، بالم، دیوان، فوج — بادشاہ کی نگرانی میں تھے - محاصل کے معاملہ میں بھی سخت حدود عائد کئے گئے تھے اجرائے محصولات عصر جدید میں جن معنی میں سمجھا جاتا ھے اس سے کوئی واقف بھی نہ تھا - آمدنی کا اصل ذریعہ مال گزاری تھی اور اس کی شرح کی توضیح بھی کتب مقدسہ میں کی جاچکی تھی - یہ صحیح ھے کہ مفلس، مسرف، ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے ھمیشہ

ظاہر قانون کی پابندی نہیں کی لیکن یہ خلاف ورزیاں ہمیشہ ضمیر کے لئے ناگوار ثابت ہوتی رہیں ۔

حکمراں کو رعایا سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کے معاوضہ میں وہ دو ناگزیر خدمات انجام دیتا تھا ۔ یہ دونوں گاؤں کی قدرت سے باہر تھیں ۔ ایک تو تعمیری امور کا انصرام تھا جن میں زیادہ اہم اور زیادہ مفید آبپاشی کے کام تھے کیوں کہ مملکت کے محاصل کا زیادہ تر دارومدار ان ہی پر تھا ۔ بارش پر بھروسہ کرنا ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا تھا ۔ باؤلیوں تالابوں اور نہروں کے لئے مالی ذرائع ، فنی مہارت اور تنظیم کی ضرورت تھی اور یہ سب ایک خوش تدبیر حکومت ہی کے اختیار میں ہوا کرتے تھے ۔

اس کے علاوہ قیام امن و نظم ، جان و مال کی حفاظت و صیانت ، حریص حملہ آوروں کی مدافعت ایک ایسی فوج کا کام ہے جو قوی بھی ہو اور جس کا قائد قابل بھی ہو اور جس کے ضروریات کا مجموعی ذخیرہ بھی موجود ہو ۔ جنگ کے لئے تیار رہنے کے معنی یہ ہیں کہ مسلسل جنگ کی جائے کیوں کہ جنگ ہی جنگ کی موزوں تربیت کا کام دیتی ہے ۔ اس لئے جنگ کو بڑھا چڑھایا جاتا تھا ۔

ہندوؤں میں مثالی بادشاہ تو وہی سمجھا جاتا تھا جو ملک فتح کرتا اور تمام حکمرانوں کو اپنی فرمانروائی کے دائرہ میں لے آتا ۔ ایک مسلمان بادشاہ کا یہ مذہبی فریضہ تھا کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرے اور غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے یا پھر ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کی حفاظت میں آجائیں ۔ مغلیہ سلطنت میں مملکتی خدمات کا سارا نظام (فوجی اور غیر فوجی دونوں) ایسے افراد پر مشتمل تھا جنہیں فوج میں قیادت حاصل تھی ، دفعدار جس کے تحت دس سوار ہوتے تھے ، اس سے لے کر جرنیل تک جو دس ہزار سواروں کا قائد تھا ، سب ہی اس میں شامل تھے ۔

روشن خیال سلاطین نے قومی افادیت کے عظیم الشان کام انجام دئے ، انہوں نے سڑکیں ، پل ، نہریں ، تالاب ، محل اور عبادت گاہیں تعمیر کیں ، فنون کی سرپرستی کی جیسے موسیقی ، نقاشی ، عمارت سازی ۔ انہوں نے ادب و حکمت کو ترقی دی ، مدارس قائم کئے ، شاعروں ، مؤرخوں اور مصنفوں کو فیاضی اور فراغ دلی سے انعامات عطا کئے ۔ ان کے دربار فنون لطیفہ کے مرکز تھے اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوگئی ۔

ہندوستان میں ہزارہا سال یہ نیم اشتراکی ، پدرانہ ، محدود ، غیر خود اختیاری مملکت (جس پر آسٹن کے معنی میں حکومت کا اطلاق نہیں ہوتا) قائم رہی ، کیوں کہ جس نظام معاشرہ سے اس کا تعلق تھا وہ اس کے بالکل مطابق تھی ۔

اس معاشرہ کی اکائی گاؤں تھا ۔ وہ ایک خود مکتفی منفرد اکائی تھا ۔ اس کا قیام بالذات بھی ممکن تھا یا اس کو دوسری اکائیوں کے ساتھ مربوط بھی کیا جاسکتا تھا ۔ ان میں ارتباط یا تو اس لئے پیدا ہوتا کہ ایک قبیلہ یا جرگہ ایکِ بڑے رقبہ میں سکونت اختیار کر لیتا ، یا خاندان کی تقسیم عمل میں آتی یا پھر وہ کوئی معاشری یا سیاسی جبر کا نتیجہ ہوتا ۔

گاؤں ایک معاشی اکائی تھا ، اس کی بقا کا دار و مدار ، اس کی پیداوار پر ہوتا تھا ۔ اس کے باشندے آزاد دھقان تھے ، جاگیری نظام کے حامی یورپ کے زرعی غلاموں کے مانند نہ تھے ، یہ اپنی پیداوار کا ایک حصہ مملکت کی نذر کیا کرتے تھے ۔ قدیم زمانہ میں اس حصہ کا تناسب $\frac{1}{6}$ ہوتا تھا ، اکبر کے زمانہ میں $\frac{1}{3}$ ہوا ، اور اٹھارھویں صدی میں نصف یا اس سے کچھ زیادہ ہوگیا ۔ اس حصہ کو جمع کرنے والا یا تو حکومت کا کوئی عہدہ دار ہوتا یا وہ شخص ہوتا جس کو ایک جائداد اس غرض کے لئے دے دی جاتی تھی کہ وہ اس فریضہ کو

انجام دے، یا کوئی موهوب الیه هوتا، یا محکمه مال کا کوئی کاشتکار یا زمینداروں کا ایک قدیم خاندان یا کوئی راجه یا امیر هوتا۔ یه لوگ اور کاشتکار وغیره اس خدمت کو هنگامی طور پر انجام دیا کرتے تھے کیوں که بار بار ان کا تبادله بھی هوا کرتا تھا۔ اس کا نتیجه یه هوا که هندوستان میں توریثی طور پر امراء کا وه طبقه پیدا نه هوسکا جس سے ارکان حکومت کا تعلق هو۔ اس کام پر اعلی طبقه کے جو لوگ مامور تھے ان کا گانؤں والوں سے ربط نہیں هوسکتا تھا کیوں که جمع کرنے کا کام گانؤں کے چودھریوں اور عاملوں کے ذریعه لیا جاتا تھا۔ گانؤں کی ضروریات کی تکمیل اسی کے دست کار کیا کرتے جن کا معاوضه جنس کی شکل میں فصل کاٹنے کے زمانه میں ان کو دے دیا جاتا۔ گانؤں کے ملازم جیسے چوکیدار اور خاکروب کا معاوضه بھی اسی طرح ادا کیا جاتا تھا۔ اس فطری تنظیم میں زر کی زیاده اهمیت نه تھی۔

گانؤں ایک معاشری اکائی تھا کیوں که ذات پات کے نظام کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ اعلی اور ادنی ذاتیں علحده علحده مقام پر رهتی تھیں اور اچھوت کی زندگی تو اس حال میں بسر هوتی که اس سے فروتر کسی چیز کا وجود هی ناممکن تھا۔

گانؤں ایک انتظامی اکائی بھی تھا۔ انتظامی امور کے لئے اس کا اپنا مالیه تھا، اس کی اپنی پولیس تھی، اس کی اپنی عدالت، اس کا اپنا دفاع تھا۔ گانؤں کے بڑے بوڑھوں (شمال میں ذات پات کی تفریق نه تھی اور جنوب میں صرف برهمنوں) کی ایک غیر رسمی مجلس هوا کرتی تھی جو گانؤں کے انتظام، فلاح عام، خیرات، تعلیم، تفریح و تفنن وغیره سبھی چیزوں کی ذمه دار تھی۔ مملکت کی زندگی کے لئے گانؤں کی امداد اپنے روایتی حصه کا ادا کرنا تھا خواه جنس کی شکل میں هو یا نقد کی صورت میں، جس میں بھی سهولت نظر آئے۔ بعض دفعه گانؤں کا صدر بادشاه کے حکم سے انحراف کرتا تو پھر بادشاه کی

پیادہ اور سوار فوج اس باغی امیر پر حملہ کرتی اور اس کو اطاعت کا سبق سکھلاتی ۔ بعض دفعہ لگان وصول کرنے والے کاشتکاروں کو اپنے سخت اور حد سے زیادہ مطالبات سے پریشان کیا کرتے تھے ۔ جب ظلم حد سے بڑھ جاتا اور قابل برداشت نہ رہتا تو کاشتکار قدیم رومی طریقہ کو اختیار کرتے اور زمینیں چھوڑ کر چل دیتے ۔ جب انسانوں کی قلت اور زمینوں کی کثرت ہوجاتی تو مالک زمین کو نقصان برداشت کرنا پڑتا ۔ اس کو کاشتکاروں سے عاجزی کے ساتھ عذر معذرت کرنا پڑتا اور واپس لانے کے لئے ان کی خوشامد کرنا پڑتا ۔

اپنے وجود میں گم ہو کر گاؤں والوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی کہ اس وسیع عالم میں ہو کیا رہا ہے ۔ سلاطین کا سلسلہ شروع ہوتا اور ختم ہوجاتا ، سلطنتیں منصۂ ظہور پر آتیں اور فنا کے گھاٹ اتر جاتیں ، لیکن گاؤں فتحیاب افواج کو گزر نے دیتا اور پھر اپنے مراقبہ میں مستغرق ہو جاتا ! وقت ساکن تھا ۔ تاریخ کے کوئی معنی نہ تھے ۔ زماں کا یہ عدم ہندوستانی قلب میں راسخ ہوچکا تھا اور اس کا اظہار ان کے افکار میں ہوتا تھا جن میں مذہب فلسفہ ادب اور فن شامل تھے !

ہندوستانی مذاہب کی روح باطنی تجربہ ہے جو ایک راست ، بے واسطہ اور ناقابل بیان ادراک ہے ۔ اس کی علمیات علم کی غایت کشف کی اس کیفیت کو قرار دیتی ہے جہاں زمان و مکان کا کوئی دخل نہیں ۔ اس کی ما بعد الطبیعات اضافی و مطلق ، محدود ولامحدود کے باہمی تعلقات کو متعین کرنا چاہتی ہے اور ناسوت ولاہوت میں عینیت قائم کرنا چاہتی ہے ۔ اس کی اخلاقیات سلوک کی وہ راہ متعین کرتی ہے جس پر چل کر فرد اپنی آزادی کا تحقق کرتا ہے ہندوستانی ادب گریز پا ، فانی جذبات و احساسات کی محض اثر پرستانہ صورت گری کا نام نہیں بلکہ وہ جذبات کے چشمے کے سرمدی

سیلان کے ضروری مقامات کی یافت اور اس کے اظہار کی کوشش ھے۔ ہندوستانی فن راست وجدان کے ذریعہ اس جمالیاتی جوھر کی یافت ھے جو خارجی کثرت کے توبتو حجابات میں مستور و مکنون ھوتا ھے۔ خط، رنگ، ڈھلنے والی صورت اس کے محض آلات و ادوات ھیں۔ ان کی مدد سے فن کار اس لاتعین حقیقت کے علائم و اشارات کی تخلیق کرتا ھے جن کو عقل و ادراک کے مقولات مادی اشیاء میں متعین و متمیز کرتے ھیں۔ یہ حقیقت وہ وراء الوراء حسن ھے جس کی یہ سریع الزوال دنیا محض ایک ظل یا سایہ ھے۔ نقاشی محض ان معطیات حواس ھی کا نقشہ نہیں کھینچتی جو ھماری آنکھیں دیکھتی ھیں بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ھے جو ماوراء حواس ھے۔ مہاتما بدھ کے عظیم الشان مجسمے محض مادی انسان کو پیش نہیں کرتے۔ بت تراش کو دلچسپی تو محض اس چیز سے ھوتی ھے کہ وہ رحمت الہیہ و سکینت ربانیہ کو مرئی شکل میں پیش کردے! مذھبی فن تعمیر کا مقصد ایک ایسی عمارت کا تعمیر کرنا ھے جو خانۂ خدا کا کام دے۔ موسیقی اور رقص وہ وسائط و وسائل ھیں جن کی مدد سے شعور انسانی اپنے محدود انا سے ماوراء ھو کر حقیقت مطلقہ میں فنا یا محو ھوجاتا ھے۔

پلاسی نے اس ھندوستان کو مبارزت کے لئے للکارا، اور ھندوستان اپنی مدافعت نہ کرسکا۔ مغربی تمدن کا سیلاب اٹھا اور ملک میں گھس آیا۔ مدتوں کا جمع شدہ متعفن مواد بہ نکلا، اور اس کے ساتھ بہت سارا اچھا اور صاف ستھرا مواد بھی فنا ھوگیا۔ لیکن تاریخی بلیات و مصائب فطری آفات کی طرح جب نازل ھوتے ھیں تو اچھے برے میں امتیاز نہیں کرتے!

فوراً ھی رد عمل کا ایک سلسلہ شروع ھوا۔ اس کی قوت حیرت انگیز تھی۔ یورپ نے تو قرون وسطی اور عہد جدید کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال میں طے کیا تھا۔ اس کی ترقی نصف درجن

انقلابات کی رھین منت تھی؛ تین تو معاشی انقلابات تھے -- تجارتی، زرعی، اور صنعتی؛ ایك تمدنی انقلاب تھا یعنی عہد اصلاح، اور ایك سیاسی انقلاب تھا، اس نے انگلستان میں پارلیمنٹ کی حکومت قائم کی، اور فرانس میں قدیم نظام حکومت کو ختم کردیا - ان انقلابات نے جدید قومی مقتدر ریاستیں قائم کیں -

ہندوستان نے بھی قرون وسطی سے عہد جدید کی طرف سفر کیا اور اس کا راستہ بھی اسی قسم کے مقامات سے ہو گزرا لیکن اس مسافت کے طے کرنے کے لئے اس نے بجائے پانچ سو سال کے صرف ڈیڑھ سو سال لئے - معاشی، معاشری اور سیاسی انقلابات ھی کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان جو مختلف، جدا جدا، نیم مستقل گاؤں کی جمہوریتوں کا ایك غیر پیوستہ مجموعہ تھا ایك متحد فرمانروا قوم بن گیا جو عالم جدید کی دوسری سب سے بڑی مملکت ھے -

مشرق کے مغرب سے متأثر ہونے کے عمل میں ہمیں ارادی رد و قبول، اطاعت، شعوری و غیر شعوری اشتراك عمل، تقلید اور جذب و اثر کے مختلف مدارج نظر آتے ھیں - مغرب نے اپنا اثر کبھی تو قوت و سطوت کے ذریعہ ڈالا، کبھی مثال قائم کر کے ترغیب کے ذریعہ، اور کبھی محض ضرورت کی شکل میں - یہ عمل پلاسی کے بعد سے مسلسل جاری رہا - اس نے ہندوستان کو بہت بدل دیا، لیکن اس نے ہندوستانی ذہن میں ایك ثنویت بھی پیدا کردی جو اب تك رفع نہیں ہوئی ھے - کوئی نہیں بتلا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا - کیا ہندوستانی تہذیب مغربی تمدن کی عالم گیر مملکت کا محض ایك صوبہ بن کر رہ جائے گی؟ کیا یہ بالآخر مغرب سے قطع تعلق کر کے اپنا راستہ خود نکال لے گی؟ یا پھر ہندوستان ایك ایسی درمیانی راہ ڈھونڈھ نکالے گا جو مشرق اور مغرب دونوں کے اساسی تعقلات کی جامع ہوگی؟

اس عمل کا آغاز معاشی سطح سے ہوتا ہے ۔ اس نے گاؤں کی تجرید اور عجب کو ختم کردیا ۔ زرعی نظام کی بجائے ، جس کا آزاد دھقان کاشتکار ، دولت کا حقیقی معنی میں پیدا کرنے والا ، ایک مستقل رکن تھا ، اور وہ درمیانی واسطہ جو مملکت کے لئے لگان جمع کرنے کی خدمت انجام دے کر اس کا اتفاقی شریک تھا ، اور خود مملکت جس کی حالت کم و بیش ایسے شریک کی تھی جو انتظام میں دخل نہیں دیتا تھا ، ـــ اس نظام کی بجائے ایک بالکل جدید نظام پر عمل شروع کیا گیا ـ زمینداروں کی ایک موروثی جماعت پیدا کی گئی اور کاشتکار کی حالت اسامی غیر دخیل کار کی سی ہوگئی ـ زمیندار مالک بن گئے اور ملکیت کے سارے حقوق انہیں حاصل ہوگئے ، مثلاً ہبہ ، رہن اور اپنے اختیار سے فروخت کرنا ـ زمین ایک قابل فروخت جائداد بن گئی ـ

زرعی نظام میں زر کے داخل ہونے سے اس میلان کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوئی ـ کرایہ اور محاصل کا تعلق غلہ کی پیداوار سے باقی نہ رہا بلکہ نقد وصول کیا جانے لگا ـ ان کا انحصار پیداوار کی مقدار پر نہ رہا بلکہ طویل مدت کے لئے ان کا تعین کر دیا گیا ـ عدم ادائی پر زمین سے بے دخل کردیا جاتا یا زمین ہی کو فروخت کردیا جاتا ـ زر ہی کی وجہ سے ایسے زمیندار پیدا ہونے لگے جو اپنی زمینوں سے غائب رہتے اور ان کا کوئی کام نہ ہوتا ـ لیکن یہ گروہ زیادہ تر فرانسیسی منافع خواروں کے مانند تھا نہ کہ انگریز جاگیرداروں کے مانند ، فرق صرف اتنا تھا کہ فرانسیسی منافع خواروں کے برخلاف ان کی آمدنی تمسکات سے نہیں بلکہ زمینوں سے ہوتی تھی ـ وہ شہروں میں رہتے ، مغربی وضع کے مکان بناتے جن میں مغربی فرنیچر ہوتا ، مغربی حکمران طبقہ کے عادات و اطوار اختیار کرلیتے اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے انگریزی مدرسوں میں بھیجتے یا انگلستان روانہ کرتے اور اساطین مملکت میں ان کا شمار ہوتا ـ ان کی ساری

خصوصیات متوسط طبقه کی تھیں ، وہ طبقہ جو اجنبی حکمراں جماعت اور ھندوستانی عوام کے درمیان پایا جاتا تھا جس کی دلچسپی محض دولت اور اس سے حاصل ھونے والے فوائد سے تھی — معاشرے اور حکومت میں اثر و نفوذ جو اپنے طبقہ کے مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا۔

زر کی صورت میں محاصل کی ادائی سے غلہ بازار میں آنے لگا ، اس کی وجہ سے غلہ کے تاجروں کا ایک طبقہ اور ساھوکاروں کا ایک طبقہ پیدا ھوا ۔ اب زمین حقیقی کاشتکار سے نکل کر شہری سٹہ باز کے ھاتھ میں آ گئی ۔ زر کی وجہ سے اس پیداوار میں اضافہ ھوا جس سے زر کمایا جا سکتا ھے ۔ پیداوار صرف کی خاطر نہیں رھی ، غلہ کی تخصیص ھونے لگی ، اور وسیع بازار نے گاؤں کی پیداوار کو اپنے مجوف آغوش میں لے لیا تاکہ اپنی نہ بجھنے والی بھوک کی تشفی کا سامان مہیا کرے ۔

دو اور چیزوں کا گاؤں پر اثر ھوا : حمل و نقل ، آمد و رفت کے مغربی طریقے اور آبادی کی کثرت اھل برطانیہ نے نئی سڑکیں اور پل بنائے ، اور پرانی سڑکوں اور پلوں کی مرمت کی اور سنہ ۱۸۵۴ء میں پہلی مرتبہ ریلیں دوڑائیں ۔ پھر تار برقی کی ایجاد ھوئی ۔ ان سے مال و اسباب کی نقل و حرکت اور خود انسان کی آمد و رفت میں بڑی سہولت ھوگئی ۔ امن و نظم کے قیام اور بعض مالطوسی اجزاء کے ازالہ سے جو ترقی کے مانع تھے ، آبادی کو سلسلۂ ھندسیہ کی راہ پر ڈال دیا گیا ، یہ اٹھارھویں صدی میں ڈیڑھ سو ملین سے کچھ کم تھی ، اور سنہ ۱۸۷۲ء میں دو سو ملین سے زیادہ ھوگئی ، اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ زمین کی قلت اور آبادی کی کثرت ھوگئی ۔ دکن میں سنہ ۱۷۷۱ء میں ایک کاشت کار کے پاس اوسطاً چالیس ایکڑ زمین ھوتی تھی ، سنہ ۱۸۱۸ء میں یہ 17½ ایکڑ رہ گئی اور سنہ ۱۹۱۵ء میں صرف سات ایکڑ (دیکھو ھر الّٰہ من کی کتاب " دکنی گاؤں ": (The Deccan Village

روزگار کی متبادل صورتوں کے فقدان کی وجہ سے زمین کی اہمیت بہت بڑھ گئی، نقل و حرکت کا رجحان زیادہ ہوگیا، اور قدیم خلوت پسندی باقی نہ رہی، ہندوستان کے معاشی اتحاد کے اسباب فراہم ہوگئے ـ مرکزی نظام حکومت میں انتظام کی ساری تفصیلات کی نگرانی دارالحکومت سے ہوا کرتی تھی اور تمام رقبے غیر متبدل و غیر شخصی قوانین کے زیر تسلط تھے، اس لئے اس سے بھی معاشی اتحاد کے میلان کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ـ

تجارت اور صنعت کے دائرہ میں بھی یہ تغیر اتنا ہی بنیادی ثابت ہوا ـ گانؤں کی صنعت تباہ ہوگئی، کیوں کہ یہ نہ ان تدابیر کا مقابلہ کرسکی جو انگریزی حکومت نے اپنے وطن کی پیداوار کے تحفظ کے سلسلہ میں اختیار کئے تھے اور نہ انگلستان کے روز افزوں ترقی کرنے والے نظام کارخانہ جات کا کپڑا بننے کی ھاتھ کی مشین اس مشین کا کیا مقابلہ کرسکتی ھے جو میکانکی قوت سے چلتی ہو اور نہ گانؤں کا غریب جولاھا تاجرانہ ذہنیت رکھنے والی شہنشاھیت پسند قوت کی خود غرضی سے بچاو کا کچھ سامان رکھتا تھا ـ انگلستان اپنی روز افزوں صنعت و حرفت کے لئے خام مواد اور اپنے مشینی پیداوار کے لئے بازار چاھتا تھا ـ ہندوستان کی وسیع قابل کاشت اراضی اور اس کی روز افزوں آبادی نے ان دونوں ضرورتوں کی تکمیل کا سامان فراہم کیا ـ اس لئے ہندوستان کی معاشیات کو برطانیہ کی معاشیات کے ساتھ مربوط کردیا گیا ـ برطانوی سرمایہ کے لگانے کے لئے ایک وسیع میدان ھاتھ آیا ـ ایک تجارتی انقلاب نے لنگر اٹھایا ـ بالآخر اس نے ہندوستان کو دنیا کے بازار میں لا چھوڑا اور یہاں قیمتوں کے تطابق کا نظام اور اس کے معاشی نتائج اس کے دامن گیر ہوگئے ـ

زمیندار متوسط طبقہ میں ایک تجارتی طبقہ کا اضافہ ہوا جو بہت جلد اپنے ثانوی اور فروتر مقام سے بیزار ہوگیا اور اپنے سرمایہ کو

بڑی صنعتوں کے منافع کے حصول میں لگانے کے مواقع کے لئے چیخ وپکار کرنے لگا۔ لیکن ان مواقع کے حصول میں دیر لگی اور ہندوستانی صنعتی انقلاب کو بہتر دنوں کا انتظار کرنا پڑا۔

گانؤں کی صنعت وحرفت کی بربادی نے کاری گروں اور دستکاروں کو مجبور کر دیا کہ یا تو وہ دیہات کے بے زمین مزدوروں کے غول میں شریک ہو جائیں یا نقل وطن کرکے شہروں میں چلے جائیں۔ دونوں صورتوں میں عام بے اطمینانی اور زیادہ بڑھ گئی۔

زرعی اور تجارتی انقلابات نے ان دیواروں کو منہدم کر دیا جنہوں نے ہندوستانیوں کو نہایت محدود گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جدید طریق کار، ذرائع و وسائل نے ان گروہوں کو ایک وحدت میں مربوط کرنا شروع کر دیا۔ جب جسم کا ہیولی تیار ہو رہا تھا ایک نئے نظام معاشرت کی روح اس میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔

ہندوستانی مذہب نظم، ترتیب و حریت کا ایک عجیب و غریب مرکب ھے۔ ہندوؤں کے لئے بظاہر یہ ضروری ھے کہ انسان کے ظاہر کو اوامر و نواھی کی جکڑ بندیوں میں مقید کر دیا جائے، ذات پات کی فوجی تربیت کا پابند کیا جائے تاکہ باطنی روح اپنے پر جھاڑے اور حریت کی فضا میں پرواز کرے۔ کامل حریت کی جڑیں کامل عبودیت میں جمی ہوئی ھیں۔ تاھم سعی انسانی کی غایت قصوی روحانی حریت ھے۔ جس کسی نے اس حریت کا تحقق کرلیا وہ دنیوی تعلقات کی غلامی سے آزاد ہوگیا، قلب انسانی کے دو جبار حاکموں کے رق عبودیت سے نجات پالی جو لذت و الم کہلاتے ھیں۔ حریت علم وعرفان کی اس کیفیت کا نام ھے جو اس وقت حاصل ہوتی ھے جب انسان کی روح ان تو بتو حجابات کو چاک کر دیتی ھے جو نور باطن کو مستور کئے ہوئے ھیں! یہ غلاف مادی حیاتیاتی، عضویاتی، ذہنی اور عقلی ماحول کے پیدا کردہ غلاف ھیں جو روح پر محیط ہوگئے ھیں۔

یہ نفس کو اپنی حقیقت کے عرفان سے روک رہے ھیں - انہیں دور کرو، تمہیں اپنے نفس کا عرفان حاصل ھوگا اور ساتھ ھی شادی جاوید بھی - ھندو مذھب اس عرفان سے کسی کو محروم نہیں رکھتا، خواہ اس کی ذات، عقیدہ، رنگ، مقام، جنس کچھ ھو- یہ عرفان مطالعۂ کتب سے نہیں حاصل ھوتا، کتب مقدسہ کے مطالعہ سے بھی نہیں حاصل ھوتا، نہ ھی علم استدلالی، منطق یا حکمت اس کو عطا کرسکتی ھے - معاشری نظام نے بعض ذاتوں کو دینی کتابوں کے مطالعہ کرنے سے منع ضرور کیا لیکن اس عرفان سے کوئی محروم نہیں رکھا گیا جو حریت عطا کرتا ھے -

لیکن طالب کے لئے جو اس غایت کے حصول کی تمنا رکھتا ھے دو طرح کا مجاھدہ ضروری ھے عضویاتی و نفسیاتی، یاما اور نیاما، ضبط جسم و ضبط نفس - ثانی الذکر کا انحصار عدم تشدد، صداقت، عدم طمع، ضبط شہوت، ضبط حواس پر ھے - جو شخص سلوک کی یہ راہ موانع وعوائق کی پرواہ کئے بغیر کامل خلوص کے ساتھ طے کرتا ھے وہ اپنے سلوک کے ختم پر اس وادی مقدس میں پہنچ جاتا ھے جہاں صداقت، حسن و مسرت کا آفتاب علی الدوام ضیاء پاشی کررھا ھے!

یہ ایک نا قابل توجیہ امر ھے کہ اس لطیف و نفیس بصیرت و عرفان اور اس کی رفیع و منیف اقدار کے ساتھ کس طرح ایسے مذھب کا جوڑ لگایا گیا جو ریت و رسم کی اس قدر تفصیل اپنے اندر رکھتا ھے، معاشرہ کی درجہ بندی کرتا ھے اور وراثت کے اساس پر فرد کے مقام اور کام کا تعین کرتا ھے اور اس لئے حریت، مساوات اور عدل کی نفی کرتا ھے -

مغربی سائنس اور عیسائیت کے حملے نے اس دو رخی تعمیر کی بنیادوں میں زلزلہ ڈال دیا - جہاں تک کہ پہلے رخ کا تعلق ھے مغرب کے بعض جہلا نے ابتداء میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی - لیکن مغرب کے علماء نفسیات، فلاسفہ اور مؤرخین نے اس جہل کو دور کردیا -

ولیم جیمس کی کتاب ''مذهبی تجربه کے اقسام'' Varieties of Religious Experience ذهن انسانی کے مختلف طبقات کے سلسله میں نفسیات کی تحقیق جو تحت الشعور سے لے کر فوق الشعور درجات کو ثابت کرتی ھے، هنری برگسان کا فلسفه، قرون وسطی کے تمدن اور صوفیه کے حالات کا مطالعه۔ ان سب نے مل کر بے توجهی اور نفرت کو عزت و احترام میں بدل دیا ھے۔ برٹرنڈرسل جیسے مسلک حقیقیت کے قائل نے تصوف کو معقول بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ھے۔

دوسرا رخ غیر محفوظ اور کمزور ثابت هوا۔ فکری حیثیت سے هندوستان نے ذات پات کے نظام کو رد کردیا ھے۔ هندوستان کا دستور اس کو تسلیم نہیں کرتا اور اچھوت پن کی صریحا مذمت کرتا ھے۔ مغرب کے زیر اثر جو مذهبی تحریکات شروع هوئیں انهوں نے ذات پات کے نظام کو، مشرکانه عبادات و مناسک کو، اور دیومالا کے اکثر حصه کو بالکل رد کردیا۔ عقائد اور اذعانی اصول پر تنقید کی۔ انیسویں صدی میں ان تحریکات کے پہلے رهنما رام موهن رائے کیشب چندراسن، دیا نندا سرسوتی، رام کرشنا پرمرم هنسا رھے هیں۔

مغربی فکر کے تصادم سے ویسے هی نتائج پیدا هوئے جو یورپی ممالک میں هوئے تھے۔ تقلید جامد کے سکون میں اضطراب پیدا هوا اور انتقادیت کی روح بیدار هوئی۔ اس تحریک کا تعلق کسی خاص علاقه سے بھی نه تھا، مشرق مغرب، شمال جنوب هر سمت اس کا اثر هوا۔

تمام فرقوں (هندو، مسلمان اور دوسرے تمام) میں هیجان پیدا هوا۔ گو یه جدید طرز فکر سبھوں میں مشترك تھا تاهم بد قسمتی سے مختلف مذاهب میں اس کی وجه سے اختلاف کی خلیج زیاده وسیع هوگئی۔ هندو مصلح موجوده مذهب سے گو مطمئن نه تھا تاهم عیسائی مبلغین یا پرجوش برطانوی عہده داروں کے اصرار پر وه اپنا مذهب بدلنے تیار نه تھا۔ اس نے اپنے هی مذهب کی زیاده صاف و خالص صورت

تلاش کی اور عہد عتیق میں یعنی اپنشد اور بھگوت گیتا میں اس کو اپنا مطلوب مل گیا ۔ اس لئے اس نے ان تعلیمات کو زندہ کیا اور عہد جدید میں رہ کر ان قدیم اصول پر زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کی ۔

اسی طرح مسلمانوں نے ان بدعات کی مذمت کی جو عہد رسالت کے بعد ان کے مذہب میں پیدا ہو گئے تھے اور انہیں دین قدیم کی راہ سے ہٹا دیا تھا ۔ وہ بھی اس سادہ اور خالص زندگی کے نصب العین کی پیروی کرنا چاہتے تھے جو خلفائے مہتدین کے زمانہ میں ان کے اسلاف نے کی تھی ۔ اس لئے انہوں نے جزیرۃ العرب کو اپنا روحانی و تمدنی وطن قرار دیا ۔

با وجود مقاصد و طرق کار کی مماثلت کے ان دونوں تحریکات کے نتائج مختلف رہے ۔ ہندوؤں نے اپنے مذہب کے اصلی ماخذ کی طرف توجہ کر کے اس امر کی کوشش کی کہ ان کو دوبارہ ان کے مذہب کی حقیقی خصوصیات ، وجدانی بصائر ، کائنات کے متعلق یہ یقین کہ وہ شعور مطلق کی ایک تجلی ہے ، انائے مقید اور حقیقت مطلقہ میں عینیت ، تعینات کی قدر و قیمت یا وقعت کو گھٹانے کا میلان ــــ ان سب پر وثوق و یقین حاصل ہو جائے ۔

اس کے برخلاف مسلمانوں نے دوسری خصوصیات پر زور دیا ، اور وہ یہ تھیں : ایک وراء الوراء خدا کی ذات پر یقین ، آخری وحی الہی جو سارے مسلمانوں کی طرف بھیجی گئی ہے اس کا تاریخی مشن ، خدا کے غضب اور اس کے دائمی عذاب سے نجات دلانے کا فریضہ جو اس امت کے سپرد کیا گیا ہے ۔

ہندو ذہن ابتدائی طور پر صداقت پر مرکوز ہوتا ہے اور مسلمان کا ذہن صواب پر ۔ ہندو مذہبی تجربہ کے انفرادی اور شخصی پہلو پر زور دیتا ہے اور مسلمان اس کے جماعتی پہلو پر ۔ ہندو اپنے معاشری رسوم و نقائص و معائب کو درگزر کے قابل قرار دینے پر مائل ہوتا ہے

اور مسلمان ان سے برھم ہوتا اور اذیت محسوس کرتا ھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے تعصب یا عدم رواداری اور ماضی کی یاد نے ھندوؤں کو دکھ پہنچایا۔ ھندوؤں نے اپنا کوئی روحانی رشتہ زمانۂ ماضی کے عربوں سے محسوس نہیں کیا لیکن مسلمانوں کو یہ جان سے زیادہ عزیز تھے۔ مسلمان ویدی ھندوستان میں طیبۂ قلب نہیں محسوس کرتا تھا۔ گو دونوں میں جماعتی شعور پیدا ھوا اور صوبہ واریت کا عنصر دونوں میں نمایاں تھا لیکن ان کا مفہوم جدا جدا تھا۔ ان کے باھمی اتحاد کے لئے مذھب کا کامل طور پر سیاست سے جدا کرنا ضروری تھا لیکن زمانہ کا ابھی یہ اقتضاء نہ تھا، لیکن کافی اضطراب پیدا ھو چکا تھا۔

مذھبی اصلاح اور مغرب کے اثر نے ایسی قوتیں بیدار کردیں جن سے عادات و اطوار، رسوم اور ادارے بدل سے گئے' مثال کے طور پر ھم عورتوں کی حیثیت و مقام اور شادی بیاہ کے متعلق خیالات کے تغیر کو پیش کرسکتے ھیں۔

مشرق اور مغرب کے ملنے سے ھندوستان میں بھی اسی قسم کے نشأۃ ثانیہ کا ظہور ھوا جس کا یورپ میں اس سے پہلے ظہور ھوچکا تھا۔ اس کے دو رخ تھے: علوم قدیمہ کا احیاء اور جدید مغربی علوم کا حصول۔ پہلے نے ھندوستان کی عزت نفس کو سنبھالا اور دوسرے نے ھندوستان کو بہت ساری چیزیں عطا کیں، مثلاً کثرت السنہ والے اس ملک کے لئے خیالات کے اخذ و عطا کا ایک مشترک ذریعہ فراھم کیا، ایک ایسا پر قوت ادب عطا کیا جس نے قومیت کے نئے جذبہ کی صورت گری میں مدد کی' ایک نئی زبان دی جس نے ان نادر جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنایا جنھوں نے ھندوستانیوں کے قلوب میں آگ لگا دی تھی' تجربیت پسند، حکیمانہ اور تنقیدی انداز فکر بخشا۔ دنیوی ماحول میں ایک نئی دلچسپی پیدا ھوگئی۔ ادب، فن، موسیقی اور فن تمثیل اس دلچسپی کے ظہور کی مختلف صورتیں تھیں۔ "خود را بشناس" کے حکم کے علاوہ

دوسرا حکم سنایا گیا : ''حق ہمسائیگی ادا کرو'' ایک رومانی فضا ماضی پر محیط ہوگئی ۔ اس نے موجود کی بے لطفی و غمگینی کی تلافی کردی اور مستقبل کی ایک منقلب ذہنی تصویر پیش کردی !

انگریزوں نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا اس نے اس ماضی کی طرف سے ارادۃً تغافل برتا بلکہ اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی ۔ اس نے مغربی علوم کے حصول پر عمداً زور دیا ۔ مغرب زدہ مدارس اور جامعات نے جو ادبی تحریک شروع کی تھی اس نے ہندوستان کے روشن خیال طبقہ کو وجود بخشا ۔ اسی طبقہ نے پیشوں اور ملازمتوں کو زینت بخشی اس نے متوسط طبقہ کی تعداد میں اضافہ کیا ، قوم کی روح کو بیدار کیا اور آزادی کی تحریک شروع کی ۔

یہ سارے انقلابات کم و بیش ایک ہی وقت واقع ہوئے ، کیوں کہ یہ سب ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا نتیجہ تھے ۔ ان تمام میں مشترک اور سب سے زیادہ ہیجان انگیز ، سیاسی جزء تھا ۔ پہلی مرتبہ ہندوستان کو ایک ایسی مملکت کا تجربہ ہوا جو حکومت کی ساری صفات کی حامل تھی ، جس نے تمام درمیانی واسطوں کو موقوف کردیا تھا اور جس کا براہ راست رعایا سے تعلق تھا ، جس نے اپنی تمام رعایا سے اطاعت کا مطالبہ کیا تھا خواہ یہ مرکز سے کتنے ہی فاصلہ پر کیوں نہ ہو ، اور جس نے دنیوی اقتدار کو روحانی اقتدار پر ترجیح دی تھی ۔ اس طرح مرکز جو قوتوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوا ، اور انتظامی وحدت کی طویل بقا نے ایک اجتماعیت پیدا کردی ۔

برطانوی راج نے اور بہت کچھ کیا ۔ اس نے قانون کی حکومت قائم کی ۔ گو افلاطون کے زمانہ سے سیاسی مفکرین نے دو قسم کی مملکتوں کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے اور ان کی اضافی خوبیوں پر بحث کی ہے ، ایک تو وہ مملکت جس کی حکمران 'حکمت' ہوتی ہے اور اپنے مظہر فلسفی بادشاہ کے ذریعہ حکومت کرتی ہے ، دوسری وہ مملکت جو قانون پر

قائم ہوتی ہے، تاہم سراج الدولہ کی شکست کے بعد شخصی حکومت ہندوستان سے غائب ہو گئی۔

قانون کی برتری اور عظمت کے تصور کے ساتھ یہ تصور بھی تھا کہ قانون کا ماخذ انسان کی ذات ہے نہ کہ کوئی ما فوق فطرت ہستی، اور ساتھ ھی معاشرہ کی آزادی اور اختیار پر زور دیا گیا۔

اس سے فطرۃ یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا خارجی اقتدار کے قوانین کی اطاعت مناسب ہے؟ اس قسم کا انقلابی سوال ایک قومی کارکن ھی اٹھا سکتا تھا، خانگی افراد، اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے، اس سوال سے تعرض نہیں کرسکتے تھے۔ مغرب اور مشرق کے ازدواج سے اس قسم کا قومی کارکن پیدا ہوچکا تھا۔ معاشی، معاشری مذھبی اور تمدنی انقلابات نے ملک کو دردزہ میں مبتلا کر کے اس کو پیدا کردیا تھا۔

اس سوال نے جس کی صورت ابتداء میں ایک چھوٹی سی بدلی کی سی تھی بہت جلد اپنی دھشت ناک سنجیدگی اور پر اضطراب مفہوم کے لحاظ سے عظیم الشان جسامت اختیار کرلی اور سارے سیاسی میدان پر اس کا سایہ چھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ سایہ اٹھ گیا کیوں کہ ہندوستان اور پاکستان نے متنازع فیہ مسئلہ کو باھمی سمجھوتہ اور رضامندی سے آپس میں طے کرلیا۔

مغرب اور ہندوستان کے باھمی تعلقات کی کہانی کا باب جو پلاسی سے شروع ہوا تھا ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو ختم ہوا، جب ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیاٹن نے، ٹھیک آدھی رات کے وقت، ہندوستان کے نمائندوں کو زمام حکومت سپرد کی!

کپلنگ کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ مشرق اور مغرب کا ملاپ ہوا اور نتیجہ بخش بھی ثابت ہوا۔ تین سو ساٹھ ملین افراد کی ایک قوم نے وقار و تعبد کے ساتھ ہندوستان میں ایک مقتدر اعلی جمہوری سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کے سارے شہری عدالت،

حریت ، مساوات اور اخوت کی برکات سے فیض اندوز ہو سکیں۔ انہوں نے اب ایك نئی زندگی کا آغاز کیا ھے ۔ ان کی تمنائیں پاك اور ان کے ارادے مضبوط ھیں ۔ انہوں نے اپنی تاریخ کے دوران میں طویل مسافت طے کی ھے ، ان کی راہ پیچیدہ رہی ھے ، ھزاروں رکاوٹوں نے ان کا راستہ روکا ھے ، لیکن وہ ایك بے مثل تہذیب کے حامل رھے ھیں ، جو حسن و جمال کے ادراك میں ، طلب علم میں ، تقدیر انسانی کی یافت میں اپنا مثل نہیں رکھتی ۔ ممکن ھے کہ دنیا کو اس تہذیب کی بصیرت و عرفان کی ضرورت پیش آئے ۔

ABUL KALAM AZAD ORIENTAL RESEARCH INSTITUTE
PUBLICATIONS SERIES No. 2

MAULANA ABUL-KALAM AZAD
A MEMORIAL VOLUME

Edited by
PROF. HUMAYUN KABIR

Translated by
DR. MIR VALIUDDIN
Research Professor in Philosophy
Osmania University

Published by
Abul Kalam Azad Oriental Research Institute
Hyderabad.A.P.

Printed
at
THE DAIRATU'L-MA'ARIFI'L-OSMANIA,
(OSMANIA ORIENTAL PUBLICATIONS BUREAU)
OSMANIA UNIVERSITY, HYDERABAD-7,

INDIA
1961

Printed
at
The Dairatu'l-Ma'arifi'l-Osmania,
(Osmania Oriental Publications Bureau)
Osmania University, Hyderabad 7,
Andhra Pradesh,
INDIA

MAULANA ABUL-KALAM AZAD
A MEMORIAL VOLUME

Edited by
PROF. HUMAYUN KABIR

Translated by
DR. MIR VALIUDDIN